سلسلۂ مطبوعات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

نظریۂ سلطنت

تصنیف

جے۔ کے۔ بلنچلی

ترجمہ

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے۔

رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

جس کا مقابلہ اصل جرمانی کتاب سے

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

نے کیا

سنہ ۱۳۴۷ھ م سنہ ۱۳۳۷ف م سنہ ۱۹۲۸ع

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن
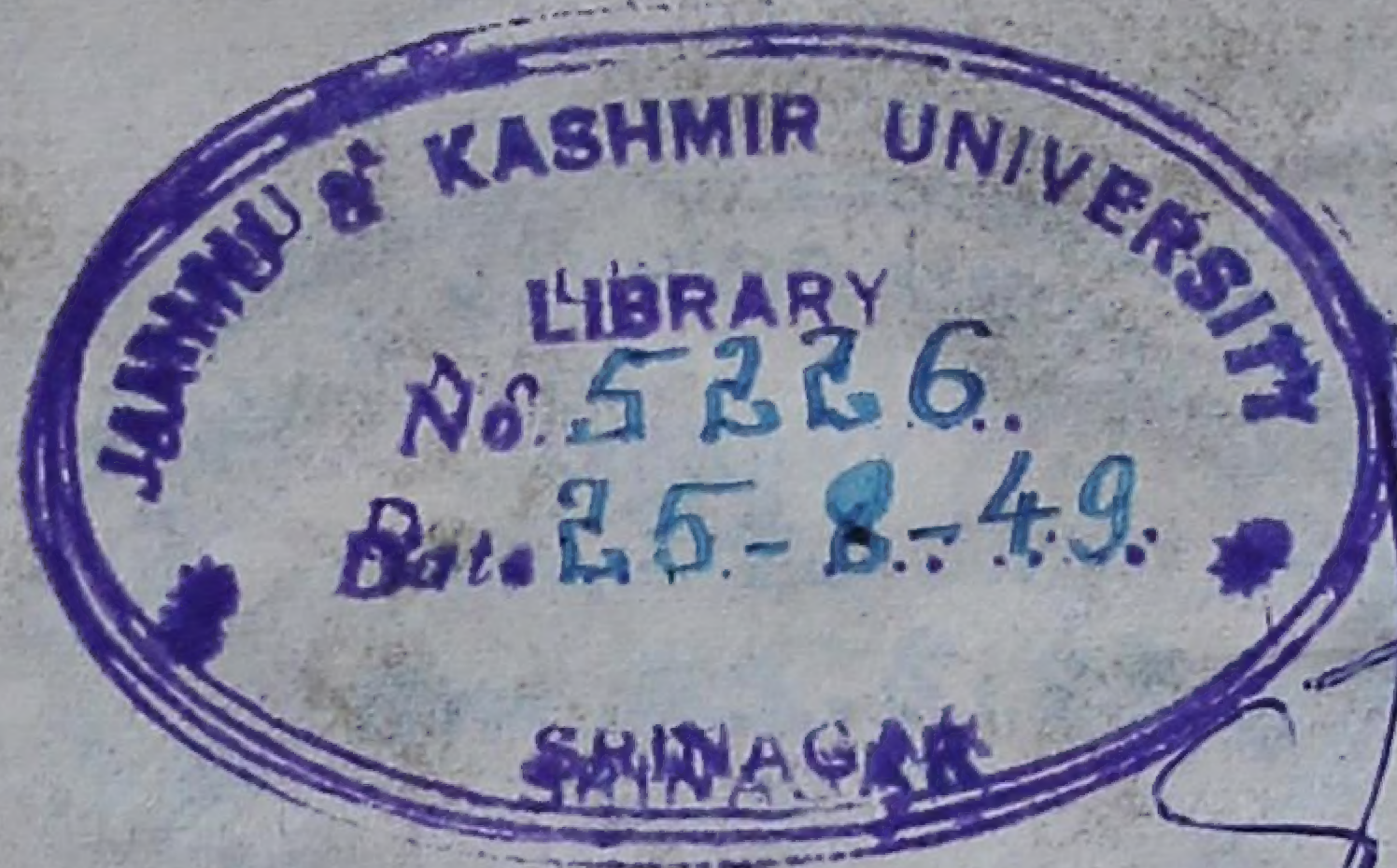
یہ کتاب کلارنڈن پریس آکسفورڈ کی اجازت سے جس کو
حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ
کرکے طبع وشائع کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہبی نظر بر نظریہ سلطنت

اس کتاب میں تحقیق پر تعصب غالب ہے مثلاً: "تاریخ عالم اسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جبکہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے بنی نوع انسانی کی تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی، پس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور سے ہوتی ہے، یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان نما بندر ہیں" (ص ۵۸)

تصور سلطنت کا جو موازنہ ہے (ص ۶۰ — ۶۶) وہ آئین قدیم سے پوری واقفیت پر مبنی نہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کی خصوصیتیں دکھائی ہیں کہ "آزادانہ نشوونما میں خلل پڑ جاتا ہے"۔ "حکمران ...... حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے"۔ "جب یہ اقتدار ایسے وحی الہام پر مبنی ہو جاتا ہے جس کا سلسلہ مدتوں قبل منقطع ہو چکا ہے، جیسے یہودیوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قرآن شریف، تو اس میں ایک مستحکم مگر ناقابل تغیر نظم قائم ہو جاتا ہے"۔ "مذہبی حکومت میں قوائے انسانی جو قانون وحکومت کے معاملات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں بہت ہی ناکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا"۔ "مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زنانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں"۔ "اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ

دقتیں پیش آئیں گی۔ "حرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں" "علم وہنر میں فی نفسہ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی" (ص ۳۷۲ - ۳۷۴) وما یحذو حذوہ

حضرات اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ درس کے وقت ایسے مقامات سے سرسری نہ گزریں گے بلکہ حقیقی مذہب اور اس کے صحیح متعلقات کی نسبت جو غلط فہمی ہے اس کا ارتفاع و ازالہ اصل منشائے غلط کو ظاہر کرکے علمی استدلال کے ساتھ فرمائیں گے فقط

عبداللہ العمادی

ناظر مذہبی جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

فہرست مضامین نظریۂ سلطنت

عنوان و مضمون	از صفحہ	تا صفحہ
۱	۲	۳

تمت

دیباچہ

قانون اور سیاسیات کا نامور ماہر اور مشہور مصنف، یوحن کاسپر بلنتچلی[1] اُن مصنفوں میں نہ تھا جو ساری دُنیا سے الگ تھلگ اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے نظریے گھڑا کرتے اور اپنی کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھکر نئی کتابیں بنایا کرتے ہیں۔ بلنتچلی نے جہاں علم کی دوڑ میں بہتوں کو پیچھے چھوڑا تھا وہاں عمل کے میدان میں بھی ہمیشہ سب سے آگے بڑھ کے اپنی سرکردگی کا علم بلند کیا۔ پچیس برس کی عمر میں وہ اپنے وطن تسیورش کی جامعہ میں پروفیسر مقرر ہوتا ہے؛ چھے برس بعد (ستمبر ۱۸۳۹ء میں) اُس شہر میں جو سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اُن میں وہ شہریوں کے فریق (یعنے کنسرویٹیو پارٹی) کے سرگروہ کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے اور آگے چل کے ایک آزادی پسند کنسرویٹیو فریق کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب کہ اُس کی قابلیت کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں میونک کی جامعہ نے اور پھر ۱۸۶۱ء میں ہائی ڈیل برگ کی جامعہ نے اُسے پروفیسری کی دعوت دی۔

جرمانیا پہنچ کر اُس نے اپنے کو کبھی غیر ملکی نہ جانا بلکہ اول دن سے جرمانی ہی تصور کیا، اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ تھا بھی جرمانی ہی[2]۔ اپنے وقت کو اُسنے

---

[1] ۷ مارچ ۱۸۰۸ء کو سوئیس (سویٹزرلینڈ) کے شہر تسیورش (زیورچ) میں پیدا ہوا اور ۲۱ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو کارلس روہے (جرمانیا) میں مرا۔

[2] بلنتچلی نے اعلی تعلیم کی تکمیل جرمانیا میں رہ کر کی تھی جہاں وہ مشہور جرمانی علمائے فن سوینی (Savigny

صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں صرف نہیں کیا بلکہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ عملی سیاسیات میں بھی نمایاں کام کرتا رہا۔ بویریا کی مجلسِ اعلیٰ کا رکن منتخب ہو کر آزاد قومی (نشنل لبرل) فریق میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اوروں کے ساتھ شامل ہو کر اُس نے "جرمانی نمایندوں کی مجلس" قائم کی ۱۸۶۵ء میں "جرمانی پروٹسٹنٹوں کی انجمن" کی بنیاد رکھی اور ۱۸۷۳ء میں "بین قومی قانون کا اِدارہ" قائم کیا۔

اُس کی زیادہ اہم تصنیفوں کے شائع ہونے کا سلسلہ ۱۸۴۱ء سے شروع ہوا اور آخر عمر تک برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۲ء میں اُس کی بلند پایہ کتاب، جسے اُس کا "شاہکار" کہنا چاہیے، "عمومی قانون سلطنت، تاریخی بنیاد پر"، کے نام سے ایک جلد میں شایع ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی کہ جلد جلد کئی بار چھپی اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ جب پانچویں اشاعت کی نوبت آئی تو مصنف نے اُس میں بہت زیادہ اضافہ کیا اور "زمانۂ حال کی سلطنت کا نظریہ" نام رکھکر اُسے دو جلدوں میں شایع کیا (۱۸۷۵ء)۔ اب پہلی جلد کا نام "عمومی نظریۂ سلطنت" اور دوسری کا "عمومی قانون سلطنت" قرار پایا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف نے ایک اور جلد اضافہ کی اور یہ تیسری جلد "سیاسیات" کے نام سے ایک سال بعد شایع ہوئی۔ بلنچلی کے مرنے کے پانچ برس بعد پہلی دو جلدوں کی اشاعت چھٹے بار پروفیسر لوننگ کی ادارت میں ہوئی (۱۸۸۶ء)۔

تینوں جلدوں کے فرانسیسی ترجمے کی پہلی اشاعت مصنف کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی (۱۸۸۱ء) اور اِیتالی ترجمہ اُس کے مرنے کے دو برس بعد (۱۸۸۳ء میں) چھاپے خانے سے نکلا۔ انگریزی میں فقط پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے جو پہلے بار ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں شایع ہوا اور پھر ۱۸۹۲ء میں بعض خفیف ترمیموں کے ساتھ۔ تیسری اشاعت ۱۸۹۵ء میں ہوئی جو دوسری اشاعت کی محض نقل ہے۔

قاضی تلمذ حسین صاحب، ایم۔ اے، رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ، جامعہ عثمانیہ نے اِسی انگریزی ترجمے کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے جامعہ کی مجلس نصاب تاریخ نے بہت پسند کر کے یہ سفارش کی کہ چھپنے سے پہلے اردو ترجمے کا مقابلہ اصل جرمانی متن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور آئش ہورن Eichhorn کا شاگرد رہا۔

[1] اصل کتاب کی چھٹی اشاعت کیلیے جو یادداشتیں پروفیسر لوننگ نے قلمبند کی تھیں اُن کا مسودہ بھی انگریزی مترجموں کے پیشِ نظر تھا اور فرانسیسی ترجمے سے بھی اُن کو بہت کچھ مدد ملی۔ (دیکھیے انگریزی ترجمے کے دیباچے کا آٹھواں صفحہ)

سے بھی کر لیا جائے اور یہ خدمت میرے سپرد ہوئی میں اِس تجویز کو قبول کرنے کی جانب محض اِس خیال سے مائل تھا کہ اکثر حالتوں میں اگر جبہ مانی زبان سے براہِ راست اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ شگفتہ ہوتا ہے بہ نسبت اُس ترجمے کے جو انگریزی کے واسطے سے ہوا ہو، پھر بھی ہامیں بھرنے میں مجھے گونہ تامل تھا اِس لیے کہ میں اُس فن کا ماہر نہیں جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور پھر کتاب بھی ایسی جس کی مثال یورپ کی زبانوں میں بھی نہیں ملتی۔ انگریزی کا ترجمہ تین مسلّم انگریز ماہروں کی اجتماعی محنت اور نقد و تنقیح کا نتیجہ ہے اور اردو کے مترجم صاحب بھی اِس فن میں غائر اور وسیع نظر رکھنے کے علاوہ اردو کے جید انشا پرداز اور بڑے کہنہ مشق ترجمہ کرنے والے ہیں۔ مگر جب میں نے خود قاضی صاحب ہی کو مُصر پاکر ڈرتے ڈرتے چند ورقوں کا مقابلہ کیا تو انھوں نے اُسے بہت پسند کیا بلکہ جو خیال میں نے ترجمے کے طرزِ عبارت کو بدلنے کے متعلق ظاہر کیا اُس سے بھی اُنھوں نے اتفاق کیا اور مقابلے کے دوران میں بار بار میری محنت کی داد دے دے کے ہمت بڑھاتے رہے۔ جو اجزا میں مقابلہ کر کے شعبۂ تالیف کے دفتر میں بھیجتا وہ اُن کی نظر سے گزرتے اور بعض امور کا فیصلہ ہم دونوں کی خط کتابت سے طے پا لیتا تب مسودہ صاف کرایا جاتا۔ غرض کہ ایک ایک لفظ کو جانچ کر اردو ترجمہ بنایا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مقابلے کے کام میں کچھ اوپر دو برس لگ گئے۔

انگریزی ترجمہ مجموعی حیثیت سے بُرا نہیں۔ اور بعض مفید حاشیے بھی مترجموں نے اضافہ کیے ہیں۔ مگر جبرمانی متن سے مقابلہ کرنے میں مجھے انگریزی کتاب میں کچھ سقم دکھائی دیے۔

(۱) اکثر مقامات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کی طرف مترجموں نے خود ہی اشارہ کیا ہے[۱]۔ کہیں تو متن کے لفظوں سے قطع نظر کر کے مطلب کو انگریزی میں ادا کیا ہے اور کہیں ٹکڑے کے ٹکڑے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ڈھنگ شاید انگریزی بولنے والے ناظرین کے لیے کچھ بہت بیجا نہ ہو لیکن اردو پڑھنے والوں کے لیے بالکل نامناسب ہوتا۔ بنجلی جیسے مصنف کی عبارت میں اِس طرح کا تصرف سراسر ظلم ہے۔

[۱] انگریزی ترجمے کا دیباچہ، ص ۶۔

اِس قسم کے تصرف کا حق اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ چھٹی اشاعت کے فاضل مدیر، لوئینگ کو، مگر وہ خود یوں کہتا ہے[1]:—

راقم حروف کے سپرد یہ پُر اعزاز خدمت کی گئی ہے کہ وہ اِس نئی اشاعت کو سرانجام دے۔ مگر اِس خصوص میں اُس کی کارگزاری صرف ایک محدود حیثیت کی ہو سکتی تھی۔ بلنٹچلی کی یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ محدود معنوں میں ایک درسی کتاب کہی جا سکے، وہ کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سوکھے سلکھے نقروں کو ایک دوسرے پر جما جما کے مردہ معلومات کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہو، نہ وہ کوئی اِس ڈھب کی کتاب ہے کہ کسی خاص زمانے میں فن کی جو حالت ہو اُس کے لحاظ سے بعض ٹکڑے اُس میں سے نکال لیے جائیں اور اُن کی جگہ اور ٹکڑے بھرتی کر دیے جائیں۔ اِس کتاب کی حالت تو یہ ہے کہ اُس کے ہر جملے پر مصنف کی انوکھی شخصیت کا سکہ لگا ہوا ہے۔ یہ خصوصیت خاص کتاب کے جسم و جان کا ایک جز ہے (جو الگ نہیں کیا جا سکتا)، اور یہ مصنف کا محض احترام ہی نہ تھا جس نے راقم کو تبدیل و تعدیل سے باز رکھا بلکہ اِس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اِس قسم کی دست اندازی سے کتاب کی قدر و قیمت برباد جائے گی۔ بلنٹچلی کے قانونی اور سیاسی، تاریخی اور کلیسائی تصورات سے راقم کی رائیں اکثر کسی قدر مختلف ہیں مگر اُس نے اِس بات کو ناروا جانا کہ اِس محل پر مصنف کی رایوں کا مقابلہ کرے یا اِس اختلاف کی طرف اشارہ بھی کرے، کہ اِس طرح سے وہ اثر کمزور پڑ جاتا جسے مصنف نے اپنی کتاب کے پڑھنے والوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب جیسی پہلے بلا شرکت غیرے بلنٹچلی کی ودایتی ملک تھی، اب بھی ہے۔

راقم نے اُنھیں عبارتوں میں تبدیل اور اضافہ کرنے کی جرأت کی جو اصل کتاب کا جز نہ تھیں[2]۔ تاریخی یا ادبی بیانات میں جو پیش پا افتادہ غلطیاں کسی نہ کسی طرح کتاب میں آ داخل ہوئی تھیں وہ دور کر دی گئیں۔ اہم واقعات اور قوانین جن کا علم

---

[1] جرمانی کتاب کی چھٹی اشاعت کا دیباچہ، ص۔ ۱۲-۱۳۔

[2] یعنی تمہیدوں، حاشیوں وغیرہ میں۔ ع۔ ص۔

مصنف کو ۱۵۱۷ء میں نہ تھا اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ کتاب میں جو عبارتیں
اور مصنفوں کی نقل کی گئی تھیں اُن کی تفصیلی نظرِ ثانی بھی ایک ضروری چیز تھی......
جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ کھنی دار خطوں یعنی [ ] کے ذریعے
سے ظاہر کر دیا گیا ہے[1]

میکیاولی کی پُرزور اور واضح زبان بھی، جو اُسی کا حصہ ہے، بلا کسی ردو
بدل کے اصلی حالت پر قائم رکھی گئی۔ خود اُن مقامات پر بھی پرانا متن جیوں کا تیوں
رہنے دیا گیا جہاں میکیاولی نے نامانوس لفظوں اور فقروں کا استعمال کیا تھا جو کبھی
کبھی بعض سوئیسی علاقوں کی بولی ٹھولی کو یاد دلا دیتے ہیں اور جو ہمیشہ نحو اور طرز
تحریر کے ٹکسالی قاعدوں کے مطابق نہیں ہوتے۔ صرف ایسے موقعوں پر خفیف تغیر
تبدیل کرنے کی جسارت کی گئی جہاں یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ غلطی کی بنا سہوِ کتابت پر ہے۔

(۲) انگریزی مترجموں نے جا بجا صرف تلخیص ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اکثر مصنف کے لفظوں
سے دور جا پڑے ہیں اور ترجمے کی عبارت دھندلی ہو گئی ہے۔ بعض جگہ صرف اس وجہ سے
ترجمے کا حق ادا نہ ہو سکا کہ جرمانی لفظوں یا فقروں کے ٹھیک ہم معنی لفظ یا فقرے انگریزی
میں مل نہ سکے مگر ایسے مقامات بھی کچھ کم نہیں پائے گئے کہ لفظ انگریزی میں موجود تھے پھر
بھی بے پروائی کے ساتھ اُن کی جگہ پر غلط لفظ رکھ دیے گئے۔

(۳) سب سے بڑا ستم انگریزی کتاب میں یہ ہے کہ ترجمے کی ایسی غلطیاں بھی جا بجا موجود ہیں
جنھیں دیکھ کر سوا اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مترجموں کو جرمانی زبان پر عبور نہ تھا۔ مثلاً اسم
واحد ہے اور ترجمہ جمع میں کر دیا گیا جس سے مضمون خبط ہو گیا یا ایک ہی مادے سے دو لفظ
مشتق ہیں مگر دونوں کے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور مترجموں میں سے کسی ایک
کو بھی اس کا احساس نہ ہوا۔

---

[1] انگریزی ترجمے میں لوئینگ کے حاشیوں کو (الف)، (ب)، وغیرہ سے ظاہر کیا ہے اور جو اضافے
انگریزی مترجموں نے اپنی طرف سے کیے ہیں وہ کھنی دار خطوں کے اندر رکھے گئے ہیں مگر اس اصول
کی پوری پابندی نہیں کی گئی مثلاً دوسرے مقالے کے بائیسویں باب کا حاشیہ ۲۴، مترجم کی طرف سے ہے مگر انگریزی
کتاب میں کوئی علامت ایسی نہیں جس سے یہ بات معلوم ہو سکے۔

(۴) کتابت کی بھی بعض بہت بڑی غلطیاں ہیں جن سے پڑھنے والا یا تو دھوکا کھائے گا یا سخت خلجان میں پڑ جائے گا۔

اِن تمام اسقام نے جمع ہو کر اردو میں ترجمہ کرنے والے کے لیے چند در چند صعوبت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کتاب کے بعض مقامات کا وہ ترجمہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے دیکھا جو اصل متن سے راست اردو میں کیا گیا تھا تو انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا:

"میکیاولی کے متعلق ...... اگر آپ یقین کریں تو اتنا عرض کروں گا کہ بعض مقامات کے ترجمے میں میں خود متردد ہو گیا تھا اور ...... [فلاں فلاں مقامات] ...... کا ترجمہ میں نے خود تامل کے ساتھ کیا، مگر میں مجبور تھا۔"

انگریزی ترجمے کی کمزوریوں پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اصل جرمانی متن کی پوری پیروی کی جائے؛ پس جہاں کہیں میں نے دونوں میں اختلاف پایا اصل کے مطابق اردو ترجمے کو بنا دیا۔ اہم اختلافوں اور چھاپے کی غلطیوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو اِس دیباچے کے تکملے کے طور پر کتاب میں شامل ہے۔ جو عبارتیں اور حاشیے اس باعث سے ترجمہ ہونے سے چھوٹ گئے تھے کہ وہ لاتینی، یونانی، فرانسیسی یا اِتالی زبان میں تھے اُنکا بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔ جن کتابوں کا حوالہ حاشیوں میں دیا گیا تھا اُن کے ناموں کا بھی، جہاں تک ہو سکا، اردو میں ترجمہ کر دیا گیا تاکہ ہر کتاب کا موضوع معلوم ہو سکے۔

جرمانی، فرانسیسی، ولندیزی وغیرہ ناموں کی کتابت میں انگریزی تلفظ کا تتبع کرنا سراسر غلط ہوتا، اس لیے جو نام جس زبان یا قوم سے متعلق تھا اُسے اُسی کے تلفظ کے مطابق اردو حرفوں میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی گو کہ چند در چند دقتوں کے باعث اِس میں پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ اکثر ملکوں کے نام اردو میں انگریزی تلفظ کے موافق لکھے جاتے ہیں باوجودے کہ اردو بولنے والوں کے لیے وہ از حد ثقیل ہوتے ہیں اور بہتوں سے تو وہ نام پڑھے بھی نہیں جاتے، جیسے سوٹزرلینڈ۔ خود اُس ملک کے باشندے اپنے وطن کو اِس نام سے نہیں یاد کرتے بلکہ وہاں جو لوگ فرانسیسی بولتے ہیں وہ اُسے "سوئیس" اور جو جرمانی بولتے ہیں وہ "اشوائتس" کہتے ہیں۔ اردو کے لیے فرانسیسی نام زیادہ مناسب ہے اور اُسے ہم "سوئیس" کہہ سکتے ہیں۔ اِسی طرح "پرشیا"، جس سے اکثر "پرشیا" (ایران) کا دھوکا ہوتا ہے، انگریزی میں اُس خطے کا نام ہے جس کے باشندے خود اُسے "پروسن" تو

کہتے ہیں۔ اردو میں "پروس" یا "پروسیا" نہایت موزوں ہے اور یہی اس کتاب میں اختیار کیا گیا تھا، مگر کاتب نے نہ مانا اور اکثر جگہ "س" کو "ش" کر ہی دیا۔ افسوس ہے کہ اردو کتاب میں کتابت کی اور بھی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ غلط نامہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی تلافی یوں ہی بہتر ہوگی کہ اگلی اشاعت کے وقت اصلاح کر دی جائے؛ اور "نظریۂ سلطنت" کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی دوسری اشاعت کی نوبت بہت دیر میں آئے۔ اس کی سودمندی ارباب فن تک محدود نہیں بلکہ ہر ہوشمند شخص اسے شوق سے پڑھے گا۔

اس موقع پر مجھے یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لفظ مثلاً "لاتینی" "اینانی" وغیرہ "ط" سے نہیں لکھے گئے، اس لیے کہ یہ لفظ عربی زبان کے نہیں ہیں اور مصر اور شام میں بھی ان کا املا "ت" سے اختیار کیا گیا ہے۔ قاضی تلمذ حسین صاحب کو اس میں تامل تھا مگر مبادلۂ خیالات کے بعد انھوں نے اس املا کو منظور کر لیا۔ بعض اور اختلافات بھی تھے جو بحث مباحثے کے بعد طے ہوئے۔ کتاب کے نام کے متعلق میرا خیال تھا کہ "نظریۂ مملکت" ہو، اس لیے کہ مجلس وضع اصطلاحات نے State کے لیے "مملکت" کا لفظ تجویز کیا تھا لیکن قاضی صاحب "سلطنت" کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ پس کتاب میں جہاں کہیں "اسٹیٹ" کا لفظ آیا اس کا ترجمہ "سلطنت" ہی کیا گیا۔

ڈھاکہ
۲۵ ستمبر ۱۹۲۰ء

ع۔ صدیقی

انگریزی ترجمے کے اہم اختلافات جرمانی متن سے

[ہر اختلاف کے نشانِ سلسلہ کے بعد پہلے انگریزی ترجمے کے صفحے اور سطر کا، پھر قوسین میں جرمانی متن (م) کے صفحے اور سطر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دوسری سطر میں اردو (ترجمے) کا صفحہ اور زیرِ بحث عبارت دے کر اختلاف کی تشریح کی گئی ہے]

(۱) ص ۳۱، س ۱-۲ (م-ص ۳۲، س ۲۴-۲۵)۔

اردو-ص ۳۰: "... مگر فائق مدبر اور سپہ سالار (یعنی نپولین) نے ....."

سلسلۂ کلام سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ "فائق مدبر اور سپہ سالار" سے سوا نپولین کے کوئی دوسرا شخص مراد نہیں ہو سکتا۔ مگر انگریزی مترجموں نے جرمانی زبان کے اسم اور صفت کی گردانوں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر دونوں لفظوں "مدبر" اور "سپہ سالار" کو جمع سمجھ لیا اور غلط ترجمہ کر کے عبارت کو خبط کر دیا۔ اردو ترجمے میں مزید وضاحت کی غرض سے قوسین میں "یعنی نپولین" بڑھا دیا گیا۔

(۲) ص ۳۶، س ۹-۱۱ (م-ص ۳۸، س ۷-۸)۔

اردو-ص ۳۷: "اور معدلت کا فرض ..... منضبط کرے۔"

(۳) ص ۴۴، س ۱۲ (م-ص ۴۵، س ۳۲)

اردو-ص ۴۴: "اِس خصلت کا ایک دوسرا ....."

اِن دونوں مقامات پر اختلاف خفیف ہے۔ اردو ترجمے میں اصل کی پیروی کی گئی۔

(۴) ص ۵۱، س ۲۵ (م-ص ۵۳، نیچے سے دوسری سطر)۔

اردو ص ۵۲: "..... متزلزل کر دیا۔"

انگریزی میں "destroyed" کے سوا مشکل سے کوئی اور لفظ مل سکتا تھا۔ اردو میں اِس کا ترجمہ ہوتا: "تباہ کر دیا، برباد کر دیا" مگر یہ ترجمہ اصل متن سے دور جا پڑتا۔ بخلاف اِس کے "متزلزل کر دیا"۔ متن کے لفظ کا ٹھیک مرادف ہے۔

(۵)۔ص ۵۱، س ۳۴ (م۔ص ۵۴، س ۹)۔
اردو۔ص ۵۲، س ۲۱: "۱۳ر اکتوبر"
۳۱ر اکتوبر صحیح تاریخ ہے، اور ۱۳ر اکتوبر سراسر غلط ہے۔ [اردو ترجمے کی عبارت یوں ہونا چاہیے: "جس کے آغاز کی تاریخ ......"]

(۶)۔ص ۵۳، س ۴۔۵ (م۔ص ۵۵، س ۲۳۔۲۴)۔
اردو ص ۵۴: "...... انھیں پر اپنے رومی اور آبائی خیالات سے ......" انگریزی میں اسلوب بیان کو بالکل بدل دیا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔

(۷)۔ص ۵۳، س ۱۸ (م۔ص ۵۶، س ۵)۔
اردو۔ص ۵۴، س ۱۲: "بے شک اِس انقلاب......"
انگریزی مترجموں نے یہاں بھی مفرد کو جمع کر دیا ("اِس" کی جگہ "اِن") جرمانی زبان میں واحد مونث غائب اور جمع مذکر و مونث غائب کے لیے ایک ہی ضمیر استعمال ہوتی ہے اور اردو کی طرح فعل سے فاعل کی وحدت یا جمعیت ظاہر ہوتی ہے یہاں فعل واحد ہے مگر مترجموں نے توجہ نہیں کی۔

(۸)۔ص ۵۵، س ۶۔۸ (م۔ص ۵۸، س ۵۔۹)۔
اردو۔ص ۵۶: "عمر کے بڑھتے بڑھتے...... زمانی فاصلے......"
انگریزی ترجمے میں گونہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۹)۔ص ۵۵، س ۱۳ (م۔ص ۵۸، س ۱۶)۔
اردو۔ص ۵۶: "انگلستان کی سی آئینی بادشاہی......"
متن میں جو "انگلستان" کا لفظ موجود تھا اُسے انگریزی مترجموں نے ضروری نہ خیال کیا ہو مگر اردو میں اُس کے چھوڑ دینے سے ابہام پیدا ہو جاتا۔

(۱۰)۔ص ۵۹، جدول ۱، س ۱۴ (م۔ص ۶۲، جدول ۱، س ۹۔۱۰)۔
اردو۔ص ۶۱، جدول ۱: "دماغی آزادی"
انگریزی ترجمے میں "spritual" کا لفظ سراسر غلط ہے۔ اِس سے ثابت ہو گیا کہ مترجموں کو جرمانی زبان میں مہارت نہ تھی۔ صحیح ترجمہ ہوتا۔
"Intellectual freedom" یا "freedom of thought"

(۱۱)۔ ص ۷۷، س ۲ (م۔ ص ۸۳ س ۳۶ - ۳۸)۔
اردو۔ ص ۷۹: "انسان کے اخلاقی خصائل ..... معاشرت کا بھی"
انگریزی میں کسی قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۲) ص ۸۴، س ۴ (م۔ ص ۸۹، س ۱)۔
اردو۔ ص ۸۴: "نابالغوں کی تربیت اور انضباط"
محض "Discipline" کا لفظ کافی نہیں۔ متن میں "نابالغوں" کا لفظ بھی موجود ہے۔

(۱۳) ص ۸۸، س ۲۴ (م۔ ص ۹۴، س ۱۲-۱۳)
اردو۔ ص ۹۱: "مادری زبان"۔
متن میں "مادری زبان" ہے "قومی زبان" نہیں جیسا کہ انگریزی ترجمے میں لکھا گیا ہے۔

(۱۴)۔ ص ۸۹، س ۱۷-۲۰ (م۔ ص ۹۵، س ۱۳-۱۴)۔
اردو۔ ص ۹۲، س ۹-۱۱۔
مضمون کی ترتیب وتقسیم میں انگریزی ترجمے میں جدت کی گئی ہے مگر یہاں بھی جرمانی متن کو ترجیح ہے۔ اردو میں اصل کا تتبع کیا گیا۔

(۱۵) ص ۹۲، تعلیق ۱ (م۔ ص ۹۸، تعلیق ۱)
اردو۔ ص ۹۵، تعلیق ۱: "قوم کی عمر کے مختلف مدارج ....."
انگریزی میں صرف "عمر" ہے حالانکہ اصل میں جمع کا صیغہ ہے نہ کہ واحد کا۔ یہاں ضمیر کی گردان نے مترجموں کو دھوکا دیا۔

(۱۶)۔ ص ۹۷، س ۲-۵ (م۔ ص ۱۰۳، س ۱۱-۱۴)
اردو۔ ص ۹۱، س ۲-۳۔
انگریزی ترجمے میں دو جملے ملا کر ایک کر دیے گئے ہیں۔

(۱۷)۔ ص ۹۹، س ۱۹، ص ۱۰۵، س ۳ نیچے سے)۔
اردو۔ ص ۱۰۳: "جب فشتے نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور آرنٹ نے تحریروں سے ....."

یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ انگریز مترجموں نے "تقریروں" اور "تحریروں" کو "نظموں
اور گیتوں" کیوں کر بنا دیا۔

(۱۸)۔ص ۹۹ آخیر سطر۔ ص ۱۰۰، س ۲ (م۔ص ۱۰۶، س ۳-۴)۔
اردو۔ص ۱۰۴: "تمام مملکتوں خصوصاً آسٹریا .... عضو بند کر دیا"
انگریزی ترجمے میں بے جا اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۹)۔ص ۱۰۰، س ۱۴ (م۔ص ۱۰۷، س ۱۳-۱۴)۔
اردو۔ص ۱۰۴، س ۱۳-۱۴۔
یہاں بھی انگریزی ترجمے میں اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۰) ص ۱۰۵، س ۱۸-۱۹ (م۔ص ۱۱۴، س ۶-۷)۔
اردو۔ص ۱۱۰: "اعلیٰ تعمیر سلطنت .... محدود نہیں رکھتی۔"
یہاں بھی انگریزی عبارت مختصر اور مبہم ہو گئی ہے۔

(۲۱)۔ص ۱۰۷، س ۱۰ (م۔ص ۱۱۶، س ۱۶)۔
اردو۔ص ۱۱۲: "قوم اپنے نمو کے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے۔"
انگریزی ترجمہ یہاں بھی تشنہ رہ گیا۔

(۲۲)۔ص ۱۱۰، س ۷ (م۔ص ۱۱۹، س ۱۷)۔
اردو۔ص ۱۱۶: "بخلاف اس کے ایک صحت ور، خوش حال اور تربیت یافتہ...."
انگریزی ترجمے میں "خوش حال" کے لیے "beneficient" کا لفظ لایا
گیا ہے جو غلط ہے۔

(۲۳)۔ص ۱۱۳، س ۵ (م۔ص ۱۲۲، س ۱۶، ۱۸)۔
اردو۔ص ۱۲۰، س ۴-۵: "دوری نظامِ سلطنت یونی .... سے جدا"
اس مقام پر انگریزی ترجمے میں ایک پورا جملہ چھوڑ دیا گیا ہے جو اردو خواں طبقے
کے لیے خصوصاً بہت ضروری ہے۔

(۲۴) ص ۱۱۵، س ۱۷ (م۔ص ۱۲۵، س ۱-۲)۔
اردو۔ص ۱۲۲: "ہندو معتقدات کے مطابق"
یہ جملہ بھی اصل میں موجود ہے مگر انگریزی ترجمہ کرنے والوں نے حذف کر دیا تھا۔

(۲۵) ص ۱۲۱، س ۳۰-۳۱ (م ص ۱۳۱، س ۲۲-۲۳)
اردو ص ۱۲۹، س ۵-۶: "وہ قلعوں (یا گڑھیوں) میں رہنے کے شائق ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے۔"
جرمانی زبان میں "بُرگ" قلعے یا گڑھی کو کہتے ہیں اور متن میں یہی لفظ ہے۔ ایک دوسرا لفظ ہے "بیرگ" جس کے معنے ہیں "پہاڑ"۔ انگریز مترجم دونوں میں امتیاز نہ کر سکے گو کہ دونوں کے ہجوں اور تلفظ میں فرق ہے۔

(۲۶) ص ۱۲۲، س ۳۰ (م ص ۱۳۲، س ۲۵)
اردو ص ۱۳۰: "معاسارہ گئی"
انگریزی مترجموں نے غالباً ایک دوسرے لفظ کا دھوکا کھاکر "Doubtful" ترجمہ کر دیا جو صحیح نہیں۔

(۲۷) ص ۱۲۴، س ۲۰ (م ص ۱۳۴-۱۳۵)۔
اردو ص ۱۳۲: "ان کا کام یہ تھا....... اور کریں گے تو کس حد تک۔"
انگریزی ترجمے میں بیجا اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۸) ص ۱۳۲، س ۳۲ (م ص ۱۴۳)۔
اردو ص ۱۴۱، س ۱-۲: "البتہ اُس گروہ ...."
یہاں بھی انگریزی ترجمہ درست نہیں۔ متن میں امرار کا طبقہ مراد ہے نہ کہ عام رعایا۔

(۲۹) ص ۱۳۳، س ۱ (م ص ۱۴۳، س ۲۲)۔
اردو ص ۱۴۱: "ایسی مثالیں بھی کچھ کم نہیں....."
انگریزی ترجمے کا "بعض اوقات" کافی نہیں۔

(۳۰) ص ۱۳۳، س ۱۸-۱۹ (م ص ۱۴۴، س ۹-۱۰)
اردو ص ۱۴۱، س ۱۷-۱۸۔
انگریزی ترجمے میں اختصار کو دخل دیا گیا ہے۔

(۳۱) ص ۱۳۴، س ۱ (م ص ۱۴۵، س ۱-۲)
اردو ص ۱۴۲: "مغربی فرانس نے .... کرلی۔"

انگریزی میں ایک پورا جملہ چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا۔ یہ کمی بھی اصل تن سے پوری کی گئی۔

(۳۲) ص ۱۳۴، س ۲۰ (م۔ص ۱۴۵، س ۲۵-۲۶)۔
اردو۔ ص ۱۴۳، س ۱۔
انگریزی ترجمہ مبہم ہے۔

(۳۳)۔ص ۱۵۳، س ۳۳-۳۴ (م ص ۱۶۹، س ۱۳-۱۵)۔
اِس اختلاف کے متعلق دیکھو اردو، ص ۱۶۴، س ۷-۸ اور حاشیہ۔

(۳۴)۔ص ۱۹۱، س ۱۶-۱۷ (م۔ص ۲۱۱، س ۳۰-۳۱)۔
اردو۔ص ۱۹۰، س ۱۹-۲۲: "خود حکمرانی کرنے کی قابلیت اُن میں نہیں ہے۔ جہاں کہیں اُن کو اِس کوشش کا موقع ملا۔۔۔۔۔۔ وہاں سلطنت کی حالت اُس آدمی کی سی ہو گئی جو سر کے بل کھڑا ہو اور ٹانگیں اوپر کو ہوں۔"
اردو میں اصل کا لفظی ترجمہ بول چال کے بالکل مطابق ہو گیا۔ انگریزی میں ایسا نہیں ہو سکا۔

(۳۵)۔ ص ۲۰۰ (م۔ص ۲۲۳)۔
اردو۔ص ۲۰۷-۲۰۸۔
انگریزی میں بہت اختصار کیا گیا ہے۔ اردو میں تن کا پورا ترجمہ ہے۔

(۳۶)۔ص ۲۰۰، س ۲۲ (م۔ص ۲۲۳، نیچے سے چوتھی سطر)۔
اردو۔ص ۲۰۸، س ۳۳ "اس قسم کی۔۔۔۔۔۔"
اصل تن میں "قانونی" کا لفظ نہیں ہے۔

(۳۷)۔ص ۲۲۱، س ۲۳ (م۔ص ۲۵۳، س ۲۳)۔
اردو۔ص ۲۴۱۔ دیکھو حاشیہ ۲۔

(۳۸)۔ص ۲۲۷، س ۲۴ (م۔ص ۲۵۸، س ۲۵-۲۶)۔
اردو۔ص ۲۳۶، س ۴ "خود ایک ہی اقلیم کے اندر"
انگریزی مترجموں نے جانے "معتدل اقلیم" کیوں کر لکھدیا۔

(۳۹)۔ص ۲۴۷، س ۱۸ (م۔ص ۲۸۵، س ۲۰)۔

اردو۔ ص ۲۵۸، س ۱۷: "تادیب خاتون"
انگریزی ترجمے میں جو "قیدخانوں" لکھا گیا ہے سراسر متن کے خلاف ہے۔

(۴۰)۔ ص ۳۱۲، س ۵ (م۔ ص ۳۵۳، س ۱۸)۔
اردو۔ ص ۳۲۹، س ۱۲: "جنگی زندگی کا منبع وہی ہے ......"
"guided" غلط ترجمہ ہے۔ اُس کے مقابل جو جرمانی لفظ ہے اُس کے معنی "مشتق یا ماخوذ" ہیں۔

(۴۱)۔ ص ۳۴۳، س ۲۳ (م۔ ص ۳۶۶، س ۱۰)۔
اردو۔ ص ۳۴۲، س ۶: "مزدوری کرنے والوں ......"
انگریزی ترجمے میں "مزدور" کے لیے "کاریگر" لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

(۴۲)۔ ص ۳۶۱، س ۷ (م۔ ص ۴۰۶، س ۱۱)۔
اردو۔ ص ۳۸۰، س ۳: "ارکان ملت"
انگریزی والوں نے "ارکان ملت" کو "ارکانِ مملکت" بنادیا۔

(۴۳)۔ ص ۳۶۳، س ۱۴ (م۔ ص ۴۰۹، س ۱۳)۔
اردو۔ ص ۳۸۱، س ۱۸: "جرمانیوں ....."
انگریزی والوں نے "جرمانیوں" کو "رومیوں" کر دیا۔

(۴۴)۔ ص ۳۹۲، س ۱۷-۱۹ (م۔ ص ۴۴۳، س ۸-۱۱)۔
اردو۔ ص ۴۰۵، س ۹-۱۱: "نئے علمائے قانون ...... اور خاص کر (پیرس اور صوبجات کی) شاہی ...... بڑی مدد دی۔"
اردو ترجمے میں متن کی پیروی کی گئی اور جو عبارت انگریزی ترجمے میں زائد تھی وہ قوسین میں رکھی گئی۔

(۴۵)۔ ص ۴۰۹، س ۴ (م۔ ص ۴۶۵، س ۲۱، ۲۲)۔
اردو۔ ص ۴۲۴: "اب ضرورت سے مجبور ہو کر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کر دیا مگر اُس کے بعد ہی ......"
"مگر" سے پہلے کے الفاظ انگریزی مترجموں نے چھوڑ دیے حالانکہ وہ ضروری تھے۔

(۴۶)۔ ص ۴۱۹، س ۶ (م۔ ص ۴۷۸، اخیر سطر)۔

اردو۔ص ۴۳۱، نیچے سے تیسری سطر: "۵ر دسمبر"
متن میں "۵ر دسمبر" ہے مگر انگریزی ترجمے میں "۵ر اکتوبر۔"

(۴۷)۔س ۴۳۱، س ۱-۲ (م۔ص ۴۹۴، س ۱-۲)۔
اردو۔ص ۴۴۴، س ۱: "آئینی شاہی کا تصور یہ ہوتا ہے کہ....."
انگریزی ترجمے میں "must" کا لفظ متن کے مفہوم کو صحیح ادا نہیں کرتا۔

(۴۸)۔ص ۴۷۰، س ۱۲ (م۔ص ۵۴۰، س ۱۴)۔
اردو۔ص ۴۸۱، س ۷-۸: "زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو پھیلا کر انھیں قابل پیداوار بنایا گیا تھا۔"
انگریزی ترجمہ متن کے برعکس ہے۔

(۴۹)۔ص ۵۳۲، س ۲۸ میں جو جملہ ختم ہوتا ہے اُس کے بعد متن کے بعض جملے چھوڑ دیے گئے ہیں اور نو سطروں کا خلاصہ ڈیڑھ سطر میں کر دیا گیا ہے۔ آگے کی سطروں میں بھی بہت اختصار کیا گیا ہے۔

(۵۰)۔ص ۵۳۳ کی سطر ۱۱ سے لیکر سطر ۱۷ تک جو عبارت ہے وہ بھی اصل کی ۲۶ سطروں کا خلاصہ صرف ۶ سطروں میں ہے۔

(۵۱)جن اختلافات کی بناء کتابت یا چھاپے کی غلطیوں پر ہے وہ اگلے صفحے پر درج ہیں:

انگریزی کتاب میں چھاپے یا کتابت کی غلطیاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۳	۱۸	۱۶۶۸	۱۶۸۸ (اردو ص ۵۴، س ۱۱)
۶۴ (حاشیہ ۱)	۲	دونوں سن غلط درج ہیں تحقیق کی گئی تو وہی سن درست نکلے جو جرمانی متن میں درج ہیں۔	(اردو ص ۶۷، حاشیہ ۱، س ۱)
۶۶	۲۲	Puffendorf	Pufendorf
۲۲۷	۱۹	wilder	milder (اردو ص ۲۳۵ اخیر سطر)
۲۵۲ (حاشیہ ۷)	۲	Klober	Klüber
۲۹۸	۹	external	eternal (اردو ص ۳۱۴، س ۱۱)
۳۳۴ (تعلیق)	اخیر	Chapter XVII,	Chapters XIV—XVI,
۳۶۱	۷	wergild	wergeld
۴۱۵	۱۱	Folkething	Volksthing
۴۳۷	۰	(نویں حاشیے کا ہندسہ متن کی سطر ۹ کے بجائے سطر ۲۷ کے آخر میں ہونا چاہیئے تھا۔)	

تمام کتاب میں جرمانی لفظ " staat " کو " stat " لکھا ہے جو درست نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

پہلا باب

علم السیاست

اپنے مفہوم صحیح میں علم السیاست وہ علم ہے جس کا مبحث سلطنت ہے اور جس کا مقصود یہ ہے کہ سلطنت پر اس طرح غور کیجئے، اور اس کو ایسے واضح طور سے سمجھ لیجئے کہ سلطنت کی بنیاد اسکی حقیقت و ماہیت، اس کے مختلف اشکال و مظاہر اور اس کے نشو و نما سب پر احاطہ ہو جائے۔

پس بہت سے علوم جو بسا اوقات علوم سیاسیہ میں شمار کیے جاتے ہیں حقیقتاً اس علم میں داخل نہیں ہیں گو کہ اُن کو بھی سلطنت سے ایک تعلق ہے اور علم السیاست کے امدادی علوم کی حیثیت سے اُن پر لحاظ کرنا بھی لازمی ہے۔ اس قبیل کے علموں میں سے حسب ذیل علوم خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہیں :-

(الف) کسی قوم یا ملت کی ایسی تاریخ جو اُس کی خالص سیاسی یا آئینی تاریخ نہیں ہے بلکہ جو اس قوم کی رفتارِ زندگی کے عام واقعات اور اُس کے افراد کے اعمال و افعال کا حال بیان کرتی ہے اور علوم و فنون، اقتصادی حالات، اخلاقیات، سفارتی اور سیاسی جد و جہد اور جنگی واقعات سے بحث کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں علم السیاست میں شامل نہیں ہیں۔

(ب) اور نہ ایسے شمار و اعداد جو خالصاً سلطنت سے متعلق نہیں بلکہ معاشرتی اور شخصی حالات کو بھی شامل ہیں۔

(ج) اور نہ معاشیات (یا اقتصادیات) جہاں تک کہ اُس کا تعلق اُن اقتصادی قوانین کی تحقیق سے ہے جو صرف سلطنت پر نہیں بلکہ ہر شخص پر عائد ہو سکتے ہیں،

(د) اور نہ نظم معاشرت کا مطالعہ، جہاں تک کہ معاشری زندگی خود اپنے حال پر چل رہی ہو اور اُس نے سلطنتی زندگی کی صورت نہ اختیار کر لی ہو۔

قدیم یونانی پولیٹکی (یعنی پالیٹکس) کا لفظ ہر قسم کے علم السیاست کے لئے استعمال کرتے تھے، ہم (جرمانی) قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات میں احتیاط کے ساتھ امتیاز کرتے اور اُن دونوں کو دو مستقل علم قرار دیتے ہیں اور اُن کے علاوہ کئی مخصوص علموں مثلاً سیاسی شمار و اعداد، قانون نظم و نسق، قانون بین الاقوام، انتظام کوتوالی وغیرہ کو مختص ناموں کے ساتھ اُن دونوں مذکورۂ بالا علموں کے پہلو بہ پہلو قائم کرتے ہیں۔

قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات دونوں کے دونوں فی الجملہ سلطنت ہی سے بحث کرتے ہیں مگر اُن دونوں میں سے ہر ایک علم سلطنت پر جداگانہ پہلو سے اور جداگانہ طریق پر نظر کرتا ہے سلطنت کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھنے کے لئے علم و حکمت نے اُس کے دو اہم پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے: ایک اُس کا نفسِ وجود اور دوسرے اُس کے حرکات زندگی اس لئے کہ جب اجزا کی جانچ پرکھ جدا جدا ہو جائے تو پوری چیز کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس طریق عمل میں نہ صرف نظری بلکہ عملی فوائد بھی ہیں، قانون کی وضاحت، اُس کی وسعت اور اُس کی قوت میں اُس وقت سے بہت نمایاں ترقی ہو گئی ہے جب سے کہ وہ سیاسیات سے قطعی طور پر ممیز کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح سیاسیات کو بھی اسی وقت سے اپنی وسعت میں آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع ملا جب سے کہ اُس کی جداگانہ حیثیت کا مشاہدہ اور اندازہ کیا جانے لگا۔

قانون عامہ سلطنت کے منضبط وجود اور صحیح انتظام پر نظر کرتا ہے اور سلطنت کی عضوی تنظیم اُس کی حیات کے دائمی شرائط، اُس کی ہستی کے ضوابط اور سلطنتی تعلقات کی ضرورت کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قانون عامہ سلطنت سے کما ہی بحث کرتا ہے۔

بخلاف اس کے سیاسیات، سلطنت کے حرکات زندگی اور نشو و نما پر نظر کرتی ہے۔ اور اُن منازل کی نشاندہی کرتی ہے جاہر مساعی عامہ گامزن ہوتی ہیں ایسی راہیں بتاتی ہے جن سے ان منزلوں تک رسائی ہوتی ہے اور وہ تدبیریں سوچتی ہے جن سے حصول مقاصد ممکن ہو وہ واقعات پر قانون کے عمل و اثر کا مشاہدہ کرتی اور اس امر پر غور کرتی ہے کہ مضر نتائج سے حفاظت اور موجودہ انتظامات کے نقائص کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے۔ الغرض سلطنت کی زندگانی اور سلطنت کی عملی کیفیت کو سیاسیات کہتے ہیں۔

باب ۱

پس قانون عامہ کو سیاسیات سے وہی واسطہ ہے جو انضباط کو آزادی سے، جو تعلقات کے پرسکون تعین کو اُن کی پرپیچ حرکت سے یا جو اجسام کو اُن کے افعال اور اُن کے مختلف ذہنی حرکات سے ہے۔

اخلاقیات سے قانون عامہ اور سیاسیات کا فرق۔

قانون عامہ اور سیاسیات دونوں میں اخلاقی جزو بھی شامل ہے، سلطنت ایک اخلاقی چیز ہے اور اُس کے کچھ اخلاقی فرائض بھی ہیں مگر قانون اور سیاسیات کا تعین محض اخلاقی قوانین سے نہیں ہوتا اور نہ کلیتہً اخلاقی قوانین سے، وہ فی نفسہا مستقل علوم ہیں، محض فلسفہ اخلاق کی فصلیں نہیں ہیں بلکہ اُن کی بنیاد سلطنت پر ہے اور سلطنت ہی اُن کی غایت ہے، یعنی وہ سیاسی علوم ہیں بخلاف اس کے اخلاقیات کوئی سیاسی علم نہیں اس لئے کہ اخلاقیات کے بنیادی اصول سلطنت پر مبنی نہیں بلکہ اُس کا وسیع تر پایہ عام انسانی فطرت پر اور اُس کی ارفع و اعلیٰ بنیاد خدائی نظام عالم اور قضا و قدر پر قائم ہے۔

قانون اور سیاسیات کے باہمی تعلقات

قانون عامہ اور سیاسیات کو ایک دوسرے سے بالکل ہی جدا بھی نہ کر دینا چاہیئے، سلطنت واقعیہ ایک زندہ چیز ہے یعنی وہ قانون اور سیاسیات کی جامع ہوتی ہے، قانون بھی کلیتہً جامد اور ناقابل تبدیل نہیں ہے (اور دوسری طرف) سیاسیات کا تحرک سکون کی جانب راجع ہے۔ معہذا قانون محض ایک نظم ساکت نہیں ہے بلکہ اُس کی ایک تاریخ بھی ہے اور اُس کے علاوہ قانون سازی کی سیاسیات بھی ایک چیز ہے۔ جہاں کہیں عضوی (یا ذی حیات) وجود دکھائی دیتے ہیں وہاں ہمیشہ قانون اور سیاسیات کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا ہے جو فرق ہم نے تسلیم کیا ہے وہ اس طرح ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ اور زیادہ خوبی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ قانون کی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں صحیح فرق یہی ہے کہ قانون کی تاریخ اپنے تئیں صرف سلطنت کی معدلہ اور قائم شدہ ہستی کے نشوونما کے اظہار اور اُس کی مستقل تنظیمات و قوانین کے پیدا ہونے اور اُن کے تغیر کے اعلان تک محدود رکھتی ہے لیکن سیاسیات کی تاریخ قوم کی تغیر پذیر قسمت آزمائیوں، اُس کی گوناگوں حالتوں، مدبروں کی نیات و اعمال اور قوم اور مدبروں دونوں کی کارروائیوں اور مصیبتوں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتی ہے، اور اس پر نہایت متحرک انسانی زندگی کو بیان کرتی ہے۔ قانون عامہ کا سب سے اعلیٰ اور سب سے خالص اظہار نظام سلطنت (یعنی قانون اساسی) کی صورت میں پایا جاتا ہے، سیاسیات کا سب سے روشن اور سب سے پُرحیات ظہور خود سلطنت کی عملی کارفرمائی (یعنی حکومت) میں نظر آتا ہے۔ اس لئے سیاسیات میں علم کے بہ نسبت فن کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے۔ پس سیاسیات کے لئے قانون کو (بطور اصول متعارفہ کے) پہلے ہی سے مان لینا لازم ہے کیونکہ سیاسیات کی آزادی

باب ۱

کے لئے اگرچہ قانون ہی ایک اکیلی شرط نہیں ہے مگر پھر بھی ایک بنیادی شرط ضرور ہے۔ سیاسیات کو اپنی رفتار میں حدود قانونی کا لحاظ رکھنا لازم ہے اس لئے کہ وہ زندگی کی بدلنے والی ضروریات کا اہتمام اپنے ذمے لیتی ہے۔ دوسری جانب قانون کو سیاسیات کی امداد کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ وہ موت کی سی افسردگی سے محفوظ اور زندگی کی ترقیوں کے ہمقدم رہ سکے سیاسیات کے روح پرور انفاس کے بغیر پیکر قانون "ایک جسد بے روح ہوگا اور قانون کے آثار و حدود کے بغیر سیاسیات بے لگام خود غرضی اور ہلاک کن ہوسوں میں پڑ کر تباہ ہو جائے گی۔ محض وضاحت اور آسانی بیان کے لئے نظریہ سلطنت کے ان دو فرعی علموں یعنی قانونِ عامّہ اور سیاسیات کے قبل ہم علم السیاست کے ایک تیسرے بلکہ سب سے مقدم جزو کو پیش کرتے ہیں۔ یہ فرع عمومی نظریہ سلطنت ہے اس میں ہم سلطنت کو قانون و سیاسیات کی دو حیثیتوں میں تمیز کئے بغیر اس پر مجموعۃً نظر کرتے ہیں۔ سلطنت کا تصور، اس کی بنیاد، اس کے خاص اجزاء (ملک و قوم) اس کے پیدا ہونے اور ترقی پانے کی کیفیت، اسکی غرض و غایت، اس کے نظام اساسی کی خاص شکلیں، اس کے اقتدار شاہی کی تعریف اور تنظیم عضوی یہی عمومی اصول سلطنت کے موضوعات ہیں اور پھر اپنی باری میں یہی عمومی نظریہ سلطنت علم السیاست کے دو خاص اجزا یعنی قانونِ عامّہ اور سیاسیات کی بنا ہے۔

اس تصنیف کا پہلا حصہ عمومی نظریہ سلطنت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسرا حصّہ قانون عامہ کے لئے اور تیسرا حصّہ سیاسیات کے لئے ہے[۱]۔

---

[۱] یہ ترجمہ صرف پہلے حصے کا ہے۔

دوسرا باب

علمی تحقیق کے طریقے

صحیح اور غلط طریقے

سلطنت کے متعلق علمی تحقیق و تفتیش مختلف نقطہائے خیال اور مختلف طریقوں سے اختیار کی جاسکتی ہے۔ علمی تحقیق کے صحیح طریقے دو ہیں اور انھیں دونوں طریقوں کی افراط یا تفریط سے دو غلط طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ صحیح طریقوں کو ہم فلسفیانہ اور رمور خانہ کہہ سکتے ہیں۔ انھیں دونوں طریقوں کی نسبی، اہم خصوصیت کو مبالغے کی حد تک پہنچانے سے فاسد طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مبالغے سے فلسفیانہ طریق تخیل مجرد کی اور مورخانہ طریق تظفن محض کی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔

تخیل پرستی

ان دونوں طریقوں کا یہ اختلاف کچھ تو قانون اور سیاسیات کے خصوصیات ذاتی سے وابستہ ہے اور کچھ ان لوگوں کے ذہنی میلان کے اختلافات سے تعلق رکھتا ہے جو ان مباحث کے مطالعہ میں مشغول رہے ہیں۔ تمام قوانین اور جملہ سیاسیات ایک تخیلی پہلو رکھتے ہیں جو ایک اخلاقی و روحانی عنصر ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک حقیقی بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں اور ایک مادی شکل اور قیمت بھی رکھتے ہیں اور اسی آخرالذکر پہلو کے سمجھنے میں تخیل پرستوں سے غلطی ہوتی ہے اور وہ اس سے بے پروا ہو جاتے ہیں، وہ ایک سیاسی اصول کی بالکل مجرد صورت کو اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور اسی سے منطقی نتائج کا نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کا کچھ لحاظ نہیں کرتے کہ نظام سیاسی کے حقیقی واقعات کیا ہیں۔ افلاطون تک اپنی کتاب سیاست مدن[1] میں اس لغزش سے نہ بچ سکا اور ایسی رائیں اختیار کر لیں جو سراسر فطرت انسانی اور رواج بشری کے خلاف واقع ہوئی ہیں تاہم وہ اپنی علوئے طبیعت اور لطافت پسندی کی وجہ سے

---

[1] میں نے اس موقع پر (Republic) کا ترجمہ سیاست مدن کے لفظ سے کیا ہے کیونکہ ری پبلک سے یہاں مراد جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ کتاب انتظام تمدن سے متعلق ہے۔

اُن نہایت لایعنی کلیات کے قائم کرنے سے محفوظ رہا جن کو ہم مصنفین حال کے فلسفۂ سیاسی میں بکثرت پاتے ہیں۔ سلطنت ایک زندہ اخلاقی عضویہ ہے نہ کہ ہیگیٹ منطق کی پیداوار۔ اور قانونِ عامہ تخمینی خیال آرائیوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔

یہ طریقہ جب تک نظریات کی حد میں رہتا ہے اِس سے بے سود نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جب عملیات کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو جمے ہوئے (غلط) خیالات کو نہایت ہی خطرناک اثر بخشتا اور موجودالوقت سیاسی تنظیمات کے نقض و تخریب کی طرف رجوع ہوجاتا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں چونکہ لوگوں کے جذبات بالکل بے قید ہوجاتے ہیں اس لئے وہ انھیں خیالی اصولوں کی طرف راغب ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی مدد سے وہ قانونی قیود سے آزاد ہوجائیں گے۔ اس قسم کی تخیل پرستی بہت آسانی کے ساتھ خطرناک قوت حاصل کرلیتی ہے جس میں خود کسی نئی تنظیم کے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی مگر جو ایک دیو کی طرح اُن تمام چیزوں کو برباد کردیتی ہے جو اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ فرانسیسی انقلاب اپنے پُرجوش واقعات کے ذریعے سے اس رائے کی صداقت کے عبرت ناک ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرچکا ہے۔ اور نپولین کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "مابعد الطبیعیات والوں اور خیال پرستوں نے فرانس کو تباہ کیا"۔ "آزادی و مساوات" کے خیالی خبط نے فرانس کو برباد کردیا اور اس میں خون کی ندیاں بہادیں اسی طرح اصول شاہی کے نظریہ محض کے مسلمہ غلبے نے جرمانیا کی سیاسی آزادی کو دبادیا اور اس کی طاقت کی ترقی کو روک دیا۔ اب اس زمانے میں قومیت کے خیالی اصول کو عملی صورت میں لانے کی کوشش نے تمام یورپ کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ صحیح سے صحیح اور مفید سے مفید خیالات جب تخیل پرستوں کے دماغوں میں سما جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر تنگ ظرف کٹڑوں کے تختۂ مشق بنتے ہیں تو اُن سے سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔

تطفنن

خالص تطفنی طریقہ دوسری جانب کی یکطرفہ افراط کا نتیجہ ہے، وہ صرف ظاہری ہیئت، قانون کے الفاظ اور حرفی واقعات سے غرض رکھتا ہے۔ علمی حیثیت سے اس طریقے کا زیادہ سے زیادہ نفع یہ ہے کہ ترتیب نتائج کے لئے کثرت کے ساتھ مواد فراہم ہوجائے۔ عملی سیاسیات میں اس طریقے کے ماننے والے بڑی تعداد میں پیدا ہوجاتے ہیں خاصکر مطلق العنان حکومت کے عہدہ دار اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تطفنی طریقہ اگرچہ تخیلی طریق کی طرح تمام سلطنت کو یکدم

سے خطرے میں نہیں ڈال دیتا تاہم انصاف کی شمشیر آبدار کو زنگ آلود کر دیتا، مفاد عامہ میں ہر طرف سے حارج ہو جاتا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے نقائص پیدا کر دیتا ہے۔ سلطنت کی اخلاقی قوت کو کمزور کر دیتا اور اس کی صحت میں ایسا انحطاط پیدا کر دیتا ہے کہ نازک وقتوں میں سلطنت کا بچنا دشوار بلکہ کبھی کبھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر تخیلی طریقے پر عمل کرنے سے سلطنت مرض کی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو یہ تظننی طریقہ اُسے مزمن امراض کا شکار بنا دیتا ہے۔

مورخانہ طریقہ

تظننی طریقے پر مورخانہ طریقے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے محض موجودالوقت تنظیمات اور وقتی واقعات کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر دیتا بلکہ ماضی وحال کے اندرونی تعلقات، قومی زندگی کے عضوی نشوونما، تاریخ کے منکشف کردہ اخلاقیات سب کی معرفت حاصل کرتا اور اُن کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ بھی حقیقی واقعات پر مبنی ہے مگر وہ اُن واقعات کو مردہ نہیں بلکہ ایک زندہ چیز سمجھتا ہے۔

فلسفیانہ طریقہ

اسی صحیح مورخانہ طریقے کے ساتھ صحیح فلسفیانہ طریقہ بھی ہم رشتہ ہے جو صرف تخمین مجرد پر نہیں بلکہ اوراک واقعات پر مبنی ہے اور اسی لئے اس میں تخیلات و واقعات دونوں کے دونوں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر مورخانہ طریقے کی بنیاد ظاہری واقعات اور ان کے ارتقا پر ہے تو فلسفیانہ طریقے کی بنیاد انسانی طبائع کے سمجھنے پر ہے اور وہ اسی نقطۂ نظر سے ارادۂ انسانی کے اُن مظاہر کو دیکھتا ہے جو تاریخ کے ذریعے منودار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں نے ان دونوں طریقوں کو جمع کیا ہے

بالغ نظر علمائے فن میں سے بیشتر اپنے رجحان فطری کے باعث کسی ایک جانب مائل ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جنھوں نے دونوں طریقوں کو جمع کیا ہو۔ اس زمرے میں ارسطو خاص قدر و منزلت کا مستحق ہے اُس کی کتاب "سیاسیات" اگرچہ تاریخ عالم کے عہد طفولیت میں لکھی گئی تھی جبکہ سلطنت کو نشوونما اور ترقی حاصل نہیں ہوئی تھی مگر یہی کتاب دو ہزار برس سے سیاسی حکمت کا پاکیزہ ترین سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ سیسرو نے اپنے طرز استدلال اور انداز بیان میں رومیوں سے زیادہ ذی جوہر یونانیوں کا فلسفیانہ اسلوب اختیار کیا ہے مگر اُس نے اپنی تصنیف کے بہترین اجزا کا مواد اور وم کی عملی سیاسیات سے اخذ کیا اور اس کا ایسا کرنا بالکل بجا تھا۔ زمانۂ حال کے لکھنے والوں میں بودین (فرانسیسی) و یکو (اطالی) اور بیکن فلسفیانہ اور مورخانہ دونوں طریقوں کے جامع کہے جانے کے مستحق ہیں۔ برک جس طرح اپنی فصیح البیانی کی شان اور دلآویزی میں سیسرو سے مشابہت رکھتا ہے اُسی طرح وہ اپنے

باب ۲

ملک کے علم سیاست کے اصول کو اپنے ہی ملک کی تاریخ اور اپنی ہی قوم کی زندگی سے اخذ کرنے اور ان کو فلسفیانہ عظمت اور عالمانہ شوکت کے ساتھ بیان کرنے میں بھی سیسرو کے دوش بدوش معلوم ہوتا ہے مکیاویلی (ایطالی) نے اپنی تصانیف کو ایک عمیق نظر اور ہوشمند مردم شناس کے غم افزا تجربات کا مخزن بنا دیا ہے اور مونٹیسکیو (فرانسیسی) نے کشادہ پیشانی اور خندہ روئی کے ساتھ دنیا پر نگاہ ڈال کر برجستہ خیالات اور قطعی مشاہدات سے اپنی تصانیف کو مالامال کر دیا ہے یہ دونوں کبھی ایک طریق اختیار کرتے ہیں کبھی دوسرا۔ تاہم اول الذکر زیادہ تر مورخانہ طریق کی طرف اور ثانی الذکر فلسفیانہ طریق کی طرف مائل رہتا ہے۔ برخلاف اُن کے روسو اور بینتھم اکثر جرمنوں کی طرح زیادہ تر فلسفیانہ ہی طریق کے پابند رہتے ہیں مگر وہ اپنے معلم اعلیٰ افلاطون کی بہ نسبت تخیل پرستی کی یکطرفہ غلطی میں زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مورخانہ اور فلسفیانہ طریق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں۔

بیان مذکورۂ بالا سے واضح ہے کہ مورخانہ اور فلسفیانہ طریقوں کے درمیان کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا بلکہ ایک سے دوسرے کی تکمیل و تصحیح ہوتی ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اسی پر تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اب نئے قانونی خیالات نہیں پیدا ہو سکتے اس کی نظر تاریخ کے متعلق بہت ہی محدود اور تنگ ہے اسی طرح جو شخص سمجھتا ہے کہ اسی کی ذات پر تمام صحیح اصولوں کی ابتدا و انتہا ہو گئی ہے وہ ایک خود بین وہمی مغز متفلسف ہے اور بس۔ جو شخص صحیح معنوں میں مورخ ہو گا وہ فلسفے کی قدر و منزلت کو تسلیم کرے گا اور اسی طرح ایک سچا فلسفی تاریخ کے تجربات سے بھی فائدہ اُٹھائے گا۔

دونوں طریقوں میں سے ہر ایک کی خاص خوبیاں اور پھر خاص کمزوریاں اور خطرے ہیں۔ مورخانہ طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کے نتائج وافر اور قطعی ہوتے ہیں اس لئے کہ تاریخ جیتے جاگتے تنوعات سے بھری ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ پوری پوری حتمی و قطعی بھی ہے، جو خیالات بنی نوع انسانی کی تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں اُن کے مقابلے میں وہ سارے خیالات جو ایک بار آور سے بار آور دماغ پیدا کر سکتا ہو ہیچ پوچ ہوں گے اور عموماً ایک غیر معتبر اور دھندلی شکل اختیار کریں گے البتہ اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ تاریخی طریقوں پر چلنے سے شاید ہم انواع و اقسام کے لاتعداد حالات میں پڑ کر اپنے اصلی مقصود کو بھول جائیں اور اُسے کھو بیٹھیں، مواد کثیر کے بوجھ سے دب جائیں، تاریخی مشاہدات کی ہیئات ہمیں مغلوب کرلے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گزشتہ زمانے کے حالات سے مرعوب و مسحور ہو کر ہم اپنی نظر کی اُس تازگی کو کھو بیٹھیں

باب ۲

جس سے ہمیں موجودہ اور آئندہ زندگی کی طرف دیکھنا چاہئے۔ یہ کچھ لازم نہیں کہ یہ نقائص بہرحال میں مورخانہ طریقے کے لابدی نتائج ہوں مگر تاریخ خود ہی ہمیں بتاتی ہے کہ وہ لوگ جو ہمہ تن اُسی کے ہو رہے ہیں، اکثر اس قسم کی بے راہ روی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

اس کے مقابلے میں فلسفیانہ طریق کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے مقصود اصلی صاف ہو جاتا ہے، اختیار کردہ نظام میں یکرنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، حصول تکمیل کی آرزو جس کے لئے انسان ہر جگہ اور ہر زمانے میں کوشش کرتا ہے۔ پوری طرح بر آتی ہے یعنی وہ اپنے منتہائے خیال کو حاصل کر لیتا ہے فلسفیانہ طریقے سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ انسانی طبیعت کے موافق اور منتہائے خیال کے مطابق ہوتے ہیں۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ طریقہ بھی خطرات سے خالی نہیں ہے، فلسفی اپنا غایت الہم توحد نتائج کو بنا کر اس درجہ اُس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی اندرونی پیچیدگیوں اور حیات واقعی کے معمور خزانوں کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خیالات کی بے قید بلند پروازی میں پڑ کر کثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی قوانین کے دریافت کرنے کے بجائے لاحاصل کلیات اور لایعنی مزخرفات کے بنانے میں وہ اپنا وقت نہ ضائع کر دیتے ہوں۔ وہ فطری نشو و نما کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے، کچے پھل توڑ لیتے، بے جڑ کے درخت لگانے لگتے، اور تخیل پرستی کے اوہام باطلہ میں ڈوب جاتے ہیں۔ چند ہی عالی ہمت فلسفی ایسے ہوئے ہیں جو ان غلطیوں سے بچ نکلے ہوں۔

فائدہ ۱۸۴۳ء میں میں نے ایک کتاب "جرمانیہ میں اصول قانون کے موجودہ طریقے" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں ان خیالات اور ان کے مثل دوسرے خیالات کو جرمانیہ کے علمی نقطۂ نظر سے ربط دیگر تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، مگر اس سے مدتوں پہلے انگلستان کا لارڈ چانسلر بیکن اپنے زمانے کے قانون فطرت اور انسانی اصول قانون کے مروجہ طریق کے مطالعہ پر اعتراض کر چکا اور تاریخ فلسفہ کے امتزاج سے قانون میں ضروری اصلاح کی توقع ظاہر کر چکا ہے۔

تیسرا باب

عام اور خاص علم السیاست

خاص علم السیاست کسی مخصوص قوم اور ایک ہی سلطنت تک محدود ہوتا ہے اِس کی مثالیں روما کی قدیم جمہوریہ جدید انگریزی نظامِ سلطنت اور موجود الوقت جرمانی شہنشاہی ہیں۔

برخلاف اس کے عام علم السیاست سلطنت کے ہمہ گیر تصور پر مبنی ہے مخصوص سلطنت کی بناء ایک معین قوم پر ہوتی ہے، عام سلطنت جو انسانی فطرت پر نظر رکھتی ہے کل بنی نوع انسان پر مبنی ہے۔

سلطنت کے عام نظریئے اور بالخصوص عام قانون عامہ کی نسبت اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دلخواستہ تخیل کا نتیجہ ہے، اور کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کے حالات پر ایک تخمینی نظر ڈال کر محض منطقی استدلال کے ذریعے اُس نتیجے کا استنباط کرلیا جائے۔ اس طرح پر فطری یا فلسفی قانون عامہ کے مختلف مذاہب پیدا ہوگئے ہیں جو اُس قانون عامہ سے بالکل ممیز ہیں جسے اثباتی یا تاریخی کہتے ہیں۔

میں اس فرق کو اور ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں سلطنت کو فلسفی اور تاریخی دونوں طریق سے سمجھنا اور پہچاننا چاہیے اس دوگونہ عمل سے نہ تمام قانون عامہ مستغنی ہوسکتا ہے نہ خاص۔

عام علم السیاست عالمگیر تاریخ پر مبنی ہے

سلطنت کے خاص نظریئے سے اُس کا عام نظریہ اُسی طرح مقدم ہے جس طرح عام انسانی فطرت کسی قوم کی مخصوص خصلت سے مقدم ہے۔ عام علم السیاست اُن اصولی تصورات سے بحث کرتا ہے جو مخصوص سلطنتوں کے نظریات میں گوناگوں طور پر ظاہر ہوتے ہیں جس تاریخ کا لحاظ عام نظریۂ سلطنت کرتا ہے وہ تمام دنیا کی عالمگیر تاریخ ہے، کسی خاص ملک یا کسی خاص سلطنت کی تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ عالم سے سیاسی فلسفے کے ظنیات کا اندازہ اور تکملہ ہوتا ہے اور تاریخ عالم ہی ترقی کے اُن مختلف مدارج کو ہمارے پیش نظر کردیتی ہے،

بانتب

جنھیں انسان نے اپنے بچپن سے اس وقت تک طے کیا ہے اور ان میں سے ہر درجہ میں سلطنت کے متعلق مختص خیالات اور اُس کی خاص ترکیبی ہیئتیں پائی جاتی ہیں۔ اِس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے عمل مشترک میں مختلف قوموں نے کس طریقے سے حصّہ لیا ہے۔

کون سے زمانے اور کون سی قومیں نمایاں ہیں

تاریخ عالم کے تمام دور اور اُس کی تمام قومیں ہمارے اس علم کے لئے یکساں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہمیں بالتخصیص موجودہ زمانے کی سلطنت سے غرض ہے۔ ازمنۂ قدیمہ اور ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کی جو شکلیں تھیں اُن پر محض اس لحاظ سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ہیولائے ابتدائی کا کام دیتی ہیں اور ان کے ساتھ مقابلہ کرنے سے جدید سلطنت کے اوصاف زیادہ واضح اور عیاں ہو جاتے ہیں۔ جدید سلطنت کی تشکیل میں مختلف قوموں کی اہمیت کا تعین بالعموم اُن کے اُس کام سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے سیاسی تمدّن کو ترقی دینے میں کیا ہے، سیاسی تمدن سے مراد وہ اجتماع انسانی ہے جس میں انسانی باضابطگی اور انسانی آزادی دوش بدوش چل رہے ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں آریائی یا ہند جرمانی نسل سیاسیات کے لئے ویسی ہی نمایاں ہے جیسی سامی نسل مذہب کے لئے۔ لیکن آریائی قوموں کو بھی اُن کے یورپ میں آنے کے بعد ہی دانستہ طور پر سلطنت کی اعلیٰ ترکیبی ہیئت حاصل ہوئی۔ آریائی قوموں میں سے زمانۂ قدیم میں یونانی اور رومی اور ازمنۂ وسطیٰ میں جرمانی گوے سبقت لے گئے ہیں مگر ہماری جدید سیاسی تہذیب بالتخصیص یونانی و رومی اور جرمانی عناصر کے باہمی امتزاج کا ثمر حاصل ہے اور جدید سیاسی ارتقا میں اقوام ذیل نے اور ساری قوموں سے زیادہ حصہ لیا ہے (۱) اول انگریز جن کی نسل بھی انھیں عناصر سے ممزوج ہے (۲) دوسرے فرانسیسی جن میں قدیم کلٹی اور رومانی عناصر کے ساتھ جرمانی عناصر بھی مخلوط ہو گئے ہیں (۳) تیسرے پروشیائی جن میں جرمانی قانون پسندی اور مردانہ تمکنت کے ساتھ سلاوی پاس حکومت اور اطاعت شعاری ممزوج ہیں۔ امریکہ کی سیاسی زندگی یورپ سے ماخوذ ہے لیکن اُس نے شمالی امریکہ (یعنی ممالک متحدہ) ہی میں ترقی حاصل کی ہے۔

پس عام علم السیاست زمانۂ موجودہ کے متمدن بنی نوع انسان کے مشترک سیاسی ادراک و احساس، اُس کے اساسی خیالات اور اُس کے حقیقی مشترک تنظیمات سے بحث کرتا ہے اور اُن مشترک تنظیمات کا اظہار مختلف سلطنتوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ عام قانون عامّہ بھی محض نظریہ نہیں ہے۔ اس کا اثر بھی ایک حقیقی اثر ہے لیکن یہ اثر بالواسطہ ہے

باب ۲ کیونکہ ایک عالمگیر سلطنت موجود نہیں اور اس لیے مختلف مخصوص سلطنتوں کے توسط سے یہ اثر عمل پذیر ہوتا ہے۔ انسان اور اُس کی تاریخ کے مانند، اس قانون عامہ کا وجود بھی حقیقی ہے محض خیالی نہیں۔

تعلیق ارسطو کی Rhetoric (فن بلاغت) میں خاص قانون اور عام قانون کے درمیان جو اختلاف بیان کیا گیا ہے وہ اُس سے مختلف ہے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ اول الذکر سے مراد وہ قانون ہے جسے کسی خاص سلطنت نے خود اپنے لیے بنایا ہو خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری۔ ثانی الذکر وہ ہے جو کسی سیاسی ملت کا لحاظ کیے بغیر از روئے فطرت صحیح ہو۔

پہلا مقالہ

سلطنت کا تصور

پہلا باب

سلطنت کا تصور۔ سلطنت کا تخیل۔ سلطنت کا عام تصور

سلطنت کا تصور، ایسی سلطنتوں کی ماہیت سے جو فی الواقع موجود ہیں اور اُن کی ضروری خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔ برخلاف اس کے سلطنت کا تخیل عالم خیال میں ایک اہم واکمل سلطنت کی جگمگاتی ہوئی تصویر پیش کرتا ہے جو ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی ہے مگر جسکے لئے کوشش کرنا ضروری ہے۔

سلطنت کا تصور تاریخ سے اور اس کا تخیل فلسفے سے پیدا ہوتا ہے۔

سلطنت کا تصور صرف تاریخ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور سلطنت کا تخیل فلسفی تخمین سے پیدا ہوتا ہے۔ سلطنت کے عام تصور کی معرفت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ اُن متعدد سلطنتوں کی جو واقعتہً دنیا کی تاریخ میں نمودار ہو چکی ہیں پڑتال کی جاتی اور اُن کے مشترک خصوصیات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ سلطنت کا اونچے سے اونچا تخیل اُس وقت نظر کے سامنے آتا ہے جب کہ انسانی فطرت کے اُس میلان پر لحاظ کیا جاتا ہے جو اُسے سیاسی نظم کی طرف ہے اور جب کہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ جہاں تک خیال میں آسکتا ہے اس میلان کو ممکن ترقی دینا نوع انسان کی سیاسی غایت ہے۔

تمام سلطنتوں کی مشترک خصوصیات

اگر ہم سلطنتوں کی اُس کثیر تعداد پر نظر کریں جس کو تاریخ نے ہمارے سامنے کر دیا ہے تو چند خصوصیات جو تمام سلطنتوں میں مشترک ہیں فوراً ہی ہم پر عیاں ہو جائیں گی۔ ان کے علاوہ بعض دوسری خصوصیات زیادہ غائر مطالعہ سے ظاہر ہوں گی۔

۱۔ انسانوں کی ایک تعداد۔

(۱) سب سے پہلے یہ بات واضح ہے کہ ہر سلطنت میں آدمیوں کی ایک تعداد مجتمع ہوتی ہے۔ مختلف سلطنتوں میں اس تعداد میں بہت تفاوت ہو سکتا ہے۔ بعض سلطنتیں صرف

باب ۳

چند ہزار اور بعض کئی کروڑ انسانوں پر محتوی ہوتی ہیں مگر سلطنت کا لفظ ہم اُس وقت تک نہیں استعمال کر سکتے جبتک کہ کسی سلطنت کے باشندے ایک اکیلے خاندان کے حلقے سے باہر نہ ہو جائیں اور جبتک کہ ایک بڑی تعداد آدمیوں (یعنی خاندانوں کی جن میں مرد - عورت - بچے شامل ہوں) باہم متحد نہ ہو جائے - حضرت یعقوبؑ کے کنبے کی طرح کوئی خاندان یا قبیلہ ایک ایسا مرکز ہو سکتا ہے جس کے گرد امتداد زمانہ سے ایک بڑی تعداد جمع ہو جائے مگر جب تک یہ اضافہ وقوع میں نہ آئے یا جب تک ایک کنبہ مختلف کنبوں میں تقسیم ہو کر اور قرابتداری کی حد سے گزر کر ایک نسل نہ بن جائے اس وقت تک حقیقی معنوں میں سلطنت نہیں قائم ہو سکتی - محض ایک غول کو ایک قبیلہ نہیں کہہ سکتے اور بغیر ایک قبیلہ یا تمدن کے اعلیٰ مدارج میں بغیر ایک قوم کے سلطنت نہیں ہو سکتی -

سلطنت کے لئے آبادی کی کوئی خاص تعداد معین نہیں ہے[1] روسو نے جو دس ہزار آدمیوں کی تعداد تجویز کی ہے وہ یقیناً ناکافی ہے ازمنہ وسطےٰ میں ایسی چھوٹی سلطنتیں حفاظت اور عزت کے ساتھ قائم رہ سکتی تھیں مگر جدید زمانے کا میلان بہت بڑی سلطنتوں کے قیام کی طرف ہے جس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جدید سلطنت کے سیاسی فرائض کے لئے بڑی قومی قوت کی ضرورت ہے اور کچھ یہ کہ بڑی بڑی سلطنتوں کی بڑھتی ہوئی طاقتیں چھوٹی سلطنتوں کی خودمختاری اور آزادی کے لئے خطرہ و تہدید کا سبب ہو جاتی ہیں -

ایک معین مملکت

(۲) دوسرے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سلطنت کی بقا کے لئے کسی خاص زمین کے ساتھ قوم کا مستقل تعلق لابدی ہے سلطنت کو ایک رقبۂ سلطنت کی ضرورت ہے اور قوم اور ملک لازم و ملزوم ہیں -

خانہ بدوش قوموں میں اگرچہ حکمرانی کے لئے سردار اور انتظام کے لئے قانون موجود ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ سلطنت کی پوری منزلت پر نہیں پہنچ سکتیں - اُن کی سلطنت کی صورت اُسی وقت بندھتی ہے جب وہ ایک مقررہ جگہ پر بس جاتی ہیں - بنی اسرائیل نے سیاسی تربیت

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق ارسطو کی رائے کے لئے "سیاسیات" (فصل ہفتم جزو ۴) دیکھنا چاہئے وہ کہتا ہے کہ سلطنت نہ تو دس آدمیوں کی ہو سکتی اور نہ لاکھ آدمیوں کی ہو سکتی "سیاسیات" کی فصل سوم جزو ۳ فقرہ ۵ بھی دیکھنا چاہئے - انگریزی مترجم -

باب ۱

حضرت موسیٰؑ سے حاصل کرلی تھی مگر وہ سلطنت کی حیثیت میں اس وقت تک نہ آسکے جب تک کہ یوشعؑ نے ان کو فلسطین میں متمکن نہیں کردیا۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد نقل وطن کا جو سیلاب عظیم رواں ہوا اور قوموں نے اپنے قدیم مسکنوں کو چھوڑ کر نئی جائے بود و باش کے فتح کرنے کا تہیہ کیا تو وہ استحالہ کی ایک غیر معین حالت میں تھیں۔ ان کی قائم کردہ سابق سلطنتیں باقی نہیں رہی تھیں اور نئی ابتک وجود میں نہیں آئی تھیں شخصی تعلق ایک زمانے تک قائم رہا مگر ملک کے ساتھ جو تعلق تھا وہ ٹوٹ گیا تھا صرف اسی حالت میں وہ کوئی نئی سلطنت قائم کرسکے جب وہ مستقل طور پر کہیں قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ جو قومیں اس مرحلے میں ناکامیاب رہیں وہ تباہ ہوگئیں۔ اتھنز والوں نے تھمیس ٹوکلیس کی سرکردگی میں سلطنت اتھنز کو اپنے جہازوں پر بچا لیا کیونکہ فتح کے بعد انھوں نے پھر اپنے شہر پر قبضہ کرلیا مگر سمبری اور ٹیوٹونی تباہ ہوگئے کیونکہ انھوں نے اپنے قدیم وطن کو چھوڑ دیا تھا اور کسی جدید مقام کو اپنا وطن بنانے میں ناکام رہے۔ اگر اہل روما اپنے شہر کے جل جانے کے بعد ویائی کو چلے گئے ہوتے تو خود سلطنت روما کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔

۳۔ اتفاق

۳۔ سلطنت کی ایک اور خصوصیت ہے کل افراد کا اتحاد یعنی قوم کے ہر فرد کا اپنے تئیں ایک ہی کل کا جزو سمجھنا۔ اندرونی طور پر مختلف تقسیمیں ضرور ہو سکتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر کافی آزادی رکھتی ہوں جیسے روما میں ایک گروہ پٹریشیوں (یعنی اشراف) کا تھا اور دوسرا پلیبیون (یعنی عامیوں) کا۔ اسی طرح متوسط زمانے کے ابتدائی دور میں جرمانی سلطنتوں میں جاگیری نظام کے پہلو بہ پہلو ایک قومی نظام بھی موجود تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت ایسے مختلف حصص پر منتقل ہو جو بجائے خود سلطنت ہوں جیسے قدیم جرمانی شہنشاہی سے بتدریج بہت سی مقامی سلطنتیں پیدا ہوگئیں یا جیسے شمالی امریکہ یا سوئیٹزرلینڈ کی متحد سلطنتوں اور نئی جرمانی شہنشاہی میں ایک مشترک مجموعی سلطنت کے ساتھ ساتھ متعدد مقامی سلطنتیں بھی قائم ہیں۔ مگر جب تک کہ قوم اپنی اندرونی عضوی ترتیب میں ایک مربوط مجموعہ نہ بن جائے یا اپنے بیرونی تعلقات میں سارے قومی اتحاد کی وحدت حیثیت کا اظہار و عمل نہ کرسکے اس وقت تک سلطنت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ حاکم و محکوم کا فرق

۴۔ تمام سلطنتوں میں ہم حاکم اور محکوم یا باصطلاح قدیم پادشاہ اور رعیت کے درمیان امتیاز پاتے ہیں۔ پادشاہ اور رعیت کے فقرے کے مفہوم میں بسا اوقات غلط فہمی ہوئی اور اکثر وہ غلط استعمال کیا گیا ہے مگر بجائے خود یہ فقرہ نہ قابل نفرت ہے نہ اس سے غلامانہ انقیاد کا اظہار ہوتا ہے۔ بہر صورت یہ فرق نہایت ہی متنوع شکلوں میں

باب ۳

ظاہر ہوتا ہے مگر بہر حال یں ایک ضروری امتیاز ہے یہاں تک کہ بہت ہی انتہا کو پہنچی ہوئی جمہوریت جس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتیاز نا پدید ہو گیا ہے وہاں بھی حقیقت میں موجود ہوتا ہے شہر ایتھنز کے باشندوں کی مجلس آئی فرمانروا تھی اور اہل ایتھنز فرداً فرداً رعایا تھے۔

جہاں کوئی حکمران صاحب اختیار نہ رہے جہاں محکوموں نے سیاسی اطاعت سے انکار کردیا ہو اور ہر شخص وہی کرنے لگے جو اُس کا جی چاہے، اور جہاں لاحکمیت کا دور دورہ ہو وہاں پھر سلطنت کا خاتمہ ہے۔ لاحکمیت (یا طوایف الملوکی) خلل اور منفیات کے اتنی کم مدت تک قائم رہ سکتی ہے کہ ہر ایک زندہ قوم یں گویا فوراً ہی اُس لاحکمیت سے پھر ایک قسم کی نئی حکومت پیدا ہو جاتی ہے گو کہ وہ نہایت سخت گیر بلکہ اکثر سنگدل اور ظالمانہ ہوتی ہے یہ نئی حکومت بزور لوگوں کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کردیتی اور اس طرح اُس لابدی امتیاز کو دوبارہ قائم کردیتی ہے۔ اشتمالی اصولاً اس امتیاز سے انکار کرتے ہیں مگر ان کے اس انکار سے خود نفس سلطنت کا انکار لازم آتا ہے۔ سلطنت کو توڑ پھوڑ کے محض معاشرتی اتحاد پیدا کرتے یں یہ لوگ کبھی کسی قوم میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور اگر کبھی عارضی طور پر عوام کو اپنی تجاویز کا طرفدار بنالیں اور انھیں کامیابی ہو بھی جائے تو سولھویں صدی کی مذہبی اشتمالیوں یعنی باز اصطباغیوں[1] کی مثال کے مطابق اور واقعات کے اندرونی نتائج کی بنا پر ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ بھی بعد میں ایک تسلط قائم کردیں گے اور یہ تسلط سخت ترین قسم کا ہوگا۔

سلاوی قوموں یں ہم یہ قدیم خیال پاتے ہیں کہ قوم کے تمام افراد کا اتفاق رائے ہی

---

[1] سنہ ۱۵۲۱ء میں جرمانیا میں ایک نئے فرقے کی ابتدا ہوئی جس کے ماننے والوں کو اُن کے مخالفوں نے "باز اصطباغیوں" (Anabap tist) کا لقب اس لئے دیا کہ اُن کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ بچوں کو بپتسما (اصطباغ) دینا ایک باطل چیز ہے پس عام رواج کے مطابق جن لوگوں کو سولہ سترہ برس کی عمر میں بپتسما دیا جا چکا ہے اُن کے بپتسمے کی تجدید لازم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر سچی مذہبی اصلاح سے لازماً معاشرت کی بھی اصلاح ہوتی ہے اسی عقیدے پر سولھویں صدی میں اشتمالیت کی بنیاد پڑی پس یہ فرقہ خالص مذہبی نہیں بلکہ سیاسی مقاصد بھی رکھتا تھا۔ اس نے جرمانیا سوئس (Sw!(zer-land) اور ولنڈ (Holliand) میں ایک حد تک شیوع پایا لیکن مذہبی اور سیاسی شورش برپا کر کے اپنے ماننے والوں کی تباہی کا باعث ہوا۔ ع۔ ص۔

مرضی عامہ کا نمائندہ ہو سکتا ہے اور کثرت رائے کو یا اعلیٰ ذی اقتدار افراد کو فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ اصول زیادہ سے زیادہ مقامی جماعات کے لئے کام دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی قوم میں جہاں لوگ آسانی اور سرعت کے ساتھ باہم اتفاق کر لیتے ہوں لیکن اسے سیاسی اصول کا درجہ کبھی ہی حاصل ہو سکتا کیونکہ سلطنت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد کی ناگزیر مخالفت کو مغلوب کر دے۔

۵ ذیحیاتی فطرت۔

سلطنت کسی نہج سے ایک بے جان آلہ یا ایک مردہ کل نہیں ہے وہ ایک زندہ اور اس لئے ایک عضوی وجود ہے۔ سلطنت کی اس عضوی فطرت کو لوگوں نے ہمیشہ نہیں سمجھا۔ سیاسی اقوام نے ضرور اس کا ایک نقش اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے اور الفاظ میں بھی اسے بطیب خاطر تسلیم کیا ہے مگر علم السیاست سے سیاسی عضویے کی حقیقی معرفت ایک مدت تک پوشیدہ رہی اور آج بھی بہت سے علمائے سیاست اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تاریخی مصنفین میں اس کا سہرا جرمانیا کے تاریخی قانون دانوں کے سر رہا کہ انھوں نے قوم کی اور سلطنت کی عضوی فطرت کو پہچانا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سلطنت پر ریاضی اور علم آلات کے طریق تحقیق سے نظر ڈالنا جس میں صرف گنتیوں سے کام لیا جاتا ہے نیز ایسے لاتعدد و لاتحصی جزئیات سے بحث کرنا جنھوں نے جزو کے ہجوم میں کل کو بھلا دیا تھا، غلط اور لاحاصل مانا گیا جس طرح ایک روغنی تصویر صرف روغن و رنگ کے قطرات کا مجموعہ نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے اور ایک مجسمہ صرف سنگ مرمر کے ذرات کے اتصال کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ اور بھی درکار ہے۔ اور انسان محض خلل و جراثیم اور خون کی ایک مقدار کا نام نہیں ہے اسی طرح محض شہریوں کا اجتماع، قوم نہیں ہے اور نہ سلطنت محض ظاہری نظامات و ضوابط کا مجموعہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ سلطنت فطرت کی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے اور اس لئے وہ ایک فطری عضویہ بھی نہیں بلکہ بالواسطہ انسانوں کا کام ہے البتہ سلطنت بنانے کا میلان انسان کی فطرت میں پایا جاتا ہے اور اس حد تک سلطنت کی بنا فطرت پر ہے مگر اس میلان کو عملی صورت دینا فطرت نے انسانی محنت اور انسانی انتظام و اہتمام پر چھوڑ دیا ہے اور اس حد تک سلطنت انسانی قوت عمل کی پیداوار اور اس کی عضوی صورت ایک فطری عضویے کی نقل ہے۔

سلطنت کس معنی میں ذیحیات ہے۔

جب ہم سلطنت کو عضوی (یا ذی حیات) کہتے ہیں تو ہم فطرت کی مخلوقات کے ان

اعمال و افعال کا خیال اپنے دل میں نہیں لاتے جن کے ذریعے سے وہ مخلوقات اپنی غذا کو تلاش کرتے، اُسے ہضم کرتے اور جزو بدن بناتے ہیں اور اپنی نوع کا توالد و تناسل کرتے ہیں، بلکہ ہمارے دل میں عضوی (یا ذی حیات) ہستیوں کے خصوصیات ذیل کا خیال آتا ہے:۔

(الف) ہر عضویہ ذی حیات، جسم اور روح یعنی مادی عناصر اور روحی قوتوں کے اتحاد سے بنا ہے۔

(ب) اگرچہ ہر عضویہ ایک پوری چیز ہے اور پوری ہی چیز رہتا ہے پھر بھی اگر اُس کے اجزا پر نظر کرو تو وہ ایسے اعضا رکھتا ہے جو خاص اغراض کے لئے بنے ہیں اور خاص قابلیتوں سے بھرے ہوئے ہیں تاکہ وہ متعدد طریقوں سے خود مجموعے کی مختلف ضروریات کو پورا کریں۔

(ج) ہر عضویے کا نمو اندرونی جانب سے بیرونی جانب کو ہوتا ہے اور اُس میں خارجی نشو و نما ہوتی ہے۔

ان تینوں اعتبارات سے سلطنت کی عضوی نوعیت عیاں ہے:۔

(الف) سلطنت کے اندر روح اور جسم، ارادہ اور کارکن اعضا لازماً مربوط ہو کر ایک زندگی پیدا کرتے ہیں۔ قوم کی واحد روح جو اپنے وقت کے فرداً فرداً تمام باشندوں کی روح کے اوسط مجموعے سے ایک مختلف شے ہے سلطنت کی بھی روح ہے۔ قوم کا واحد ارادہ، جو تمام قوم کے اوسط ارادے سے مختلف ہے، سلطنت کا بھی ارادہ ہے۔ نظام سلطنت اور اس کے ساتھ اُس کے وہ اعضا، جو محل کی قائم مقامی کرتے اور قوانین کی شکل میں سلطنت کی مرضی کا اظہار کرتے ہیں، اس کا وہ سر گروہ جو حکمرانی کرتا ہے، انتظامی اغراض کے لیے اس کے ہر طرح کے محکمے اور قہر عام انصاف کو عمل میں لانے کے لئے عدالتیں، قوم کے مادی اور ذہنی اغراض کے مہیا کرنے کے لئے ہر قسم کی تنظیمات، عام قوت کے اظہار کے لئے فوج، یہی وہ نظام ہے جو سلطنت کا جسم ہے اور یہی وہ شکل ہے جس میں قوم کی مشترک زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انفرادی سلطنتیں مثل انفرادی اشخاص کے اپنی روح اپنے خصائل اور اپنی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی ترقی کا حقیقی انحصار قوموں اور سلطنتوں کی مسابقت پر ہے جن سے نوع انسانی مرکب ہے۔

(ب) نظام سلطنت میں سیاسی جسم کے اعضا کی ترکیب و ترتیب بھی رونما ہوتی ہے۔ ہر عہدہ اور ہر سیاسی مجلس اُسی جسم کا ایک مختص عضو ہے جو ایک خاص کام کے لیے

(الف) سلطنت میں روح اور جسم ہے

[سلطنت میں اعضا ہیں جن کے خاص وظائف ہیں]

مخصوص ہے عہدہ کسی کل کے ایک ٹکڑے کے مثل نہیں ہے اُسے خالص اوزاری کام کرنے نہیں ہوتے جو ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے ہیں جس طرح کسی کل کے پہیے اور پھرکیاں ہمیشہ ایک ہی کام کو ایک ہی طریقے سے انجام دیتی رہتی ہیں عہدے کے کار شخصی ذہنی (یا روحانی) نوعیت رکھتے ہیں اور عام زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے جن کو پورا کرنا اُن کا فرض ہے خاص مواقع پر ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ زندوں کی خدمت کرتے اور خود بھی زندگی رکھتے ہیں پس جب کوئی عہدہ اپنے جوہر حیات کو کھو کر لا یعقل ظاہریت کی پستی میں جا پڑتا اور ایک کل کے مانند بن جاتا ہے جو بغیر کسی امتیاز کے اور خاص حالات پر یا مرور زمانہ سے بدلی ہوئی کیفیات پر لحاظ کئے بغیر اپنی معین عادت کے مطابق اور اُسی اوزاری روش سے برابر اپنا کام کئے چلی جاتی ہے تو اس حد کو پہنچکر خود وہ عہدہ ہی تباہ ہو جاتا ہے اور مشین بن جانے کی وجہ سے خود سلطنت پر انجام کار زوال آجاتا ہے۔

عہدے کی روح

نہ صرف وہ شخص جو کسی عہدے پر ہے بلکہ خود عہدے میں بھی ایک طرح کی نفسی اہمیت اور ایک ذی حیات روحی اصول ہوتا ہے گویا کوئی روح اسے زندہ رکھتی ہے۔ عہدے کی ایک خصوصیت اور اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اپنی باری میں اُس شخص پر اثر ڈالتی ہے جو اس عہدے پر کام کرتا ہے۔ رومیوں میں جب ایک معمولی شخص بھی کونسل کے بلند اور با اقتدار عہدے پر ممتاز ہو جاتا تھا تو اپنے عہدے کی عظمت اور اقتدار و قوت کی وجہ سے اُس شخص کا اخلاق بلند ہو جاتا تھا اور اس کی طبعی طاقت بڑھ جاتی تھی۔ میر عدل (یعنی جج) کا عہدہ ایسا محترم ہے اور انصاف گستری نے اُسے ایسا مقدس بنا دیا ہے کہ ایک نہایت کمزور شخص بھی جب اس عہدے پر مقرر ہو جاتا ہے تو حق کے قائم رکھنے کے لئے اس کا دل شریفانہ خیالات سے لبریز اور اس کا استقلال بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عہدے کی روح عہدہ دار کی طبیعت کو نہیں بدل سکتی، وہ اس قدر قوی نہیں ہوتی کہ انسان کی خصلت پر اس طرح چھا جائے کہ ہمیشہ ہر شخص کو جس کا تقرر کیا جائے عہدے کا پورا اہل بنا دے تاہم عہدہ دار اپنی طبیعت اور مذاق پر ایک غیر مرئی اثر محسوس کرتا ہے اور اگر اُس کا دل اثر پذیر ہے تو ممکن نہیں کہ وہ یہ اثر محسوس نہ کرے کہ خود اُس کے عہدے میں ایک روح ہے جسے فی الحال اُس کی شخصیت سے گہرا اور قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے مگر جو اس کی ذات سے مختلف اور زیادہ دیرپا ہے۔

(ج) سلطنت میں نمو اور بالیدگی ہوتی ہے۔

ج ۔ قومیں اور سلطنتیں نمو کرتی ہیں اور انکی بالیدگی خاص قسم کی ہوتی ہے۔ قومی اور سیاسی تاریخ کے دوروں کا شمار ان طویل المدت قرنوں سے ہوتا ہے جو منفرد اشخاص کی عمروں سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، آخر الذکر کو برس اور برس کی دہائیوں سے ظاہر کرسکتے ہیں اول الذکر صدیوں سے متجاوز ہوتا ہے۔ پھر ہر دور اپنے مخصوص شمائل رکھتا ہے اور قوم وسلطنت کی جامع تاریخ میں وہ سب یکجا دکھائی دیتے ہیں۔ قوموں کا بچپن، ان کے زمانۂ بلوغ سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے اور ہر مدبر مجبور ہے کہ سلطنت، زندگی کے جن زمانی مدارج پر ہو اُن کا لحاظ رکھے۔ اس امر میں بھی وہی مقولۂ حکمت صادق آتا ہے کہ "ہر چیز کے لئے ایک وقت ہے"۔

پھر بھی سلطنت محض فطری نشو ونما پائی ہوئی چیز نہیں ہے۔

سلطنت کو جہاں عضوی موجوداتِ فطری کے ساتھ نشو ونما میں مشابہت ہے وہاں اُن دونوں میں ایک اہم فرق بھی ہے وہ یہ کہ نباتات، حیوانات اور انسان کی زندگی تعبا قاعدگی کے ساتھ نمو اور انحطاط کے مختلف دوروں اور درجوں کو طے کرتی ہے مگر سلطنتوں اور سیاسی تنظیموں کا نمو ہمیشہ ایسا معین ومشخص نہیں ہوتا۔ انسانی آزادی یا بیرونی سوانح کے اثروں سے نمو کی یہ رفتار اکثر دوسری راہیں اختیار کرلیتی ہے اور کبھی یکایک معمولی طبعی مدارج میں خلل پڑ جاتا ہے یا اُس کی صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ صورت جیسے جلیل القدر وقوی افراد یا خود قوم کے زبردست جذبات کی طرف سے پیش آتی ہے ویسا ہی اُس کا اثر بھی پڑتا ہے لیکن یہ کجراہیاں نہ تو تعداد میں اتنی زیادہ اور نہ عموماً ایسی اہم ہیں کہ عام قاعدے کو کمزور کردیں بلکہ اُن کا وقوع بہت نادر ہے اور عام طور پر وہ اس سے بہت ہلکی ہوتی ہیں جتنا وہ لوگ گمان کرتے ہیں جن کی رائیں ہمعصر واقعات کے فوری اثرات سے قائم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی وزن ہوتا ہے کہ سلطنت کے محض ایک فطری عضویہ ہونے کا خیال یک طرفہ اور ناقابل اطمینان ہے اور یہ کہ اس معاملے میں بھی ہمیں افراد کے آزادانہ عمل کی پوری وسعت کار کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

(۶) سلطنت ایک اخلاقی و روحانی عضویہ ہے۔

۶ ۔ تاریخ ہم پر جہاں سلطنت کی عضوی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے وہاں وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سلطنت، نباتات وحیوانات کے جیسے ادنیٰ ذی حیاتوں کی ہم سطح نہیں ہے بلکہ اُن سے ایک بلند تر درجے کی چیز ہے۔ تاریخ ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایک اخلاقی وروحانی عضویہ ہے، وہ ایک عظیم جسم ہے جو قوم کے حسیات وخیالات کو اپنے اندر جمع کرسکتا ان کو قوانین کی صورت میں ظاہر کرسکتا اور عملاً ان سے کام لے سکتا ہے۔ تاریخ ہی کے ذریعے سے ہمیں ہر سلطنت کے

اخلاقی صفات اور اُس کی حقیقت سے اطلاع حاصل ہوتی ہے اور تاریخ ہی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سلطنت ایک ایسی شخصیت ہے جس میں روح اور جسم ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنا ایک ارادہ رکھتی اور اسے ظاہر کرتی ہے۔

سلطنت کی عزت و شوکت کے خیال نے ہمیشہ اس کے فرزندوں کے دلوں کو بلند کیا اور انھیں ایثار اور جاں بازی کے لیے جوش دلایا ہے سلطنت کی آزادی و خود مختاری اور اس کے حقوق کے لئے ہر زمانے اور ہر قوم میں شریف ترین اور بہترین افراد نے اپنا مال اور اپنی جان قربان کردی ہے اس امر پر ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ سلطنت کے وقار اور قوت کو بڑھانا اور اُس کی خوشحالی اور اقبال مندی کو ترقی دینا نوی جوہر اشخاص کے معزز ترین فرائض میں داخل ہے۔ سلطنت کی خوشی اور رنج میں تمام اہل ملک ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اگر سلطنت میں یہ اعلیٰ اخلاق اور شخصی صفت نہ ہو تو وطن کا اعلیٰ خیال اور وطن کی محبت سب کالعدم ہو جائے گی۔

سلطنت کی ایک شخصیت ہے

سلطنت کی شخصیت کا تسلیم کرنا قانون عامہ کے لئے بھی ویسا ہی لابد و لازمی ہے جیسا بین الاقوامی قانون کے لئے ہے۔

قانون کی اصطلاح میں شخص اُسے کہتے ہیں جس کی طرف کوئی قانونی ارادہ منسوب کیا جاسکے اور جو حقوق کو حاصل کرسکے، پیدا کرسکے اور ان پر قابض رہ سکے۔ قانون عامہ میں یہ تصور ویسا ہی معنی خیز ہے جیسا قانون شخصی میں۔ قانونِ عامہ کے مفہوم میں سلطنت بہمہ وجوہ ایک شخصیت ہے سلطنت کا سارا دستور اس طرح ترکیب پاتا ہے کہ سلطنت کی شخصیت اپنے ارادے میں جو ہم آہنگی پیدا کرکے اس پر عمل پیرا ہوسکے تمام افراد کے انفرادی ارادے سے مختلف ارادوں کے مجموعے سے بھی مختلف ہے۔

البتہ سلطنت کی شخصیت کو صرف آزاد قوموں نے تسلیم کیا ہے اور صرف متمدن قومی سلطنتوں میں اُس نے پوری قوت حاصل کی ہے۔ سیاسیات کے زیادہ قدیمی مدارج میں صرف حکمراں کی ہستی نمایاں ہوتی ہے۔ شخص صرف وہی ہے اور سلطنت اُسی کی ذاتی حکومت کا میدان ہے۔ موجودہ زمانے کی سلطنت کی مردانہ خصوصیت کا بھی یہی حال ہے کہ یہ خصوصیت سب سے اول کلیسا کی زنانہ خصوصیت کے مقابلے میں نمایاں ہوئی۔ ایک مذہبی جماعت میں سیاسی جماعت کے تمام صفات ہوسکتے ہیں مگر سلطنت ہونے کی خواہش اس میں نہیں ہوسکتی

سلطنت مذکر ہے

اور وہ سلطنت ہے بھی نہیں محض اس وجہ سے کہ وہ مثل ایک انسان کے اپنے اوپر بالارادہ حکومت نہیں کرتی اور نہ اپنی بیرونی زندگی میں آزادانہ عمل کرتی ہے بلکہ وہ صرف خدا کی عبادت کرنا اور اپنے مذہبی فرائض کو بجا لانا چاہتی ہے اس تاریخی غور اور مشاہدے کے نتیجے کو یکجا کیجئے تو سلطنت کا عام تصور اس طرح پر معین کیا جاسکتا ہے کہ سلطنت انسانوں کے اُس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک معیّن رقبے میں حکومت اور محکوم کی شکل میں ہو اور وہ لوگ جو ایک اخلاقی اور عضوی مردانہ شخصیت میں باہم متفق ہوگئے ہیں یا زیادہ مختصر یوں کہئے کہ کسی خاص ملک کی سیاسی طور پر تنظیم پائی ہوئی قومی شخصیت کو سلطنت کہتے ہیں۔

سلطنت کے مختلف نام۔

فائدہ (۱) اس امر پر نظر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مختلف قوموں نے سلطنت کے نام کس طرح رکھے ہیں یونانی ہمیشہ شہر اور سلطنت کو ایک ہی لفظ پولیس (πόλις) سے ظاہر کرتے تھے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اُن کا تصور سلطنت شہر پر مبنی اور شہر ہی کے نقطہ نظر کے باعث محدود بھی تھا۔ اسی طرح رومیوں کا لفظ کیوٹاس (Civitas) اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک شہر کے حقوق شہریت ہی سلطنت کا مغز ہیں، مگر بہ نسبت یونانی لفظ کے اس میں وصفِ شخصی زیادہ ہے اس لئے یہ لفظ قوم کی زیادہ وسیع جماعتوں پر حاوی ہونے کے لئے یونانی لفظ سے زیادہ موزوں ہے۔ اس امر سے سلطنت کے علاوہ حریت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ لفظ تمدن Civilization سلطنت کے نام سے ماخوذ ہے اور عملاً سلطنت کی وسعت و انتفاع کے مرادف ہے ایک خاص لحاظ سے دوسرا رومی نام ریس پبلکا (Res publica) اور بھی زیادہ بلند ہے کیونکہ اُس سے نہ صرف شہریت کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ وہ ریس پوپلی Res populi ایک قوم اور اس قوم کے فوائد پر نظر رکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے قدماء کے مفہوم میں لفظ جمہوریہ (ریپبلک) سے شاہی خارج نہیں ہے البتہ خودمختارانہ حکومتوں پر یہ لفظ عائد نہیں ہوتا (اس کے مقابلے میں انگریزی کے لفظ دولت عامہ Common wealth پر غور کرنا چاہئے۔

جدید زبانوں میں سے نہ صرف رومانی[1] ہی زبانوں میں بلکہ جرمانی زبانوں میں بھی اسٹیٹ (State) کا لفظ (Stato, etat, Stat) عام طور پر شائع ہے

[1] واضح ہو کہ "رومانی" (Romance) (یعنی جدید لاطینی) قوموں کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ پس (Roman) کے لئے "رومی" ہی کو قائم رکھنا درست ہوگا۔ ع ۔ ص

بجائے خود بالکل غیر معین ہونے کے باوجود امتداد زمانہ سے یہ اصطلاح بہت ہی عالمگیر ہوگئی
اس میں اب نہ تو کسی قسم کا ابہام ہے اور نہ وہ کسی طرح کی تعریف کی محتاج ہے (گو کہ ابتداءً
اس لفظ سے محض "حالت" کا اظہار ہوتا تھا اور سلطنت کا پورا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے
"حالت امور عامہ" (Status Reipublicae) کے مرکب کلمے کی ضرورت ہوتی تھی اگرچہ اسٹیٹ
(سلطنت) کے لفظ کا نہایت نمایاں مفہوم ایک وہ چیز ہے جو "قائم" یا "مستقل" ہے لیکن
لفظ و معنی کا یہ واسطہ بھی اب پس پشت پڑ گیا ہے اور اس لفظ (سلطنت State) سے نہ صرف
موجود الوقت انتظام و نظام حکومت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ خود وہ "سلطنت" مراد ہوتی
ہے جو حکومت کی شکل کی کامل تبدیلی کے بعد بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اس مفہوم کے اظہار
کے لئے زمانۂ جدید میں جو دوسرے الفاظ اختیار کئے گئے ہیں ان سب کا اطلاق محدود ہے
مثلاً ایک پُر فخر لفظ رائش (Reich) کا ہے کہ اس کا اطلاق صرف ان بڑی بڑی سلطنتوں پر
ہوتا ہے جو شاہی تنظیم کے تحت میں ہوں اور اسی طرح اس سے ایسے متعدد ممالک کے اجتماع
باہمی کا خیال بھی ذہن میں آتا ہے جو ایک دوسرے سے آزاد ہوں، یہی کیفیت لاطینی لفظ
امپیریم (Imperium) (فرانسیسی انگریزی ایمپائر Empire) شہنشاہی کی ہے جس میں ساتھ ساتھ
قیصری حکمرانی کا اشارہ بھی موجود ہے۔ اس سے زیادہ محدود مفہوم لفظ ملک (Land ارض)
کا ہے جس سے ابتداءً سلطنت کے خارجی رقبے کا (اور ایسی سلطنت کا جو متفرق اجزا میں
منقسم نہ ہو) اظہار ہوتا ہے۔ مگر ثانیاً اس کا اطلاق خود اس سلطنت پر بھی ہوتا ہے جو اس
رقبے پر قابض ہوتی ہے۔ یہ لفظ یونانی لفظ پولس (πόλις) کی ایک طبعی ضد
ہے کیونکہ اس میں سلطنت کی اولین بنا ملک (Landschaft) پر رکھی گئی ہے اور
یونانی لفظ نے اس کی بنا شہر پر رکھی ہے۔ وطن (Fatherhand) کا دلاویز لفظ
اور بھی محدود ہے کیونکہ اس کا تعلق افراد سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں اس وجہ سے
بلندی اور روحانیت ہے کہ اس کا اشارہ ملک کے ساتھ شخصی تعلق اور رشتہ خون کے
سلسلے کی طرف ہے۔ اس لفظ میں صفائی اور جوش کے ساتھ اس تمام حب و شغف کا اظہار
ہوا ہے جو اس جلیل القدر و ذی حیات جماعت سے ہوتا ہے جس سے اسے تعلق ہے
جس کی ہستی کے ساتھ خود اس کی ہستی وابستہ ہے اور جس کے لئے اپنے کو نثار کر دینا انسان
کے شرف و علو کی برترین مثال ہے۔

(۲) میں نے اپنی تصنیف Psychological Studies on State and Church
میں سلطنت کی مردانہ خصوصیت پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرانسیسی کے اس فقرے سے
(L'etat c'est l'homme سلطنت انسان ہے) صرف یہی مراد نہیں ہے کہ "سلطنت ایک
عام انسان ہے" بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کلیسا عام زنانہ صفت یعنی بیوی کی حیثیت رکھتا
ہے اُسی طرح "سلطنت مرد یا میاں" کے مفہوم کو پورا کرتی ہے۔ (یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ
جرمانی زبان میں لفظ سلطنت (Stat) مذکر ہے اور لفظ کلیسا (Kirche) مونث ہے۔)

باب دوسرا

سلطنت کا انسانی تخیل ـــــ عالمگیر شاہنشاہی

سوال یہ ہے کہ کیا سلطنت کا ایک ایسا تصور جو مختلف قائم شدہ سلطنتوں پر غور کرنے سے حاصل ہوا ہو انسانی تخیل کے لئے کافی ہو سکتا ہے؟ تاریخی طریق صرف اس بات کے مان لینے پر قانع ہے کہ سلطنت، قوم کا کالبد ہے اور سلطنت کی بنا قوم کی فطرت اور اُس کی ضروریات پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت اُسی قوم تک محدود ہے۔

عام فطرت انسانی ایک عالمگیر سلطنت کی ضرورت کی متقاضی ہے۔

لیکن فلسفے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اور زیادہ تعمق نظر سے کام لیں۔ انسانی فطرت میں ہمیں بقائے سیاسی کا میلان اور اُس کی احتیاج محسوس ہوتی ہے۔ ارسطو مدتوں قبل اس معنی خیز صداقت کا اظہار کر چکا ہے کہ "انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے"، یہ کوئی قومی خصوصیت نہیں ہے جو انسان کو حصول سلطنت پر آمادہ کرتی اور اس کے قابل بناتی ہے بلکہ یہ ایک عام انسانی فطرت ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سلطنتوں کے عضویے کی پرتال سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و متباین قوموں میں ایک ہی سے اہم اعضا ایک ہی طرح پر پائے جاتے ہیں، ہر جگہ ایک ہی سی عام طبیعت انسانی کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں مختلف قومی شکلیں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ بہ ادنیٰ تغیر ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ خود قوم ہی کا تصور قطعی اور مسلّم نہیں ہے۔ اس سے بجائے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسے بلند تر انسانی اتحاد کی ضرورت ہے جس میں اقوام محض اعضاء و ارکان کی حیثیت رکھتی ہوں پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ بلا لحاظ اس اعلیٰ اتحاد کے سلطنت کی بنا قوم پر قائم کی جائے اور اگر یہ سچ ہے کہ انسان ایک جنس واحد ہے اور ایک عام روح اس میں دائر و سائر ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے اس جوہر حقیقی کو ایک مجسم شکل میں لانے کی کوشش سے باز رہے یعنی ایک سلطنت نہ بن جائے۔

اس لحاظ سے نری قومی سلطنتوں کی واقعیت اور اہمیت صرف ایک نسبتی چیز

رہ جاتی ہے۔ ایسی سلطنتوں میں ایک فلسفی کو سلطنت کے اعلیٰ ترین تخیل کار دبکار آنا محسوس نہیں ہوتا۔ اُس کے نزدیک سلطنت ایک انسانی عضویہ بلکہ ایک انسانی شخص ہے اور جب ایسا ہے تو جو انسانی روح اُس میں موجود ہے اُسے ایک انسانی جسم بھی ملنا چاہیئے کیونکہ روح اور جسم ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور باہم ملکر شخص بنتے ہیں درحقیقت ایک ایسے جسم میں جس کی عضویت انسانی نہ ہو، روح انسانی صحیح معنوں میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے سلطنت کے جسم کی تعمیر انسان کے جسم کے نمونے پر ہونا لازمی ہے پس مکمل سلطنت انسانیت کے جسم مرئی کے مماثل ہے عالمگیر سلطنت یا عالمگیر شاہنشاہی انسانی ترقی کا منتہائے خیال ہے۔

ایک اکیلا انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور نوع انسانی اپنی مجموعی حیثیت میں تخلیق عالم کی دو ایسی ضدیں ہیں جو ابتدا سے چلی آئی ہیں اور یوں ہی قائم رہنے والی ہیں۔ شخصی قانون اور عام قانون کا فرق بالآخر انھیں دونوں پر مبنی ہے یہ سچ ہے کہ نوع انسان میں یکجہتی کا احساس ابھی محض ایک خواب پریشاں ہے نہ وہ ابھی پوری طرح بیدار ہوا ہے اور نہ ابھی اس نے اتحاد آزادی کی صورت اختیار کی ہے۔ اس لئے نوع انسان ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے عضوی وجود کو مکمل کر سکتی۔ عالمگیر سلطنت کے حصول کے لئے ابھی صدیاں درکار ہیں لیکن دنیا کی تمام قوموں کا ایک اس قسم کا جتھا قائم ہو جانے کی تمنا دنیا کی تاریخ ماسبق میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی ہے۔ مہذب یورپ پہلے ہی سے اس بلند مقصد کی طرف اپنی نظر زیادہ مضبوطی کے ساتھ جما چکا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ازمنۂ تاریخی میں عالمگیر سلطنت کے حصول کی تمام کوششیں آخر میں ناکامیاب ہوئیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مقصد ناقابل حصول ہے عالمگیر سلطنت کا خیال عالمگیر مذہب کے خیال کے مماثل ہے۔ مذہب عیسوی اس امید میں سرخوش ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ساری دنیا کو اپنے حلقے میں داخل کرلے گا اور اگرچہ یہ امید ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس طرح مذہب عیسوی اس یقین سے دست بردار نہیں ہو سکتا کہ وہ (دنیا کا) واحد مذہب ہو کر رہے گا۔ اسی طرح انسانی سیاسیات تمام بنی نوع انسان کو ایک نظام میں لانے کی کوشش سے باز نہیں رہ سکتی۔ اگر بے تعصبی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ خود صاف صاف اس راستہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو منزل مقصود کو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی

ہمیں اُن غلط راستوں سے متنبہ بھی کرتی ہے جن میں عالمگیر سلطنت کے قبل از وقت حصول کے دیوانہ دار جوش میں ماہرین سیاسیات تک بھٹک گئے ہیں۔ جب سے پہلی بار ایک عام سلطنت کا انسانی احساس یورپ میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے ہر زمانے میں اپنے اپنے طریقے پر اُس کے لئے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

۱۔ سکندر اعظم کی شاہنشاہی

اول۔ سکندر اعظم۔ مقام لوسا (ایران) میں سو جوڑوں کی تقریب شادی کے موقع پر سکندر نے اپنے خیال سے دنیا کو اشارۃً آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یونانیوں کے مردانہ جوش کا عقد ایشیائیوں کی زنانہ جستی و نزاکت سے کرنا چاہتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ مشرق اور مغرب باہم متحد و مخلوط ہو جائیں اور اس جام محبت کے سرمستوں کے اختلاط باہمی سے ایک نئی نوع انسانی پیدا ہو جو ایک عظیم الشان ربانی و انسانی شاہنشاہی کے حصول سے اپنا اطمینان حاصل کرے۔ بہر حال اس طور پر آنے والی صدیوں کی تہذیب و تعلیم کے لئے سکندر نے ایک روش مقرر کر دی اور ایشیا کی نئی سرزمین میں یونانی تہذیب کے تخم نے خوب ہی سرسبزی و شادابی حاصل کی مگر دنیا کی ایک سلطنت قائم کرنے کی یہ پہلی شاندار کوشش کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور سکندر کی موت سے مایوسانہ طور پر تباہ ہو گئی، مگر اس تباہی کا باعث صرف فلک کج رفتاری کو قرار دینا درست نہ ہوگا جس نے اس نئی عالمگیر سلطنت کے بانی کو یکساں انتظامات قائم کرنے اور آئندہ کے لئے سامان مہیا کرنے کے قبل ہی عین عنفوان شباب میں جام مفارقت پلا دیا بلکہ متضاد اجزا کا اختلاط بجائے خود ایک غیر فطری چیز تھا اور جو خیال اس تدبیر کا محرک ہوا وہ خود ہی دھندلا تھا۔ اس امتزاج سے سیاسی خیالات پریشان ہو گئے۔ ادھر یونانی، سلطنت کو آزادانہ طور پر انسان کی نباہی ہوئی شے سمجھتے تھے، ادھر ایرانی حکومت کو آسمانی منصب جانتے تھے۔ ان دونوں میں اتحاد نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نہیں ممکن تھا کہ مقدونیہ کی شاہی ایک ایشیائی مذہبی سلطنت بھی بن جاتی! ایشیائی تو یہ یقین کرنے کو آمادہ تھے کہ سکندر برترین خدا کا فرزند ہے مگر خود یورپ والے اس کو الوہیت کا اعزاز دینے کے خیال تک سے متنفض ہوتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نسلیں گڑبڑ ہو گئیں۔ یونان کے علوم و تہذیب نے ایشیائیوں کو مذہبی اور سیاسی قیود کی پابندیوں سے تو آزاد کر دیا مگر اس کا اثر زیادہ تر یہ ہوا کہ

قدیم نظام ٹوٹ پھوٹ گیا اور اُس کی جگہ پر کوئی نیا نظام وجود میں نہ آیا انسان کو اوصاف الوہیت سے متصف کر دینے سے قدیم دیوتاؤں کی عظمت جاتی رہی تھی۔ یورپی تہذیب بے باکانہ عیاشی کی صورت میں مبدل ہو گئی اور مشرق کی پستی کے مکمل کر دینے میں او رمعاون بن گئی۔

رومان کی شہنشاہی

عالمگیر مملکت حاصل کرنے میں اہل روما کے مساعی نے زیادہ دیرپا نتیجہ پیدا کیا۔ رومن شہنشاہی ایک عالمگیر شہنشاہی تھی۔ تمام رومن قوم یہ سمجھتی تھی کہ تمام روئے زمین پر اپنے خیال سلطنت کے پھیلانے اور تمام قوموں کو رومن اقتدار کے تحت میں لانے کے لئے وہ مبعوث ہوئی ہے۔ اہل روما کی طبیعت کی مردانگی اور ان کی قوت بازو نے انھیں ان متعدد اقوام پر غالب کر دیا جنھوں نے روما کی فاتحانہ رفتار کے مقابلے کی جرأت کی تھی اور قلیل ہی مدت میں اپنی کوہ وقار قانونی تنظیم کے ساتھ روما کی سلطنت تین بر اعظموں میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ اہل روما کا عظیم ترین شخص قیصر جولیس شاہنشاہی کا خیال اپنے اخلاف کے لئے ورثے میں چھوڑ گیا، اور اس خیال میں اس نے ایسی قوت مہیا کر دی جس نے قومی حدود سے گزر کر دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اہل روما کی کوشش پر بھی عالمگیر تاریخ کی عدالت میں محاکمہ ہو چکا ہے۔ یہ کوشش سکندر کی کوشش کی طرح قوموں کے اختلاط پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد ایک قوم واحد کی اعلیٰ فطرت پر تھی جس نے یہ چاہا کہ اپنا قومی اخلاق تمام نوع انسان میں پھیلا دے یعنی تمام دنیا کو رومی بنا دے۔ یہی اس کا گناہ تھا۔ کوئی قوم ایسی جلیل القدر نہیں ہو سکتی کہ تمام نوع انسان کا احاطہ کر لے اور دوسری قوموں کو اپنی آغوش میں فنا کر دے۔ روما کی عالمگیر سلطنت ٹیوٹن قوم کے تازہ جوش جوانی سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی۔ وہ جرمانیوں کو فتح نہ کر سکی اور صدیوں کے جدال و قتال کے بعد جرمانیوں ہی نے اسے پامال کر دیا۔

مقدس رومن شاہنشاہی

اس کے بعد پھر کبھی عالمگیر سلطنت کا خیال سیاسی مطلع پر ایسی شان و شوکت کے ساتھ طلوع نہیں ہوا مگر کبھی بتمامہ غروب بھی نہیں ہوا۔ ازمنۂ متوسط میں اپنے رومانی اور ٹیوٹنی اجزا کے انضباط باہمی کے ساتھ اسے اپنے طور پر حاصل کرنے کی پھر کوشش کی گئی۔ اول فرنگ کی شاہی کے ذریعے سے، بعد ازاں رومن جرمانی شاہنشاہی کے ذریعے سے، یہ سچ ہے کہ انھوں نے زیادہ معتدل حد کے اندر کوشش کی مگر اس سے بھی حصول صداقت میں اہم ترقی ہوئے بغیر نہیں رہی، اب یہ خیال نہیں رہا تھا ایک اعلیٰ اور مطلق اقتدار ہو جو قوم کی تمام زندگی پر یکساں حکومت کرتا ہو۔

اس اثنا میں عیسائیت نے سلطنت و مذہب کے سخت تخالف کو ظاہر کر دیا تھا۔ یہ تخالف انسان کے لئے نتائج سے بھرا ہوا تھا۔ سلطنت اپنے اس حق سے دست کش ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کے ایمان و ایقان پر اپنے قوانین کے ذریعہ سے حکومت کرے، اس نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے سوا ایک مذہبی جماعت بھی ہے، جو زندگی کے خاص اصول رکھتی ہے اور جو خود سلطنت ہی کی طرح (مگر اس سے مختلف) ایک مرئی جسم بھی رکھتی ہے اور حقیقتاً آزاد ہے۔ یہ ایک ایسی روک تھی جو سلطنت کو علی الاطلاق تسلط کے عمل میں لانے سے باز رکھتی تھی۔ وہ مجبور تھی کہ مذہبی زندگی کو کلیسا کی رہبری میں دیدے۔ درحقیقت سلطنت نے کلیسا کے ساتھ اپنے تعلق کو کبھی بھی پوری وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھا مگر مذہبی اعتقاد کی آزادی اور خدا کی عظمت دنیاوی حکمراں کی بے لگام مرضی سے محفوظ رہی عیسائیت کی قوت کا انحصار دنیاوی حکمران پر نہیں تھا۔

علاوہ ازیں عیسوی عالمگیر سلطنت کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ مختلف قوموں کو ہضم کر جائے یا انھیں معدوم کر دے بلکہ وہ ان سب کو امن اور انصاف کا اطمینان دلانا چاہتی تھی۔ ازمنۂ متوسط کا رومن شاہنشاہ تمام قوموں کا "حاکم علی الاطلاق" نہیں تھا بلکہ وہ ان کے حقوق اور ان کی آزادی کا ایک عادل محافظ تھا۔ اس طرح شاہنشاہیت کا خیال پاک و صاف ہو کر فریڈرک ثانی جیسے مدبر اور ڈانٹے جیسے صاحب فکر کی معنی آفرینیوں کی جولانگاہ بن گیا۔ ازمنۂ متوسطہ کی شاہنشاہی حقیقی آزاد سلطنتوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی، جو درحقیقت ایک عام نظم میں متحد اور ع فا شاہنشاہ کے ماتحت تھیں، مگر اپنے تمام اہم امور میں آزاد اور اپنی ہی مرضی پر چلنے والی تھیں یہاں تک کہ (ایک ہی سلطنت کے اندر) متبائن قوموں اور نسلوں کو بھی مراعات و محافظت حاصل تھی مگر جو امر فی نفسہ عالمگیر سلطنت کی نشو و نما میں ترقی کا باعث تھا وہی اس کی خرابی کا بھی سبب ہو گیا کیونکہ زائد از ضرورت یکطرفہ طور پر اس کی پیروی کی جانے لگی۔ افتراق کا میلان اتحاد کی اہمیت سے زیادہ قوی تھا۔ قومیتوں کے تبائن اور زبانوں کے اختلاف نے فرانس اور جرمانیا کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کر دیا اور فرنگ کی عالمگیر بادشاہی کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ جرمانی بادشاہ اور رومن شاہنشاہ کی کمزور طاقت چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور مقامی امرا کے قیام کا مقابلہ نہ کر سکی۔ مرکزی تنظیم کی کوئی مرکزی بنیاد نہیں تھی اور اسلئے

محیط قوتیں بہت زور پکڑ گئیں اور شاہنشاہی کے پرخچے اڑ گئے یہ کوشش دوبارہ ناکام ہوئی مگر آنے والی نسلوں کے لئے اہم سبق چھوڑتی گئی۔

پنولین اول کی شاہنشاہی

ہمارے زمانے (اُنیسویں صدی) میں شاہنشاہ پنولین اول نے ایکبار پھر ارادہ کیا کہ اس خیال کو جو ایک مدت سے فراموشی میں پڑا تھا پھر زندہ کرے اُس نے ازمنۂ وسطیٰ کی غلطی سے بچ کر کامل احتیاط کے ساتھ ایک مضبوط کارکن مرکزی طاقت قائم کی مگر جو سچی ترقیاں ازمنۂ وسطیٰ میں ہو چکی تھیں اُن کو قائم رکھنے کی طرف اُس نے کافی توجہ نہیں کی۔ غیر قومیتوں کا اُس نے بہت ہی کم لحاظ کیا اور اس طرح وہ اُسی راستے پر پڑ گیا جو اس کے قبل اہل روما نے اختیار کیا تھا گو کہ یہ ضرور ہے کہ اُس نے رومیوں کے بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ یورپ کو ایک وسیع بین الاقوامی سلطنت کے طور پر مرتب کرے، اور منفرد سلطنتیں اس کے اعضا و ارکان کی حیثیت سے ہوں۔ شاہنشاہی اقتدار فرانسیسی قوم کو حاصل ہو، جو قوموں کے اس بڑے خاندان میں بمنزلہ سرگروہ کے ہو۔ اس نے ایک پشت میں وہ بات حاصل کرنا چاہی جس کے لئے اہل روما نے صدیاں صرف کر دی تھیں وہ اس منصوبے میں ناکام رہا مگر اس مرتبہ جرمانی قوم کی مقاومت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہ تو بادلِ ناخواستہ فرانسیسی فوقیت کو مان چکے تھے، اگر پنولین کے اس نظم و ترتیب کے متعلق ان کی اطاعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود بھی پرانی شاہنشاہی سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنے آبائی ملک کی صورت حال سے بیزار تھے، صرف دو بڑی جرمانی سلطنتوں نے پیہم جنگ کے ذریعے فرانس کی فوقیت کے مقابلے کی کوشش کی، ایک ان میں سے توحلہ مندپروشیا تھی اور دوسری کئی مختلف ملکوں اور قوموں کا مجموعہ آسٹریا وہ اپنی بقا کے لئے فکرمند تھی اور یہ اپنے آپ کو ایک شاہنشاہی سلطنت سمجھتی تھی مگر فائق مدبّر اور سپہ سالار (یعنی پنولین) نے ان دونوں کو بھی مغلوب کر لیا لیکن انگریز جن کی قومی جبلّت میں قدیم جرمانی (یا ٹیوٹن) نسل کے خیالات آزادی کے ساتھ جن میں ایک جلیل القدر تاریخی احساس قومیت بھی شامل تھا ایک صعب دشمن ثابت ہوئے اور اُن کی مقاومت پر غالب آنے میں پنولین ناکام رہا۔ اُدھر روسی جو اُس وقت تک نیم وحشی تھے شکست کھا کر میدانوں کی طرف ہٹ گئے مگر مغلوب نہیں ہوئے جب متحدہ یورپ فرانس پر حملہ آور ہوا تو اس مصیبت کے وقت فرانسیسیوں نے کچھ استقامت نہیں دکھلائی

پس نپولین کا خیال بھی عملی صورت اختیار کرنے سے اُسی طرح ناکام رہا جیسے اس کے قبل رومی ناکام رہ چکے تھے اور اس ناکامی کے وجوہ و اسباب بھی وہی تھے۔ فرانسیسیوں کے سوا اور تمام قوموں نے اس عالمگیر بادشاہی سے خود کو خطرے میں سمجھا اور دنیا کی اس نئی حکومت کی طرف سے ان کو اعتماد و اطمینان بھی نہیں لایا گیا اس کے ساتھ ہی فرانسیسی قوم میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ وہ ہمیشہ انھیں محکوم رکھ سکتی۔

نوع انسان کے ایک مشترک انتظام کے میلان

لیکن اس اثناء میں خود زمانہ جس پر کسی کا قابو نہیں برابر اپنا کام کرتا جا رہا ہے وہ قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا اور تمام نوع انسانی کے عالمگیر احساس کو پیدا کر رہا ہے اور عام انتظام عالم کے لئے یہ ایک فطری تیاری ہے یہ محض اتفاق ہی اتفاق نہیں ہے کہ جدید تحقیقاتیں اور آمد و رفت اور رسل و رسائل کے بے شمار نئے ذرائع سب کے سب اس غرض کو پورا کر رہے ہیں اور دور جدید کے تمام علوم اس تحریک کے عقب میں چل رہے ہیں اور وہ خاصتہً تمام نوع انسانی کی ملک سمجھے جاتے ہیں اور صرف ضمنی طور پر کسی خاص قوم کے لئے مختص ہوتے ہیں، معہٰذا وہ متعدد روک اور حجاب جو مختلف قوموں کے درمیان حائل تھے اب رفع ہوتے جا رہے ہیں۔ آج بھی تمام یورپ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر خلل جو کسی خاص سلطنت میں پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ کل یورپ کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اور براعظم کے انتہائی حدود پر بھی جو کچھ پیش آتا ہے فوراً ہی اس سے عام دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت بھی یورپ کا جوش طبیعت تمام کرۂ ارض کو اپنے حلقۂ اثر میں لا رہا ہے، اور آریائی نسل یہ محسوس کرتی ہے کہ انتظام عالم کا فرض اس پر عائد کیا گیا ہے۔

ابھی ہم اس حد تک نہیں پہونچے ہیں مگر اس وقت بھی ارادے اور قوت کی اتنی کمی نہیں ہے جتنی روحانی پختگی کی کمی ہے، یوروپی خاندان اقوام کے ارکان دوسری قوموں پر اپنی فوقیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یہ ارکان خود اپنے آپس کے تعلقات اور اپنے ذاتی امور کو صاف اور واضح طور پر سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہیں اُس وقت تک کسی قطعی نتیجے کا امکان نہیں ہے جب تک کہ علم کا نور افشاں لفظ اس امر خاص اور فطرت انسانی کی نسبت کوئی فیصلہ صادر نہ کردے اور (دنیا کی) قومیں اُسے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک عالمگیر شاہنشاہی صرف ایک خیالی شے رہے گی جس کے پیچھے بہت لوگ سرگرداں ہیں مگر جسے کوئی تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ لیکن اس

لحاظ سے کہ عالمگیر شاہنشاہی کا تخیل آئندہ زمانے میں پوری ہونے والی شئے ہے عام نظریۂ سلطنت اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ صرف عالمگیر شاہنشاہی میں سچی انسانی سلطنت کا اظہار ہوگا اور اسی میں بین الاقوامی قانون ایک اعلیٰ شکل اور ایک متیقن ہستی حاصل کرلے گا۔ عالمگیر شاہنشاہی کے ساتھ منفرد سلطنتوں کا تعلق ہے جیسا قوموں کا تعلق نوع انسان کے ساتھ منفرد سلطنتیں عالمگیر شاہنشاہی کے اعضا و جوارح ہیں اور انسانی اعضا کی طرح یہ اعضا بھی ایک جسم میں مرتب ہوکر ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوسکتے اور اپنے مدعا کو حسب دلخواہ حاصل کرسکتے ہیں عالمگیر شاہنشاہی کا مقصد منفرد سلطنتوں کو توڑ دینا اور قوموں کو دبا لینا نہیں ہے بلکہ سلطنتوں کے لئے امن اور قوموں کے لئے آزادی کا بہتر طریق پر حاصل کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ پس سلطنت کا بلند ترین تصور جو ابھی تک عملی صورت اختیار نہیں کرسکا ہے یہ ہے کہ سلطنت بنی نوع انسان کی ایک منتظمہ صورت ہے مگر مردانہ شکل و شمائل کے ساتھ نہ کہ زنانہ صورت میں، کیونکہ سلطنت مرد ہے۔

(۱) وینٹ کے اعتراضات

تعلیقات:۔ (۱) وینٹ (ساکن واڈ) جیسے ذی جوہر اور صداقت پسند شخص نے اپنی کتاب "انفرادیت و اجتماعیت"[۱] میں عالمگیر سلطنت کے خیال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ نوع انسان کی تمام زندگی کو جذب کرلے گی، شخصی آزادی کے اصول کو توڑ دے گی اور ایمان و ایقان اور علم پر ایک غیر مناسب حد تک دنیاوی حکومت قائم کردے گی یہ اعتراض ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس خیال کو زیادہ صحت کے ساتھ محدود کردیں۔

ان اعتراضات کے جوابات

سب سے اول یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سلطنت ہی واحد انسانی اجتماع نہیں ہے تجسیم انسانیت کی یہی ایک شکل نہیں ہے کلیسا بھی اپنی ظاہری و ارضی (دنیاوی) حالت کے اعتبار سے انسانیت کی ایک جماعت اور مجسم ہستی ہے، بہر صورت یہ مسلم ہے کہ سلطنت کی سیاسی حکومت، انسان کی مذہبی زندگی کو معین نہیں کرتی اور نہ انفرادی ضمیر اور عقیدے کی آزادی کو خطرے میں ڈالتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ سلطنت کی انسانی نوعیت کے اعتبار سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ سلطنت افراد پر جزواً و کلاً حکمراں ہے، ہر فرد انسانی میں دو ممیز حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔

---

[۱] Vinet In L Indinidualismeme et le Socialisme

ایک حیثیت انفرادی اور دوسری حیثیت مشترکہ انسانی کوئی فرد واحد بشمول دیگر افراد بتمامہ قوم یا زمین کی ملک نہیں ہے اور اس لئے وہ کلیتہً سلطنت کی ملک بھی نہیں ہے جو زمین پر زندہ جماعت ہے سلطنت کی بنا فطرت انسانی پر ہے مگر نہ اس حد تک جو انواع و اقسام کے تغیرات کے ساتھ لاکھوں افراد میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس حد تک جس قدر کہ انسانیت کی مشترک فطرت ایک شخص میں ظاہر ہوتی ہے اور اس لئے سلطنت کا اختیار اس حد سے آگے نہیں بڑھتا جس قدر کہ مشترک اغراض و اجتماع انسانی کے لئے ضروری ہے۔ خود سلطنت جب غلطی سے انفرادی آزادی کے حدود میں مداخلت کر بیٹھتی ہے تو وہ اپنے حکم کی تعمیل کرانے کی قوت نہیں رکھتی کیونکہ وہ شخصی طبیعت کو پابہ زنجیر نہیں کر سکتی یعنی شخصی روح کو ہلاک نہیں کر سکتی ۔

لورین کے اعتراضات

بہت تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ لورین (Laurent) نے بھی اپنی کتاب "تاریخ حقوق انسان" (Histoiredudrail desgens) میں اپنے کو عالمگیر سلطنت کے خیال کا مخالف ظاہر کیا ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں ۔

(الف) عالمگیر سلطنت ایک عالمگیر شاہی ہوگی اور یہ سلطنتوں کے اقتدار شاہی سے توافق نہیں پیدا کر سکے گی ۔

(ب) افراد کی شخصیت فطری اور قوموں کی شخصیت مفروضہ میں فرق ہے اول الذکر ناقص ہیں اور خراب جذبات سے موثر ہوتے ہیں ثانی الذکر مکمل اور با اخلاق ہستی ہیں ۔ اس غرض سے کہ اول الذکر باہمد گر زندگی بسر کر سکیں قوت سلطنت کی مسلسل مستعدی کی ضرورت ہے مگر ثانی الذکر کو باہمد گر زندگی بسر کرنے کیلئے اس آمادہ کاری کی ضرورت نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت ہی مستثنیٰ صورتوں میں ۔

(ج) فرداً فرداً ہر شخص کمزور ہے اور اسکے لئے قوت سلطنت کے تابع ہونا لازمی ہے سلطنتیں قوی ہیں اور اس لئے وہ کسی اعلیٰ طاقت کے سامنے سر نہیں جھکائینگی ۔

(د) اگر عالمگیر سلطنت اتنی قوی ہوتی کہ وہ سلطنتوں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکے تو یہ فوقیت انصاف اور آزادی میں خلل انداز ہوگی کیونکہ جہاں مقاومت غیر ممکن ہوتی ہے آزادی باقی نہیں رہ سکتی ۔

(ہ) افراد کی ترقی کے لئے قومی سلطنت ضروری ہے اور اسکے لئے اتنا ہی

بکافی بھی ہے' افراد کی بہبود کے لئے عالمگیر سلطنت کی ضرورت نہیں ہے اور قوموں کی ترقی کیلئے یہ عالمگیر سلطنت خطرناک ثابت ہوگی۔

میرے معزز دوست ـــــ دلائل مجھے اپنا معتقد نہ بنا سکے میں ان کا جواب یہ دوں گا۔ کہ

(الف) عالمگیر سلطنت کا خیال شاہی سرکردگی یعنی شہنشاہی کی صورت میں بھی ذہن میں آسکتا ہے اور جمہوریت کی شکل میں بھی۔ یہ جمہوریت خواہ ایک نظامت کے تحت میں قائم کی جائے (میں اس وقت صرف یورپ کے دول خمسہ کا خیال کر رہا ہوں) یا سلطنتوں کی مشترکیت واتحاد کی صورت میں ہو' کسی صورت میں بھی ہمیں اس عالمگیر سلطنت کے لئے اختیار مطلق کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور قومی سلطنتوں کا مسلسل قیام و بقا حدود واختیارات میں تمیز کو خود لازمی کر دے گا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عالمگیر سلطنت کے حدود واختیارات کو دنیا کے مشترک معاملات یعنی دنیا کا امن قائم رکھنے' دنیا کی تجارت اور بالخصوص بین الاقوامی قوانین کے محفوظ رکھنے کے اغراض سے آگے بڑھائے اس کا نمونہ ایک متفقی سلطنت یا ایک متفقی شاہنشاہی میں مل سکتا ہے جس میں عام متفقی معاملات کا انصرام مشترک قانون' مشترک انتظام اور مشترک عدالت کے ذریعے سے ہوتا ہو' اور جو معاملات خاص اپنے اپنے ملک سے متعلق ہوں ان میں منفرد سلطنتوں کا اقتدار شاہی برابر تسلیم کیا جاتا ہو۔

(ب) مثل افراد کے قومیں بھی اپنی کمزوریاں اور اپنے جذبات رکھتی ہیں اور اگر بین الاقوامی قانون نہ ہوتا تو جو قومیں کمزور اور بے بس ہیں وہ بہت آسانی کے ساتھ طاقتور اور حریص قوموں کا شکار ہو جائیں' قانون بین الاقوامی کی بنا عالمگیر سلطنت کی بھی اصل و بنا ہے۔

(ج) قومی سلطنتوں کی قوت' عالمگیر سلطنت کے مقابلے میں بھی' بہترین ضمانت اس امر کی ہے کہ یہ کسی قسم کی تعدی نہ کر سکے گی' لیکن عظیم ترین قومی سلطنت بھی اگر وہ غلطی پر ہے تو اس میں اتنی قوت نہ ہوگی کہ وہ تنہا تمام دنیا سے جنگ کر سکے' جنگ صرف اس وقت ممکن ہوگی جب سلطنتوں کے گروہ یا مختلف فریق ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں ورنہ اور تمام صورتوں میں جنگ۔ عالمگیر عدالتوں کے عدالتی فیصلوں کی تعمیل ہوگی۔ بہترین

سیاسی انتظامات بھی ہیں خانہ جنگوں سے کامل طور پر مامون نہیں کر سکتے اور اگر بین الاقوامی قانون کا ایک زیادہ مضبوط انتظام سلطنتوں کے درمیان جنگ کو کم کر دے تو ہمیں اسی پر قناعت کرنا چاہیے۔ انصاف کبھی اپنے منتہائے خیال پر نہیں پہنچ سکتا بس بہترین صورتوں میں صرف اس کے قریب تک پہنچ جاتا ہے۔

(د) عالمگیر شاہنشاہی قومی سلطنتوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے کم طاقتور ہوگی اس لئے کہ جو اقتدار ایک قومی سلطنت کو اپنے اہل ملک کے مقابلے میں حاصل ہوتا ہے وہ قومی سلطنتوں کے مقابلے میں عالمگیر سلطنت کو کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتا اور باوجود قومی سلطنت کے اس اقتدار سے باشندگان ملک کی آزادی کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ سلطنت کے نظم و ترتیب کے ذریعے سے ہی اس کی اور حفاظت ہوتی ہے۔

(ہ) سلطنت تمام انفرادی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی، علوم و فنون، دینیات اور تجارت وغیرہ کے بہت سے ہمہ گیر روحانی اور مادی اغراض ایسے ہیں جو صرف ایک کامل عالمگیر سلطنت ہی سے کماحقہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ یورپ و امریکہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے وقت میں پوری پوری قوموں تک کے حقوق کس قدر کم محفوظ ہیں۔

لورین بین الاقوامی قانون کی بنا نسل انسانی کے اتحاد پر قرار دیتا ہے اور کوئی دوسری بنا اس کے لئے ہو بھی نہیں سکتی مگر وہ اس اتحاد کو محض ایک اندرونی اتحاد سمجھتا ہے۔ میرے خیال میں منطق اور نفسیات دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اندرونی قوت کو خود کو خارجاً بھی ضرور ظاہر کرنا چاہیے۔ اگر نوع انسان اندرونی طور پر واقعی ایک ہستی ہے تو اپنے پورے نمو کی حالت میں وہ اپنے کو خارجاً بھی مثل ایک شخص کے ظاہر کرے گی اور نوع انسان کی تنظیم ہی عالمگیر سلطنت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے ہمعصر اس خیال کو محض ایک خواب سمجھتے ہیں مگر اس وجہ سے میں اپنے اعتقاد کے اظہار اور اس کی حمایت سے باز نہیں رہ سکتا۔ آئندہ آنے والی نسلیں شاید اب سے صدیوں بعد اس سوال کا آخری فیصلہ کر سکیں گی۔

تیسرا باب

تخیل سلطنت کے نشو ونما کی تاریخ

(۱) دنیائے قدیم

الف یونانیوں کا تخیل سلطنت

صحیح معنوں میں علم السیاست کی ابتدا یونانیوں میں ہوئی جس طرح دیگر علوم وفنون اور فلسفہ کے متعلق انسان کی خود آگاہی کا اظہار اول اول یونان میں ہوا وہی کیفیت سیاسیات کی بھی رہی۔

یونانیوں کے سیاسی تخیلات

یونانی سلطنت کے حدود ارضی جس درجہ مختصر تھے اور اس کی طاقت جس درجہ محدود تھی وہ ظاہر ہے، مگر وہ اصول جن پر یونانیوں کے سیاسی تصورات مبنی تھے، نہایت وسیع اور جامع تھے اور یونان کے اصحاب فکر نے جس سیاسی تخیل کا اظہار کیا ہے وہ ایک بلند رتبہ اور شریفانہ تخیل ہے۔ وہ سلطنت کی بنا کو فطرت انسانی پر قائم کرتے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف سلطنت ہی میں انسان تکمیل کو پہنچ سکتا اور حقیقی طمانیت حاصل کر سکتا ہے ان کے نزدیک سلطنت ہی دنیا کا وہ اخلاقی نظام ہے جس سے فطرت انسانی اپنی غرض کو پورا کرتی ہے۔

افلاطون

افلاطون نے اپنی کتاب[۱] (Repudlic) میں یہ بلند پایہ الفاظ درج

[۱] افلاطون نے جو کتاب اِس نام سے لکھی ہے یا جو اس نام سے اس کی طرف منسوب ہے اس میں نہ صرف سیاسیات پر بحث ہے بلکہ جملہ انتظامات عامہ پر اس نے اظہار خیال کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں (Republic) کے معنی سلطنت جمہوری کے ہیں مگر اس زمانے میں اس کے یہ معنی نہ تھے بلکہ محض جمہور کے مفہوم میں یہ لفظ بولا جاتا تھا۔

کے ہیں کہ سب سے بہتر سلطنت وہ ہے جو اپنی عضو بندی میں سب سے زیادہ انسانی حالت کے قریب پہنچ سکے جسم کے ایک حصے پر اگر کوئی آفت آتی ہے تو تمام جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا اور سارا جسم اس تکلیف رسیدہ عضو سے ہمدردی کرتا ہے"۔ اس عبارت سے اس نے سلطنت کی نہ صرف محض عضوی فطرت بلکہ انسان کی سی عضوی فطرت کو تسلیم کر لیا ہے گو کہ اس نے اس پر مغز خیال کے نتائج سے زیادہ اعتنا نہیں کی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سلطنت انسانی نیکی کا بلند ترین ظہور اور انسان کی مختلف روحانی طاقتوں کا تناسب اور ہم آہنگ جلوہ ہے یعنی سلطنت کامل انسانیت ہے۔ چونکہ روح انسانی عقل آگاہ (شعور) اور مردانہ جرأت اور خواہشات نفسانی سے مرکب ہے اور ذہانت، اور جرأت کو خواہشات پر حکمراں ہونا چاہیے اس لیے افلاطون تخیلہ سلطنت میں عقلمندوں کو حکمراں ہونا اور بہادر جنگجویوں کو قوم کی حفاظت کرنا اور جو فرقے مادی پیداوار اور جسمانی کاموں میں مشغول ہیں انھیں ان دو اعلیٰ طبقوں کا مطیع ہونا چاہیے اور عدالت فرض یہ ہے کہ جسم سیاسی کے تمام متعلقات کو اُن کی فطرت کے مطابق منضبط کرے۔

ارسطو کے سیاسی فلسفے کی عظمت ہمارے دلوں میں اُسی قدر بڑھتی ہے جس قدر زیادہ ہم اس کے بعد کے مصنفوں کی تصانیف پر غور کرتے ہیں افلاطون کی بہ نسبت وہ پرواز خیال کی پیروی کم کرتا ہے، واقعیت کو زیادہ تامل کے ساتھ جانچتا اور انسانی ضروریات کو زیادہ صحت کے ساتھ پہچانتا ہے۔ اس غرض سے کہ حکما اور محافظین قوم کے حکمراں طبقے اپنی زندگی کو کلیتہً سلطنت کے لیے وقف کر دیں افلاطون اُن کو خاندانی زندگی سے علیحدہ کر لیتا ہے اور ان کے لیے مشترک ازواج و املاک مہیا کرنا چاہتا ہے برخلاف اس کے ارسطو چاہتا ہے کہ ازدواج اور خاندان اور شخصی جائداد کے اہم اور مبارک تنظیمات بدستور قائم رہیں۔ وہ سلطنت کو قبائل اور مقامات (یعنی قوم اور ملک) کی ایک مکمل اور خود کفیل زندگی کے باہمی ارتباط کا مجموعہ بتاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "انسان فطرۃً ایک سیاسی حیوان ہے اور سلطنت فطرت انسانی کی پیدا کی ہوئی چیز ہے"۔ "سلطنت محض بقائے زندگی کے لیے وجود میں آتی ہے مگر اس کا قیام یا استمرار بہتر زندگی

کے لئے ہوتا ہے"۔

سلطنت کے اس تخیل (یا منتہائے خیال) میں مذہب وقانون، اخلاق ومعاشرت علوم وفنون، تحصیل وترتیب دولت، تجارت وحرفت، غرض یونانیوں کی جملہ کوششیں مجتمع و مختلط ہیں۔ منفرد انسان کو سلطنت ایک قانونی حیات عطا کرتی ہے سلطنت سے علیحدہ نہ وہ محفوظ ہے نہ اسے آزادی حاصل ہے۔ غیر ملکی فطرتی دشمن ہیں اور مفتوح دشمن غلام ہوجاتے ہیں جو سیاسی جماعت سے خارج ہوتے ہیں اور اس لئے ذلیل و بتذل حالت میں ڈال دئے جاتے ہیں۔

یونانی تخیل سلطنت کے نقائص۔ سلطنت کو زائد از ضرورت طاقت تفویض کی گئی تھی۔

چونکہ قدیم زمانے کی تمام سلطنتوں کی طرح یونانی سلطنت بھی ہمہ گیر طاقت کا منبع سمجھی جاتی تھی اس لئے اسے فی الواقع زائد از ضرورت طاقت حاصل تھی سلطنت ہی سب کچھ تھی کسی شہری کی کوئی ہستی نہ تھی بجز اس کے کہ وہ سلطنت کا ایک رکن تھا، اس کی ہستی بتمامہ سلطنت پر موقوف اور اسی کے تابع تھی۔ بیشک اہل ایتھنز کو ذہنی آزادی حاصل تھی اور وہ اس کو عمل میں بھی لاتے تھے مگر یہ صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ایتھنز کی سلطنت میں فی نفسہ آزادی کی بڑی قدر ومنزلت تھی، نہ اس لئے کہ وہ انسان کے حقوق کو تسلیم کرتی تھی یہی آزاد ترین سلطنت تھی جس نے سقراط کے قتل کی اجازت دی اور یہ سمجھتی رہی کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔ خاندانی آزادی، خانگی زندگی، ماں باپ کی تربیت بلکہ ازدواجی وفاشعاری تک بھی کسی اعتبار سے سلطنت کی مداخلت سے محفوظ نہیں تھی شہریوں کی شخصی ملکیت تو لازماً اور بھی کم مامون تھی۔ سلطنت ہر چیز میں دست اندازی کرتی تھی اور وہ اپنی طاقت کے مسئلے نہ کسی اخلاقی حد کو تسلیم کرتی تھی نہ کسی قانونی حد کو۔ وہ اپنے شہریوں کے جسم بلکہ ان کی ذہنی قابلیت تک کو جس طرح چاہتی تھی کام میں لاتی تھی، وہ عہدوں کے قبول کرنے پر لوگوں کو اسی طرح مجبور کرتی تھی جس طرح فوجی خدمت انجام دینے کے لئے، افراد کو اول سلطنت میں فنا ہوجانا چاہئے تھا پھر اس کے بعد وہ سلطنت کے ذریعے سے دوبارہ زندہ ہوکر آزاد اور معزز زندگی پا سکتے تھے۔ سلطنت کی اس طاقت علی الاطلاق کے لئے قدیم رسم ورواج کے اثر سے قطع نظر اگر کوئی حد تھی تو وہ حسب ذیل تھی۔

اس طاقت علی الاطلاق کے حدود۔

ایک تو اس طاقت کے عملدرآمد میں شہری خود بھی دخل رکھتے تھے اور اس خوف سے کہ

مبادا عوام کی خود مختاری خود ان کے لئے بھی باعث مضرت ہو جائے وہ سیاسی اشتراکیت کے انتہائی نتائج سے بچتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ایک شہر کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں شہریوں کو اپنے جذبات کے عمل میں لانے کے لئے کچھ زیادہ موقع نہ ملتا تھا اور پھر وہ اپنے ہمسایوں کا لحاظ کرنے پر بھی مجبور رہتے تھے اس کے علاوہ یونانی سلطنتیں یونانی قوم کے متفرق اجزا اور ان کی نسلوں کی تقسیم در تقسیم سے مرکب تھیں، اور ان کی حیثیت شہری جماعتوں سے کچھ زیادہ ارفع نہ تھی۔ پس اس طرح اس پُر رفعت تخیل کی مادی صورت بہت حقیر سی تھی۔ اگرچہ یہ تخیل کل نوع انسانی پر منطبق کیا جاتا تھا مگر عملاً وہ صرف کسی پہاڑ کی وادی یا کسی ساحلی قطعے کے تنگ حدود کے اندر ہی اپنی طفلانہ ہستی کو رونما کر سکتا تھا۔

اس طرح قوت سلطنت کی اس خیالی لامحدودیت اور اس کی عملی بے بسی میں ایک گہرا تعلق ہو گیا ہے۔ یونانیوں کے تصور سلطنت کے یہی دو بڑے نقص ہیں ورنہ دیگر اعتبارات سے وہ نہایت ہی قابلِ وقعت، فطرت انسانی کے عین موافق اور نتیجے کے لحاظ سے نہایت ہی بارآور رہا ہے۔

(ب) رومیوں کا تخیل سلطنت

تمام قدیم قوموں میں سب سے زیادہ اہل روما کی طبیعت قانون سلطنت سے مناسبت رکھتی تھی اور اُن کے ذہنی قویٰ سے زیادہ اُن کے اخلاقی خصائل اس کا باعث تھے اس لئے دنیا پر یونانیوں کے بہ نسبت اُن کا زیادہ اثر پڑا۔

یونانیوں کا اثر۔

پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کا تخیل سلطنت یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیش نظر رکھا ہے رومن مصنفین جب قانون و سلطنت کی عمومی تشریح کرتے ہیں تو وہ فلاسفہ یونان خاصکر رواقیوں کا اتباع کرتے ہیں۔

سسرو سلطنت کو انسانی طاقت کی اعلیٰ ترین پیداوار قرار دیتا اور کہتا ہے کہ انسان کسی کام میں خداؤں کی مرضی سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا سلطنتوں کی بنا ڈالنے اور اُن کو قائم رکھنے کی کوشش میں کہیں کہیں وہ بھی سلطنت کو انسان سے اور سرگروہ سلطنت کو انسانی روح سے مشابہ قرار دیتا ہے جو جسم پر حکومت کرتی ہے!

یونانی تخیل سے فرق

لیکن بعض اہم خصوصیات میں رومن تصور سلطنت، یونانی تخیل سے مختلف ہے۔

(۱) قانون کا اخلاقیات سے ممیز کیا جانا

رومیوں ہی نے سب سے پہلے قانون کو اخلاق سے ممیز کیا اور اسے ایک معین شکل میں ڈھالا اور اس طرح سلطنت کی قانونی حیثیت کو زیادہ واضح طور پر نمایاں کیا اس طرح اُنھوں نے سلطنت کی حد بندی کر کے اسے زیادہ استحکام اور قوت عطا کی۔ اب سلطنت ان کے لئے اخلاقی نظم عالم کا مجموعہ نہیں رہی، بلکہ وہ ابتداہی سے ایک عام قانونی تنظیم بن گئی اُنھوں نے بہت کچھ معاشری رسم ورواج پر اور انسان کے جذبۂ ہیئیت پر چھوڑ دیا رومیوں کا خاندان (یونانیوں کے بہ نسبت) سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔ شخصی جائداد اور شخصی حقوق خود حکومت کے خود مختارانہ عمل کے مقابلے میں بھی بالعموم

زیادہ محفوظ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے بھی سلطنت کی بہبود کو برترین قانون قرار دیا
حتیٰ کہ اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کا انتظام بھی سلطنت کی طرف سے ہوتا تھا۔ سلطنت
جب اپنا منشا ظاہر کر دیتی تو پھر کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا مگر بایں ہمہ رومی سلطنت
نے اپنے حدود مقرر کر لئے تھے اور خود اپنے اختیار اور اپنے عمل کی وسعت کا
حصر کر دیا تھا۔

۲۔ قوم کا تصور

مزید براں اہل روما "قوم" کے تصور کو تسلیم کرتے تھے اور انھوں نے نظام سلطنت
اور قوم کے درمیان ایک عضوی تعلق پیدا کر دیا تھا۔ وہ بالاعلان یہ کہتے تھے کہ قوم کی تنظیم شدہ
ہیئت ہی سلطنت ہے اور قوم کی مرضی ہی کو وہ تمام قوانین کی اصل قرار دیتے تھے پس رومی سلطنت
محض ایک مقامی جماعت نہیں رہی تھی بلکہ اس نے خود کو ایک قومی سلطنت کے بلند درجے تک
پہنچا دیا تھا۔

۳۔ عالمگیر سلطنت کی طرف میلان۔

علاوہ ازیں، رومی سلطنت کے لئے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ تمام دنیا کو اپنی آغوش میں
لے لیگی۔ عالمگیر حکومت کا یہ میلان، اہل روما کی تمام تاریخ میں جاری وساری ہے۔
شہریت کے قومی قانون کے ساتھ قانون اجانب بھی شامل تھا۔ رومیوں کا شہر ابد قرار (روما)
دنیا کا دارالحکومت ہو گیا گویا دنیا ایک انگشتری تھی اور روما اُس انگشتری کا نگینہ رومی حکام کے اختیارات
محیط عالم ہو گئے تھے رومی سینات تمام قوموں اور ان کے بادشاہوں کا سینات ہو گیا۔ رومی قوم کی
عظمت وشوکت بڑھتے بڑھتے شہنشاہی طاقت کی عظمت وشوکت کے درجے پر پہنچ گئی۔ چنانچہ
فلورس فخر سے کہتا ہے کہ روما کی تاریخ نوع انسانی کی تاریخ ہو گئی اس کوشش نے رومی تخیل
سلطنت میں ایک ایسی جان ڈال دی جس سے یونانی سلطنتیں بہت پیچھے رہ گئیں اور رومیوں کو ایسی
عظمت نصیب ہوئی جس کے سامنے یونانیوں کو جھکنا پڑا۔ تمام دنیا پر جو قوت حکومت کر رہی تھی وہ
کوئی وہمی شے نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی شے تھی جو اُس زمانے کی ساری دنیا پر حکمرانی کرتی تھی اور
جس کے مقابلے کی جرات مغرب میں صرف جرمانی اور مشرق میں صرف ایرانی ہی کر سکے۔

چوتھا باب

(۲) ازمنۂ وسطیٰ

جن دو جدید طاقتوں نے روما کی عالمگیر شاہنشاہی میں گونہ تبدیلی پیدا کیا اور ایک حد تک اُسے تباہ کردیا وہ عیسائیت اور جرمانی قوم کی طاقتیں تھیں۔

(الف) عیسائیت

ابتدائی زمانے کے کلیسا کی روش سلطنت کے متعلق۔

عیسوی مذہب نے یہودی سلطنت اور روما کی شاہنشاہی دونوں کے اقتدار سے یکساں انکار کرکے اپنی طاقت انسان کے دلوں میں جاگزیں کردی۔ عیسائیت کا بانی کچھ اس دنیا کا بادشاہ نہ تھا۔ قدیم سلطنت نے اسے اور اس کے پیرودں کو ہر طرح پرستایا یہاں تک کہ ان کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا۔ زمانۂ اوائل کے عیسائی سلطنت کے براہ راست مخالف نہ بھی تھے مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ سیاسی تنظیم اور سیاسی اغراض کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کی طرف مائل تھے جب عیسوی دنیا اور قدیم یونانی رومی سلطنت میں صلح و آشتی ہوئی اُس وقت مذہبی جماعت یعنی کلیسا کو اپنی مختص روحانی ہستی کا احساس ہوچکا تھا اور وہ خود کو محض سلطنت کا ایک محکمہ نہیں سمجھتا تھا بنا خیال یہ شائع ہوگیا تھا کہ جماعت کی تمام و کمال روحانی زندگی اگرچہ سلطنت کی نگرانی اور اثر سے کلیتہً علیحدہ نہیں ہوگئی ہے پھر بھی وہ حقیقیاً اُس سے آزاد ہے۔ کلیسا اور سلطنت کی یہ نمایاں دورنگی سلطنت کے حد اثر کے لئے ایک حقیقی روک ہوگئی۔ سلطنت اب صرف قانون و سیاسیات کی ایک جماعت رہ گئی تھی، مذہب و عبادت سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

پاپائیت

جب کلیسا نے اپنے لئے شہنشاہ سے جدا پوپ کے نام سے ایک ظاہری سرگروہ حاصل کرلیا اور روما کو اس کا مستقر قرار دیدیا تو عالمگیر تسلط کا قدیم رومی تخیل مذہبی رنگ میں پھر ظاہر ہوا۔ اگرچہ اپنی زمانہ وسطی والی وقعت پر پہنچکر بھی کلیسا کو اس امر میں کامیابی نہیں ہوئی کہ وہ سلطنت کو پست کرکے اسے محض ایک مذہبی محکمہ بنادے تاہم اس کی چمک دمک نے ایک مدت تک

سلطنت کے خیال کو خیرہ کر دیا تھا کلیسا اپنے کو آفتاب سے اور سلطنت کو ماہتاب سے تشبیہ دیتا تھا
اور انسانوں کی روحوں پر حکمران ہونے کی حیثیت سے اُن کے جسموں کے حکمران پر تقدم کا دعویٰ
کرتا تھا مگر سلطنت اور کلیسا کی یہ دوگونہ حیثیت برابر تسلیم ہوتی رہی اور مآل کار سلطنت کی
آزادی محفوظ رہ گئی شہنشاہ اور پوپ دونوں کی تلواریں یکساں طور پر خدا سے حاصل ہوئی
تھیں جو دنیا کا برتر اور حقیقی حکمران ہے۔ جہاں تک کلیسا کی تعلیم نے اثر کیا سلطنت کا تصور
(جیسا کہ اس سے پہلے مشرق میں ہو چکا تھا) پھر مذہبی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ سلطنت کی طاقت خدا
سے حاصل ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی سلطنت کی روحانی اہمیت نظر انداز کر دی گئی تھی اور اس کے
سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ تمام مذہبی زندگی کلیسا سے حاصل ہونا چاہئے تھی اور چونکہ سلطنت محض
جسمانی خیال کی جاتی تھی اس لئے اُس کا درجہ پست رکھا گیا تھا۔ قومیت کے تنگ حدود سے
سلطنت کے تصور کا وسیع ہونا اُس کا ناکافی معاوضہ تھا۔ سلطنت کا مطمح نظر نوع انسانی پر
حکومت کرنا نہیں رہا تھا بلکہ صرف عیسائیوں کے امور دنیادی کا انصرام اس کا کام تھا۔ ازمنہ وسطیٰ
کی حالت کے اعتبار سے رومن شہنشاہی کی تجدید اس طرح ہوئی تھی کہ اعلیٰ اصفات میں کلیسائے روما
اور ادنیٰ اصفات میں جرمانی قوم کی رومی شہنشاہی اُس کی نمائندگی کرتی تھیں۔

جرمانیوں (یا ٹیوٹنوں) کی طاقت

(ب) جرمانی (یا ٹیوٹن) قوم

روما کی قدیم عالمگیر شاہنشاہی ٹیوٹن نسلوں کے مقابلے میں دائماً قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ان
جنگجو قبائل نے ایک صوبے کے بعد دوسرا صوبہ رومیوں کے تحت سے نکال لیا۔ ایسے اتفاقات بھی
پیش آئے کہ رومی صوبہ داروں یا خود شاہنشاہوں نے اپنی مدد کے لئے ٹیوٹن شاہزادوں سے
فوجی مدد طلب کی اور اس طرح اُنھوں نے پُرامن طریق سے اقطاع ملک پر شاہی حقوق حاصل
کر لئے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مغرب میں ہر جگہ ٹیوٹن حکمراں تھے۔ اُنھوں نے کلیسا کی مذہبی تعلیم اور
رومی تہذیب کے اثر کو قبول کر لیا تھا مگر شاہوں کے تخت اور امرا کے قلعوں پر انھیں کا قبضہ رہا
عصا اور تلوار دونوں انھیں کے ہاتھ میں تھے۔

قوم ٹیوٹن کا خصلت

رومیوں کی طرح ٹیوٹن ایک کامل سیاسی قوم نہیں ہیں۔ افراد کل قوم کے اقتدار اعلیٰ
کی اطاعت بادل ناخواستہ کرتے ہیں۔ ان کی مضبوط، با اعتماد اور خود رائے شخصیت احساس عامہ میں
مداخلت کرتی اور اس کی قوت کو رد کرتی ہے (یہی اس وجہ سے قوم ٹیوٹن کو رومیوں کے سیاسی

انضباط سے سبق لینے کی ضرورت تھی) مگر بایں ہمہ تاریخ عالم میں سیاسیات کا ارتقا اُن کا بہت کچھ زیر بار احسان ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ قوم ٹیوٹن نے رومی سلطنت کی مطلق العنانی کو توڑ دیا اور جدید سیاسی تنظیمات میں اشخاص و جماعات، اور طبقات، کی آزادی کے لئے ایک با اثر جگہ حاصل کرلی۔ مونٹسکیو نے بہت ہی سچ کہا ہے کہ مجالس شوریٰ کے انتظامات کے تخم کو جرمانیا کے جنگلوں میں تلاش کرنا چاہیئے جہاں قدیم غیر متمدن جرمانی قبیلے سکونت پذیر تھے۔ ٹاسی ٹس نے ابتدائی صورتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے کہ شاہان ٹیوٹن ایک جانب مقامی شہزادوں اور دوسرے امرا کے ساتھ اور دوسرے جانب آزاد اشخاص کی جماعت عظمیٰ کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے اسی نقشے میں ہمیں اس آزاد نیابتی حکومت کی ناہموار ابتدا صاف نظر آتی ہے جو بعد کی صدیوں میں پیدا ہوئی۔

انفرادی حقوق کا خیال۔

ٹیوٹنوں کے نزدیک قوم کی مرضی یا کم از کم اس کی براہ راست مرضی، قانون کا ماخذ نہیں ہے وہ اپنے لئے ایک پیدائشی حق کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی حفاظت سلطنت کا فرض ہے مگر جسے سلطنت پیدا نہیں کرتی اور جس کے لئے ایک ٹیوٹن ساری دنیا سے لڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی (قومی) حکومت کے اقتدار کے مقابلے میں بھی سینہ سپر رہتا ہے۔ وہ سلطنت کے اس قدیم تخیل کا کہ "جو کچھ ہے سلطنت ہی ہے"، شدت کے ساتھ منکر ہے پس اس طرح تمام نسبتیں الٹ گئی ہیں۔ ایک ٹیوٹن شخص کے نزدیک شخصی آزادی فائق ہے۔ اسے اس امر کی ترغیب دی جاسکتی ہے کہ وہ سلطنت کے لئے اس آزادی کا ایک حصہ قربان کردے تاکہ باقی حصے کو وہ زیادہ محفوظ رکھ سکے۔

اس خصلت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جرمانی تخیل سلطنت رومی تخیل سلطنت کے بہ نسبت شخصی حقوق کی آزادی کی قطعاً و حتماً زیادہ وقعت کرتا ہے۔ اس طرح شخص، خاندان اور جماعت کی آزادی قدیم رومی شہنشاہی کے بہ نسبت زیادہ محفوظ اور زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ لہذا سلطنت کے حقوق کلیسا کے حقوق کے ساتھ ہی شخصی حقوق سے بھی محدود ہو گئے تھے۔

سیاسیات میں تخصیص

اس خصلت کا ایک دوسرا نتیجہ قانون عامہ کے لئے یہ ہے کہ جرمانی قومیں سلطنت کے اختیار مطلق کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتیں اور اُن معاملات میں بھی نہیں جن کا اثر کل جماعت پر پڑتا ہے۔ امپیریم کا رومی تصور اُن کے لئے ایک اجنبی چیز ہے۔ جب اُن سے حکم ماننے کو کہا جاتا ہے تو وہ رائے دینے اور فیصلہ کرنے میں شریک ہونے کے خواہاں ہوتے تھے۔

ان کے طبقات ایک سیاسی طاقت ہیں جس کے ساتھ بادشاہ کی طاقت کو متحد ہونا چاہیے تاکہ
قانون وضع کیے جاسکیں یہ خیال کہ سلطنت مجموعی حیثیت سے ایک شخص متصور ہوسکتی ہے
جرمانیوں کے لیے دور از کار اور بیشتر ناقابل فہم ہے۔ ان کا میلان زیادہ اس طرف ہوتا ہے کہ سلطنت
کو واقعی اشخاص یا واقعی اشخاص کی جماعتوں میں منقسم کردیں۔ وہ اولاً یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت
بادشاہ یا دوسرے والیان ملک میں جو محکمۂ عدالت اور مجلس ملی کے سرگروہ ہیں یا تعلقوں اور
قبیلوں، اور قصبوں کے سرداروں میں مرکوز ہوتی ہے۔ اشخاص کا ایک گروہ کبھی دوسرے
گروہ کو تقویت دیتا ہے اور کبھی اس کے سدراہ ہوجاتا ہے۔ پس قوم کا سارا نظام جذبات تک سا
میں آزادی کی روح سے بھرا ہوا ہے۔ اجزائے ترکیبی کا اتحاد نسبتاً کمزور ہے مگر اُن اجزا کی آزادی
بجائے خود مستحکم ہے۔

قدامت کے مابقی روایات

تخیل سلطنت کے یہ تغیرات جن میں معتدبہ ترقی پائی جاتی ہے نظریہ کے بہ نسبت عمل
میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ خود جرمانیوں کا کوئی مخصوص سیاسی فلسفہ تھا ہی نہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ
میں علوم اول اول کلیسا کے ہاتھ میں رہے اور اس کے بعد رومی اصول قانون اور یونانی فلسفے
کی روایات نے انھیں اپنا تابع بنالیا۔ قدیم قبائلی قوانین تک میں اس قسم کے آثار پائے جاتے ہیں
مثلاً مغربی گوتھی قوانین میں قدیم ادبیات کے تتبع میں جسم سیاسی کو انسان سے مشابہ قرار دیا ہے
جس کا سر بادشاہ اور جس کے اعضا قوم ہے مگر یہ محض تقلیدی انشا پردازانہ نمائش تھی۔
اس میں کوئی عمیق معنی نہیں تھے اور نہ ازمنۂ وسطیٰ کی حقیقی سلطنتوں سے اس کی کوئی قطعی
تطبیق کی گئی تھی۔

جاگیرداری قانون۔

بعض دوسرے اعتبارات سے تخیل سلطنت میں تنزل واقع ہوا اور یہ محض اسی وجہ سے
نہیں ہوا کہ کلیسا نے اسے نسبتاً حقیر قرار دے دیا تھا
ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت بھی ایک قانونی سلطنت کہی جاسکتی ہے مگر رومیوں کے مفہوم سے ایک
جداگانہ مفہوم میں کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت خالص قانون عامہ کی تنظیم نہیں تھی بلکہ اس کے
تمام تنظیمات میں شخصی قانون کے اجزا ملے ہوئے تھے۔ مملکتی بادشاہت خاندان کی موروثی ملک
شمار ہوتی تھی اور خدمات عامۂ اراضی پر پابند سمجھے جاتے تھے۔ سارے جاگیرداری قانون اور
آبائی سلطنت کو اس تخلیط سے ہر طور پر نقصان اُٹھانا پڑا۔ رومیوں نے قانون عامہ نے عافیت نامہ
کے لیے صرف ایک بنیاد کا کام دیا ورنہ ازمنۂ وسطیٰ کا جاگیرداری قانون ہی اس زمانے کی

سلطنت کا اصلی مقصود معلوم ہوتا تھا اور اُس کے لئے قوم کے سود و بہبود کی طرف سے بے پروائی ہوتی جاتی تھی۔

قومی اور سیاسی اتحاد کے شکست ہو جانے، جاگیرداری طریق کے نافذ ہو جانے، طبقوں اور خاندانوں کے حقوق میں تصادم ہو جانے سے قومی سلطنت کا تصور فنا ہو گیا تھا رومن شہنشاہی کے اثرات میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ سیاسی اتحاد کے بہ نسبت زیادہ تر مغربی یورپ کا خیالی بین الاقوامی اتحاد تھا اور یہ اتحاد شہنشاہی کے بجائے زیادہ تر پوپ اور رومن پادریوں کے اقتدار کی وجہ سے قائم تھا۔

فی الجملہ سلطنت کی زیادہ آزاد اور زیادہ صحیح ترقی کا بیج بو دیا جا چکا تھا مگر ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کا تخیل بمقابلہ رومی زمانہ کے قطعیت و قوت میں کم ہو گیا تھا۔

(ج) نشاۃ جدیدہ کا اثر

قدیم سلطنت کی یاد ازمنہ وسطیٰ میں بھی کسی وقت کلیتہً محو نہیں ہوئی تھی۔ روما اب بھی مغرب کا روحانی مستقر بنا ہوا تھا۔ جرمانیوں نے اگرچہ قدیم رومن سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے مگر وہی جرمانی جنھوں نے رومی صوبوں کو خود مختار سلطنتیں بنا دیا تھا۔ اپنے تمدن اور سب سے بڑھکر اپنے مذہب میں روما ہی کا تتبع کرتے تھے اور رومیوں کے زوال یافتہ شہر کے بجائے رومن کلیسا ازمنہ وسطیٰ کی حکمراں طاقت بن گیا تھا جس کی اطاعت ایک وقت میں اگر خود جرمانی قوم نے بھی کی۔ رومن کلیسا کے تنظیمات اس کے طور و طریق، اخلاق، قانون اور زبان میں قدیم رومن سلطنت کا ایک بہت بڑا بلکہ اس کا خاص الخاص حصہ قائم رہ گیا تھا۔ اقوام پر زیادہ آسانی کے ساتھ حکومت کرنے کے لئے قدیم شہنشاہی نے پاپائیت کی اور عالمگیر سلطنت نے عالمگیر کلیسا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ قدیم رومن شہنشاہ اپنے اقتدار کو رومن قوم کے نام اور رومن قوانین کی امداد سے اپنے نائبین اور عمال کے توسط سے عمل میں لاتا تھا اور اپنی فوجوں کے ذریعے سے ان کی تعمیل کراتا تھا۔ اسی طرح رومن پوپ مذہبی انضباط اور دینی قانون کی مدد سے اپنے اساقفہ کے وسیلے سے خداوند و کلیسا کے نام سے تقدس و عظمت کی مسند پر متمکن تھا اور بے شمار خانقاہی سلسلوں کے ذریعے سے اپنے احکام کا نفاذ کرتا تھا۔

مگر کلیسا کے پہلو بہ پہلو قدیم شہنشاہی کی یاد بدستور قائم تھی ہم اب اس زمانے میں

یہ جانتے ہیں کہ کارل (چارلس) اعظم کے وقت سے فرانکی (فرانسیسی) بادشاہوں کی اور اوٹو اعظم کے وقت سے جرمانی بادشاہوں کی رومن شہنشاہی اُس رومن شہنشاہی سے جس کا مستقر روما اور قسطنطنیہ تھا کس درجہ مختلف تھی مگر تمام ازمنہ وسطیٰ میں لوگ یہی یقین کرتے تھے کہ فرانکی رومی جرمانی رومی شہنشاہی اسی روما والی شہنشاہی کی جانشین ہے اور یہ کہ فرانکی شہنشاہ جرمانی قوم کا رومی شہنشاہ کلاڈیس، انٹونیس اور قسطنطین کا باقاعدہ جانشین ہے۔ بہرحال شہنشاہوں کی از سر نو قائم شدہ عظمت قدیم رومن شہنشاہی کی یاد تازہ کرتی تھی اور دنیائے قدیم کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات و تنظیمات کا ایک خیالی اتحاد قائم ہو گیا تھا۔

رومن قانون

مزید برآں یہ کہ قدیم رومی شہنشاہی ضابطہ یعنی مجموعہ قوانین روما از سر نو ہاتھ آ گیا تھا۔ اطالیہ کی یونیورسٹیوں میں بارھویں صدی سے اس ضابطے کی تشریح و توضیح ہوتی رہی تھی اس طرح پر کہ گویا وہ نوع انسان کے الہامی قانون کا معزز و موقر درجہ رکھتا تھا۔ اطالیہ سے نکل کر اس قانون نے تمام مغرب کو فتح کر لیا اور ہر جگہ مسلم و مستند ہو گیا۔ تیرھویں صدی سے فرانس میں اور پندرھویں صدی سے جرمانیا میں اس کا دور دورہ ہو گیا۔ جرمانیا میں اس کے اثرات و نتائج فرانس سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے البتہ قانون عامہ کے بجائے اُس زمانے کے فاضل قانون داں زیادہ تر شخصی قانون اور شاید اُس سے بھی زیادہ فوجداری کے قانون کو مدنظر رکھتے تھے مگر پھر بھی اس طرح سلطنت، اس کی قانون سازی اور اس کے اقتدار شاہی کی نسبت بہت سے اصولی خیالات جنہیں رومیوں نے ظاہر کیا تھا، تعلیم یافتہ طبقے کے معمولی خیالات کا جزو ہو گئے۔

جمہوریت کے اور روایات

علاوہ ازیں قدیم رومن جمہوریت اور اس کی عظمت کی یاد بسا اوقات شہری باشندوں کی نئی شہری جمہوریتیں قائم کرنے کی کوششوں کو تازہ کرتی اور اس میں جان ڈالتی رہی۔ اطالیہ اور جرمانیا کے حکام شہری (Civil magistraae) کا نام رومی جمہوریت کے کانسلوں کا ایک دھندلا سا خیال پیدا کرتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں روما کے عامۃ الناس نے دو بار پرانی جمہوریت کے بیدار کرنے اور اس میں از سر نو جان ڈالنے کی کوششیں افسانہ وار جوش کے ساتھ کیں، ایک مرتبہ بارھویں صدی میں آرنلڈ آف بریسکیا کی سرکردگی میں اور دوسری مرتبہ چودھویں صدی میں ٹربیون کولا ریینزی کے تحت میں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے رومیوں کی سیاسی ناقابلیت کے سبب سے یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں مگر ان دونوں سے قدیم روایات کی قوت کا ثبوت

ملتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے رومی الاثر تمدن کے لئے یونانی سیاسی نظریات بھی کلیتہً غیر معروف نہ تھیں۔ بہت سی خانقاہوں میں ارسطو کی کتاب "سیاسیات" کی تعلیم ہوتی تھی حتیٰ کہ دینیات کے نہایت ہی مشہور عالم ٹامس (اکوئینوی) نے اس یونانی فلسفی کی اس برگزیدہ تصنیف کی شرح لکھی۔

بااین ہمہ ازمنۂ وسطیٰ کا قانونی نظم اور اس سے بھی زیادہ اس کی سیاسی تنظیم، قدیم طور وطریق سے بالکل ہی مختلف تھی۔ اس زمانے کی تمام تنظیمات جرمانی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں اور اس کے خیالات پر کلیسا کے مذہبی قوانین حاوی تھے۔

پندرھویں صدی کے نصف آخر میں قدما کے زمانے کی یاد زیادہ زور کے ساتھ تازہ ہوگئی تھی اور یونانیوں اور رومیوں کی قدامت کی روح دوبارہ بیدار ہوگئی تھی (اسی کو نشاۂ جدیدہ یا نئی زندگی کہتے ہیں) قدیم فنون کے کاموں نے اطالیہ کے ہنروروں یعنی تعمیرات سنگ تراشی نقاشی اور شاعری کے ماہروں کے دلوں میں آزادی پیدا کردی اور ان کے خیالات کو بلند کردیا قدیم علوم کے خیالات نے دوبارہ وقعت وعزت حاصل کرلی اور ازمنۂ وسطیٰ کی مدرسی تعلیم اور خانقاہی دینیات کے قیود وعائدہ کو توڑ ڈالا۔ کلیسا کے اس عقیدے پر کہ دنیا ایک قابل احتراز چیز ہے، اس خیال نے غلبہ پالیا تھا کہ انسانیت (یعنی فطرت انسانی اور قدامت کا مطالعہ) ایک قابل قدر شے ہے اور زندگی پر زیادہ روشن اور زیادہ مسرت آمیز طریقے سے نظر ڈالنے کو درباروں اور شہروں میں وسیع مقبولیت حاصل ہوگئی۔ جس طرح تقریباً دو ہزار برس قبل سوفسطائی یونانیوں کے عالی خاندان نوجوانوں کے معلم ہوگئے تھے اسی طرح اب علمائے قدامت جرمانیا فرانسیسی اور اطالیہ کے حوصلہ مند نوجوانوں کے معلم وادیب ہوگئے۔ تعلیم یافتہ اشخاص اب اس ملامت سے ہراساں نہیں ہوتے تھے کہ وہ مسیحیوں سے پھر بت پرست بنتے جارہے ہیں خود پاپاؤں تک نے اس ذہنی تحریک کی سرگرہی اختیار کی۔ نکولاس پنجم (۱۴۵۵-۱۴۴۷) پیس دوم اینیاس سلوئیس (۱۴۵۸-۱۴۶۴) یولیس (جولیس) دوم (۱۵۰۳-۱۵۱۳) لیئو دہم (۱۵۱۳-۱۵۲۱) سب نے نشاۂ جدیدہ کے فنون لطیفہ کی آزادی کی ہمت افزائی اور حمایت کی۔ مڈلیسی کا شاہانہ جاہ وعظمت والا خاندان حکمران ہیں سے کوسی مو (۱۴۳۴-۱۴۶۴) اور لورنیزو (۱۴۶۹-۱۴۹۲) نے خوشنما فلورنس کو اطالیہ کا ایتھنز بنا دیا۔

علوم قدامت کی تجدید

قدیم تصورِ سلطنت اور اسی طرح قدیم نظریاتِ سیاسی کا کچھ حصہ بھی اب دوبارہ ظاہر ہوا اور اس نے عام معاملات پر اپنا اثر ڈالا (خصوصاً) حسب ذیل صورتوں میں۔

(۱) ایک یہ کہ چند ذی ہمت صاحبانِ فکر نے سلطنتوں کے قیام اور سیاسی اقتدار کی نوعیت کو انسانی خیالات کے تحت میں لا کر ان کی تشریح کرنے کی جرأت کی اور اس طرح سلطنت کے معاملات میں مذہبی طرزِ استدلال کا مقابلہ کیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ حکمتِ عملی کا خیال یعنی سلطنت کی رہبری اور قوموں کی حکومت کے اغراض و ذرائع پر بالارادہ اور خاصاً غور کرنا، سیاسی عملیات و نظریات میں قطعی ہو گیا اور مکیاویلی (۱۴۶۹-۱۵۲۷) کی تحریرات میں اس خیال کو واضح ترین اور صاف ترین اظہار کا موقع ملا۔ اس کی کتاب "مکالمات لیوی" (جس میں اس نے رومن جمہوریت کی عظمت و رفعت کو ظاہر کیا ہے) نیز اس کی تصنیف "حکمراں" (Prince جس میں اس نے حکمرانوں کے حوصلوں کو پورا کرنے کے طریقے بتائے ہیں) دونوں نشأۃ جدیدہ کے سیاسی جوش سے بھری ہوئی ہیں

(۳) تیسرے یہ کہ ہم ایک ایسی سیاسی آمریت اور سیاسی اقتدار شاہی کی تجدید کے علامات دیکھتے ہیں جن کے واحد اقتدار کے سامنے ہر شے کو جھکنا پڑتا ہے۔ اُس بادشاہ کے ہاتھ میں جو سلطنت پر حکمراں ہے یہ اقتدار تمام جاگیری اور ازمنہ وسطیٰ کے سارے طبقاتی قیود سے آزاد ہو کر رومن شہنشاہ کی سی مطلق العنانی کی حد تک ترقی کر گیا۔

(۴) آخر الامر یہ ہے کہ نشأۃ جدیدہ نے خود کو ایک مخالف شکل میں بھی ظاہر کیا جس میں اس روز افزوں ظلم نے استقلال پیدا کر دیا قیصر کی یاد کے ساتھ بروٹس کی یاد بھی تازہ ہو گئی۔ ظالموں کا قتل جمہوریت کا ایک وصف سمجھا جاتا تھا اور اس کی مدح سرائی ہوتی تھی یہاں تک کہ کیٹیلینا کے سے بیباک سازشی بھی پیدا ہو گئے۔

مگر قدیم سیاسی خیالات اور قدیم میلانات کی یہ تمام "تجدید" اعلیٰ تعلیم یافتوں کے ایک تنگ حلقے ہی تک محدود تھی۔ عامۃ الناس تو اسے سمجھتے تھے اور نہ اُسکے سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ سیاسیات پر نشأۃ جدیدہ کا تمام اثر صرف جزوی اثر

تھا اور بہت جلد رفع ہوگیا۔ اُس نے ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کے شیرازے کو بکھیر کر ازمنۂ جدیدہ کی سلطنت کے لئے راستہ صاف کر دیا مگر بجائے خود کوئی نئی سیاسی تنظیم نہ پیدا کر سکا۔

پانچواں باب

(۳) ازمنۂ جدیدہ کا تخیل سلطنت

(الف) نیا دور کس وقت سے شروع ہوتا ہے۔

آج اہل یورپ و امریکہ کا تاریخی احساس اس امر کے قبول کرنے پر متفق ہے کہ انسانی زندگی میں کئی صدیوں کا ایک زمانہ گذرا ہے جسے ہم "ازمنۂ وسطیٰ" کہتے ہیں اور وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم اب ایک نئے زمانے میں رہتے ہیں مگر اُس خاص وقت کے متعلق جو موجودہ زمانے کو ازمنۂ وسطیٰ سے قطعی طور پر جدا کرتا ہے رایوں میں اب بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تو ہم مدت سے جانتے ہیں کہ ماضی مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ آنے والے زمانے کے مدرکات و میلانات بہت پیشتر سے محسوس ہونے لگتے ہیں، اور (اسی طرح) ایام گذشتہ کے بیشمار اثرات بدلے ہوئے وقتوں میں بھی اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں چند ممتاز افراد نے ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو موجودہ صدی کے قبل تک سمجھ میں نہیں آئے تھے اور (دوسرے جانب) ہم آج تک ازمنۂ وسطیٰ کے بہت سے تنظیمات کے آثار دیکھتے ہیں جو باحتیاط تمام محفوظ رکھے گئے ہیں اور یہ آثار صرف خانقاہوں اور امرا کے قلعوں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ قدیم اور جدید دور کی کڑیاں خود انسانی زندگی کے اتحاد کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور ان دونوں کا قاطبۃً ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا یہی حال افراد کی زندگی کے مختلف دوروں کا ہے مگر پھر بھی زمانے کے اُن مختلف دوروں کا تعین ضروری ہے جن کی سرحدوں کے آپس میں تداخل ضرور پایا جاتا ہے لیکن وہ باوجود اس تداخل کے بہ حیثیت مجموعی یقیناً ایک دوسرے سے ممیز کئے جا سکتے ہیں۔

نشاۃ جدیدہ

بہت سے لوگ دور جدید کی ابتدا کو پندرھویں صدی کے نصف آخر تک پیچھے ہٹاتے ہیں، اُن کے نزدیک نشاۃ جدیدہ کا دور وہ وقت ہے جب کہ ازمنۂ وسطیٰ کی تقلیب عالم جدید

کی شکل میں ہوئی۔ ہزار برس سے زائد کی خواب کے بعد فلسفیانہ روح (خیالات) کا از سرِنو بیدار ہونا، ازمنۂ وسطیٰ کے تنظیمات و اعتقادات کے علی الرغم قدیم خیالوں اور یادگاروں کا دوبارہ زندہ ہونا، قدما کے نمونوں کی مطابقت میں پہلے سے زیادہ آزاد اور زیادہ مسرت آمیز فنونِ لطیفہ کا دوبارہ ظاہر ہونا، سب سے بڑھ کر اطالیہ میں ایسے شہروں کا عروج حاصل کرنا جنھیں موقع آنے پر پوپ کی مذہبی حکومت سے علٰحدہ ہوجانے میں کوئی باک نہ ہو، رومن قانون کا (ملکوں میں) پھیل جانا، مذہبی قانون پر اُس کا ترجیح پانا، چھاپے کا ایجاد اور مطبوعات کی اشاعت، بارود کا ایجاد ہونا اور اس کی وجہ سے طریقِ جنگ کا بدل جانا، بحری سفر میں زیادہ جسارت اور افریقہ کے سواحل اور ہندوستان میں نامعلوم ملکوں کی دریافت، اور مغرب میں ایک پورے کے پورے نئے براعظم کا پتا چل جانا، یہ تمام امور قطعی طور پر بتاتے ہیں کہ (انسان) عصرِ قدیم سے گذر کر عصرِ جدید کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ مگر یہ ازمنۂ وسطیٰ کا اختتام نہ تھا بلکہ انحطاط تھا جو عصرِ جدید کے عروج پذیر میلان کا پیش خیمہ تھا۔ نشاۃٔ جدیدہ کے وقت میں زمانے کی طبیعت میں جوانی یا بچپن کے خصائل کے بجائے پختگی کی خصلت پائی جاتی تھی۔ وہ نئی چیزوں کے پیدا کرنے کی طرف اس قدر مائل نہ تھی جس قدر پرانی چیزوں کے زندہ کرنے کی طرف اس کی کوششیں تمام تر قدیم خیالات کی تجدید اور قدیم نمونوں کی نقل کی طرف متوجہ تھیں۔ اس نے ازمنۂ وسطیٰ کی بعض تنظیمات کی اصلاح کی اور بعض کو متزلزل کردیا مگر انھیں بالکل میٹ نہیں دیا اور نہ کسی نئی چیز کو پیدا کرکے اُن کی جگہ پر قائم کیا۔ آخر میں یہ تحریک چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے حکمرانوں کی مطلق العنانی کے باعث ٹھٹر کر رہ گئی۔

اس سے بھی زیادہ کلیسائی اصلاح کا زمانہ نئے دور کی ابتدا خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود اصلاح کی وہ ناکامی کوششیں نہیں ہیں جو جرمانی شہنشاہی میں ۱۴۹۵ء کی دورھری مجلس (رائشس تاخ) میں کی گئی تھیں بلکہ اس سے مقصود سولھویں صدی کی کلیسائی اصلاح ہے جس کی تاریخ ۳۱ر اکتوبر ۱۵۱۷ء سمجھی جاتی ہے جب کہ مارٹن لوتھر نے اپنے مقالوں اعتقدات کو ڈنبرگ کے گرجا کے دروازے پر چسپاں کیا تھا۔

حقیقت میں ازمنۂ وسطیٰ کے رومن کلیسا کا اقتدار اُس وقت پوری طرح ٹوٹ گیا تھا جس کا اثر تاریخِ عالم پر پڑا اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں کی بنا مذہبی دائرۂ عمل میں حقیقۃً ایک نئی تخلیق تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی اعتقاد کے روما کی غلامی سے آزاد ہوجانے نے

علوم کو بھی مذہبی اقتدار سے مطلقاً آزاد کر دینے کے لئے ایک قومی تحریک پیدا کر دی۔ غرضکہ تخیل سلطنت کی بلندی اور اس کے اخلاقی تنزیکہ نے جدید سیاسیات کے لئے راستہ تیار کر دیا۔

تاہم جرمانی اصلاح کا اصولی خیال کسی نئی شئے کا پیدا کرنا نہیں بلکہ قدیم مذہب کو دیر استادہ خرابیوں سے پاک کرنا اور عیسائیت کی ابتدائی سادگی کو واپس لانا تھا — پاپائی کلیسا کا تاریخی اقتدار اور اس کے روایات شکست ہو گئے تھے مگر کتاب مقدس کا اس سے بھی پرانا اور ویسی ہی تاریخی اہمیت کا اقتدار پہلے سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ قائم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت مصلحان مذہب کے لئے ابتدائی عیسائیت کا واپس لانا ایسا ہی ناممکن تھا جیسا اطالیہ کے ماہران فن کے لئے ایتھنز اور روما کے قدیم فن وصنعت کا واپس لانا دشوار تھا۔ دنیا بدل گئی تھی اور قدیم خیالات اب صرف نئی شکلوں میں دوبارہ ظاہر ہو سکتے تھے یورپ کی زندگانی برابر ترقی کرتی جاتی تھی اور پروٹسٹنٹ مذہب اور نیز سلطنت جس پر اسی مذہب کا اثر پڑ رہا تھا، نسبتاً نئے مظاہر معلوم ہوتے تھے مگر خود سلطنت کا تخیل اصلاً وہی رہا جو ازمنۂ وسطیٰ کا تھا۔ سلطنت اب بھی اس دنیا کی اور اجسام مادی کی بادشاہی تھی، اور مذہب اب بھی زیادہ تر مقدس نفوس کی ایک روحانی جماعت تھی جو بہشت کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔

یہ امر کہ سولھویں صدی کی اصلاح کا تعلق نئے دور کی جوانہ کوششوں کے بجائے درمیانی دور کی انحطاط پذیر کبر سنی سے زیادہ ہے، اس کا قطعی ثبوت سنہ ۱۵۴۰ء سے ۱۷۴۰ء تک کی دو صدیوں کے خصائل میں موجود ہے۔ یہ طویل زمانہ ایک ناطرفدار مبصر کے ذہن میں نوجوانی کی نہیں بلکہ پیرانہ سالی کی تمثال کو منعکس کرتا ہے۔ پروٹسٹنٹ کلیسا تک میں ایک بےحس اور بےجان تقلید پرستی نے فوراً ہی پھر غلبہ حاصل کر لیا جس نے کسی تازہ تحریک کو آگے نہ بڑھنے دیا اور علوم کی ترقی میں رکاوٹیں ڈال کر انھیں پامال کرنا چاہا۔ کیتھولک کلیسا میں ہم یسوعی (Jesuit) فرقے کا اثر بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ فرقہ ازمنۂ وسطیٰ کی مصنوعی طور پر قائم کی ہوئی مذہبی حکومت کا علم بردار تھا زمانۂ وسطیٰ کے امرا پر شاہی مطلق العنانی غالب آ گئی اور اس نے جاگیرداری طریقے کو توڑ دیا تھا مگر پھر بھی اس مطلق العنانی میں زیادہ تر وہی قدیم روح برقرار رہی یہ خود مختار

طریق حکومت جواب تمام برّاعظم یورپ پر چھا گیا تھا اور جسے صرف انگلستان میں مقاومت کا سامنا ہوا اُس کی تائید زیادہ تر انہیں پرانے رومی اور آبائی خیالات سے ہوتی تھی جن کا اصل اصول شاہی خاندان کی حرمت تھا اور جن کی رو سے حکومت کے سارے اقتدار کو احکام مذہبی پر مبنی ہونا چاہیے تھا۔ اٹھارہویں صدی کا پر تصنع طرز (Rococo) جس نے آہستہ آہستہ نشاۃ جدیدہ کے طرز کی جگہ لے لی تھی، پیرانہ سالی کا اظہار ہے ان سب باتوں سے کسی ایسے دور کے آثار نہیں نظر آتے جس کی بنیاد ڈالی ہو بلکہ عہد وسطیٰ کی شکست و ریخت زیادہ نمایاں ہے۔

نوعمر لائب نتس پر اُس کے زمانے کے قدیمانہ رنگ کا ایسا اثر پڑا کہ اُس نے ۱۶۹۲ء میں یہ لکھا کہ "ہم بخوبی یقین کرسکتے ہیں کہ دنیا اپنے عہد پیری میں داخل ہوگئی ہے۔"

یہی اسباب ہیں اس سے بھی روکتے ہیں کہ ہم عہد جدید کی ابتدا انگلستانی انقلاب کو قرار دیں، خواہ وہ ۱۶۴۰ء کا انقلاب ہو یا ۱۶۸۸ء کا نام نہاد "شاندار" انقلاب بیشک اس انقلاب نے بھی ایک نئی شے پیدا کردی یعنی آئینی بادشاہی کی بنا ڈالدی لیکن ہم جس قدر زیادہ غور کے ساتھ انگریزی انقلاب کا فرانسیسی انقلاب سے مقابلہ کرتے ہیں، اُسی قدر ہمارا یہ اعتقاد قوی ہوتا جاتا ہے کہ وہ عہد وسطیٰ کے آخری زمانے سے اور یہ عہد جدید سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزوں کی جدوجہد زیادہ تر قدیم اینگلوسیکسن آزادی قوم اور روایتی حقوق پارلیمنٹ کے لئے بادشاہ کی مطلق العنانی کے خلاف میں تھیں، بخلاف اس کے فرانسیسیوں کی کوشش یہ تھی کہ سلطنت کی ایک نئی معقول تشکیل ہو اور ایک نئی معاشری آزادی حاصل کی جائے۔

اس لئے بہتوں کے نزدیک فرانسیسی انقلاب میں عہد جدید کی پہلی قطعی تحریک رونما ہے اور اسی لئے وہ اس دور جدید کی تاریخ ۱۷۸۹ء سے مقرر کرتے ہیں۔ یہ رائے فرانسیسیوں کے عجب وخود بینی کو بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ فرانسیسی انقلاب میں دور جدید کی روح جوشزن تھی مگر اس روح نے اپنا کام اس سے قبل ہی شروع کردیا تھا۔ "روشن خیالی" کا زمانہ جو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اُس پر دور جدید کا گہرا نقش بیٹھ چکا تھا جو دور سے نمایاں تھا۔

جدید تمدن کی تاریخ کے فاضل مصنف ٹامس بکل نے بھی بہت سے اور لوگوں کی

طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۷۶۰ء میں انسانی خیالات کی رفتار میں ایک نمایاں تغیر نظر آتا ہے
جس طرح آفتاب کی کرنیں پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں کو روشن کرتی ہیں، اور بعد کو جا کر نیچے کی
وادی میں چمکتی ہیں، اسی طرح نیا خیال پہلے بڑے آدمیوں میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر
آہستہ آہستہ عوام میں پھیلتا ہے، لیکن اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں نئی تحریک نے
نہ صرف چند منتخب سربرآوردہ اشخاص میں تازہ روح پھونک دی تھی بلکہ ہر طرف افق پر
نئے خیالات بلند ہونے لگے تھے۔ اور تغیر کی خواہش عالمگیر طور پر محسوس ہونے لگی تھی۔
لوگوں کے دل نئی زندگی کی امید سے اچھلنے لگے تھے فنون لطیفہ اور ادب میں سلطنت
اور معاشرت میں ایک بالکل نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا دنیا کے حسیات، ازمنہ وسطیٰ سے
ہٹ کر ایک جدید کائنات کی طرف قطعی طور پر منعطف ہو گئے تھے۔

اگر ہم ۱۷۶۰ء سے بعد کے حالات و اشخاص کا مقابلہ اس سے قبل کی صدیوں
سے کریں تو ہم زمانے کے خصوصیات کے وسیع تغیر سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ نہ صرف
افراد میں تغیر نظر آتا ہے بلکہ اُن کی زندگی کی ساری کیفیتیں بدلی ہوئی ہیں۔ وہ زمین جس پر وہ
کھڑے ہیں، وہ ہوا جو ان کے گرد و پیش چل رہی ہے کوئی اور ہی شے ہے ہم مثالاً کہتے ہیں
کہ پروشیا کا فریڈرک اعظم جدید سلطنت اور جدید طرز زندگی کا نہایت ہی واضح
نمائندہ ہے۔ اگر اس کا مقابلہ فرانس کے لوئیس چہاردہم سے نہیں (جو مطلق العنان
شاہی "بافضال ایزدی" کا روشن ترین قائم مقام تھا اور جس پر ازمنہ وسطیٰ کا خاتمہ ہوتا ہے)
بلکہ خود اسی کے جلیل القدر بزرگ الکٹر فریڈرک ولیم سے کیجیے یا ہسپانی حکومت
سے نیدرلینڈ کے آزادی پانے اور انگریزی حکومت سے شمالی امریکہ کے آزاد ہونے کا
باہم موازنہ کیجیے یا اگر فرانسیسی انقلاب کو انگریزی انقلاب کے مقابل رکھ کر دیکھیے۔ یا
روسو پر اولرک فون ہوٹن یا لینگ پر لوتھر کے بالمقابل نظر ڈالیے تو یہ وسیع فرق
فوراً عیاں ہو جائے گا۔

گزشتہ صدی کے وسط سے مہذب دنیا جس دور میں داخل ہوئی ہے اُس کی جدت
بعض اور باتوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے یعنی اس زمانے میں سیاسی نظریے کی غیر متیقن تلاش
اور سیاسی عمل کا تجربہ کیا جانا، ایک بالکل نئی تخلیق کے وجود میں لانے دلیرانہ کوششوں کا عمل
میں لایا جانا، اس مایوسی کا طاری ہونا جو ہر ناکامی کا پہلا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب اور رجعت کا

کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا، یہ سب باتیں اُسی نئے دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

دورِ جدید کو اگر اپنے بلوغ کا احساس اُس سے بلند تر درجے میں ہے جتنا کسی اور تاریخی دور کو کبھی ہوا ہو تو وہ خصوصیات جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ہم نے ابھی بلوغ کی پہلی ہی منزل میں قدم رکھا ہے اور ابھی تک اُس میں خامی اور نوجوانانہ بلکہ بسا اوقات طفلانہ کیفیت بالکل اُسی طرح موجود ہے جیسے ازمنۂ وسطیٰ کی آخری صدیوں میں پیرانہ سری کے آثار نمایاں تھے۔ عمر کے بڑھتے بڑھتے بڑھاپے کا آجانا ایک عضوی اور نفسی قانون ہے اور اُس کا عمل انسان کی اجتماعی زندگی کے طویل دورہائے روزگار میں محدود نہیں ہے بلکہ روزگار کے مختلف دوروں کے اندر جو چھوٹے چھوٹے زمانی فاصلے ہوتے ہیں اُن پر بھی یہ قانون ایک دورانی رفتار سے بار بار نافذ ہوتا رہتا ہے۔

پس ہم دورِ جدید کی تاریخ کو سنہ۱۷۴۰ء سے مقرر کرتے ہیں، سلطنت پروشیا کا عروج، آسٹریا میں جوزف ثانی کے اصلاحات، شمالی امریکہ میں ممالکِ متحدہ کا قائم ہونا فرانسیسی انقلاب کے تغیرات اور نپولیونی سلطنت، براعظم یورپ کے ممالک میں، انگلستان کی سی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا، نیابتی عمومیہ جس کو رواج دینے کی کوششیں، قومی سلطنتوں کی بنا قانونِ عامہ پر جو ایک مذہبی غلاف پڑا تھا اُسے اُتار پھینکنا مذہب کا سلطنت سے جدا کر دیا جانا، یا کم از کم اُن دونوں میں ہر ایک کے میدانِ عمل کی حد بندی ہو جانی، جاگیرداری طریق اور ہر طرح کے امتیازی گروہوں کے حقوق ورعایات کی تنسیخ، قومی اتحاد کے تخیل کا عروج پانا، معاشرت کی آزادی کا تسلیم کر لیا جانا یہ سب جدید اجتماعی زندگی کی اور اس لئے جدید سلطنت کی پہلی کوششیں ہیں یا پہلی تشکیل و نتائج۔

تعلیق۔ ہم نسلِ انسانی کی تاریخ کو اس کے داخلی ارتباط اور ایک معین ترتیب میں دیکھنے کے عادی ہیں، اس لئے ہم دنیا کی مختلف عمروں میں اُسی طرح فرق کرتے ہیں جس طرح ہم افراد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تمیز کرتے ہیں۔ ہم نوعِ انسانی کے زمانی مدارج کو طفولیت اور شباب سے تعبیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس کے شباب کا زمانہ قدیم یونانی اور رومی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اسی طرح ہم ازمنۂ وسطیٰ کو ایک طرف قدیم یونانیوں اور رومیوں کے نوجوانانہ اور شاندار دور سے اور دوسری جانب دنیائے جدید

کی زیادہ پختہ اور مردانہ حالت سے ممیز کرتے ہیں۔

جس طرح فرد واحد کی زندگی کا شمار برسوں اور دہائیوں سے ہوتا ہے اُسی طرح نوع انسانی کی زندگی کا شمار سیکڑوں اور ہزاروں برس سے ہونا چاہیے۔ بعض اوقات ہم خاص دوروں کے اندر بھی یہی چکر اور عمروں کے یہی مراتب دیکھتے ہیں۔ پہلے عروج کے اور پھر زوال کے مدارج نظر آتے ہیں۔ اور جس طرح تاریخ عالم کے بڑے دوروں کی ایک معیّن خصوصیت وروح ہوتی ہے، بالکل یہی حال اُن دوروں کی اندرونی قرنوں اور حالتوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل اور نصف آخر کا ئینہً ایک دوسرے سے جداگانہ طور کے ہیں اور یہی کیفیت سولھویں صدی کے اول و آخر حصوں کی ہے۔

اتحاد تاریخ میں اتحاد انسانیت داخل ہے۔

لیکن تاریخ عالم پر غور کرنے کا یہ سارا طریقہ صرف اُسی حالت میں صحیح ہوسکتا ہے کہ اول یہ فرض کرلیا جائے کہ انسانیت محض افراد کا ایک مجموعہ نہیں ہے نہ اُس کی زندگی محض افراد کی زندگی کا حاصل جمع ہے۔ اُس کا انحصار اس خیال پر ہے کہ انسانیت' (نوع انسانی) بجائے خود ایک مکمل شے ہے، اور خود اس کا ایک نشو نما ہے جو اپنی حرکت اور ترقی کے لئے ان سے وسیع تر زمانوں کا خواہاں ہے جو انسانی زندگی کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ جب ہم سیکڑوں اور ہزاروں برسوں کے پورے پورے مجموعی زمانوں پر نظر کرتے ہیں تو پھر یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم پر اس پُرزور تسلسل اور اُس معین ترتیب ترقی کا اثر نہ پڑے اور اس سے ہم نسل انسانی کے اتحاد اور اُس نوع انسانی کے آئندہ مقدر کا نتیجہ نکالتے ہیں جس کی طویل زندگی افراد کی ان چھوٹی چھوٹی زندگیوں سے بے پروا ہو کر ترقی کر رہی ہے جو بالارادہ یا بلا ارادہ اُس میں شریک ہیں۔

نسل انسانی کی مدت

اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہمیں یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ عالمگیر تاریخ میں جب نوع انسانی کا بیان ہوتا ہے اُس کی مدت عمر کیا ہے۔ یہ امر اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ انسانیت کا غیر معلوم یا قلیل المعلوم دور طفولیت نامحدود زمانے تک وسیع ہوتا جائے اور اس کی نوجوانی اور سن رسیدگی چند ہزار برسوں سے زائد نہ بڑھے دونوں میں کوئی نہ کوئی نسبت ہونا چاہیے لیکن یہ احتمال موجودہ زمانے کے طبیعی علوم کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

تخلیق عالم کی سامی تاریخ زمین کی عمر کو گھٹا کر چند ہزار برس بیان کرتی ہے لیکن زیادہ نئی تحقیق نے اُسے نہایت ہی وسیع کر دیا ہے، اور ہم اب لاکھوں اور

کروڑوں کیا اربوں سے اُس کا شمار کرنے لگے ہیں اسی قسم کی تحقیقاتوں سے نسل انسانی کے آغاز و ابتدا
کے زمانے کو ایسے وقت تک پیچھے ہٹا دیا ہے جس کا قطعی تعین مشکل ہے اور تاریخ مابعد کے
جو زمانے معلوم ہوتے ہیں اُن سے وہ بے انتہا زیادہ بعید ہے۔ کم از کم اس قدر اگر یقینی نہیں تو
اغلب ضرور ہے کہ لاکھوں برس پیشتر کچھ مخلوقات انسان کے مثل موجود تھے۔ تاریخ طبعی نے
ابتدائی انسانوں کی ہڈیوں اور کھوپریوں کے باقیات کا پتہ چلایا ہے جو اُس نامعلوم قبل التاریخ
زمانے سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ جس زمانے میں غاروں میں رہنے والے ریچھ کا پتہ چلتا ہے
طبعی تاریخ اُس ربط اور اُن تقلیبی مدارج کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے جو انسانی جسم
کو حیات حیوانیہ کے زیادہ قدیمی اجسام کے مماثل بتاتے ہیں۔ طبعی تاریخ کی رو سے یہ گمان
بھی غالب ہے کہ قبل التاریخ زمانے کا انسان اپنے موجودہ قائم مقام (انسان) کے
بہ نسبت لنگوروں اور دوسرے حیوانوں سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اس بیان سے
پہلی نظر میں تو ہمارے مشکلات بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر زیادہ غائر نظر ڈالئے تو خود
اسی بیان سے اُن مشکلات کا حل پیدا ہو جاتا ہے۔

انسانی تخلیق کی تاریخ اس قدر پیچھے ہٹا کر قائم کی جاسکتی ہے کہ وہاں تک
روایتی رائے کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تہذیب
کی تاریخ کو اور اُس تاریخ کو جسے ہم عالمگیر تاریخ کہتے ہیں۔ اس قدر پیچھے ہٹا لیجائیں۔ تاریخ
عالم اُسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جب کہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے نوع انسان کی
تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ پس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور
سے ہوتی ہے۔ یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے
ہیں یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان نمایندہ رہیں۔

تاریخ عالم کے عضوی اور نفسی نمو کے قانون کو جسمانی تناسل کے طبعی قانون
کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا چاہیئے۔ نوع انسان کا وہ مشترک احساس اور اُس کی وہ مشترک
روح اور حسیات و خیالات کے وہ ارتقائی مدارج جو انسان کے کاموں سے ظاہر
ہوتے ہیں سب کے سب اُس کی اعلیٰ فطرت سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ حیوانی خصلتوں
سے۔

ادنیٰ درجے کی انسانی نسلوں کا پہلا ظہور انسانیت کے اعلیٰ اشکال

کی مادی بنیاد تصور کیا جا سکتا ہے مگر انسانیت کی حقیقی تاریخ سے اُن ادنیٰ نسلوں کو اُتنا ہی لگاؤ ہو سکتا ہے جتنا رنگ اور موقلم کو مصور کے نقش کمال سے ہوتا ہے -

چھٹا باب

(ب) ازمنہ قدیمہ و وسطیٰ کے تصور سلطنت سے جدید تصور سلطنت کے خاص خاص فرق

ان فرقوں کا اظہار حسب ذیل صورتوں سے واضح ہو سکتا ہے:-

ازمنہ قدیمہ کی سلطنت

۱۔ قدیم سلطنت انسان کے شخصی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اسی لئے انفرادی آزادی کو بھی نہیں مانتی تھی۔ تمام قدیمی سلطنتوں میں آبادی کا کم سے کم نصف حصہ غلاموں پر مشتمل تھا۔ جن کے کچھ بھی حقوق نہیں تھے اور آزاد شہریوں کی تعداد آبادی کا صرف چھوٹا آدھا حصہ تھی زراعت مویشیوں کی پرورش، صناعت، خانگی خدمات اور ایک بڑی حد تک تجارت بھی ترجیحاً غلاموں کے سپرد ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ محنت کی کچھ وقعت نہ تھی اور محنت مزدوری کرنے والے کسی شمار میں نہ تھے غلاموں کا تعلق سلطنت سے صرف ان کے آقاؤں کے توسط سے ہوتا تھا سلطنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا نہ ان کا کوئی وطن تھا۔ غلام انسانی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم کر دئے گئے تھے البتہ رواج اکثر قانون سے بہتر تھا مگر بہتر سے بہتر صورت میں بھی ان کی واقعی منزلت غیر متعین تھی اور دفعتہ بدترین صورت میں تبدیل ہو سکتی تھی وقتاً فوقتاً غلاموں

دورِ جدید کی سلطنت

۱۔ جدید سلطنت ہر شخص کے لئے حقوق انسانی کو تسلیم کرتی ہے، غلامی ہر جگہ ظلم سمجھکر منسوخ کر دی گئی ہے یہاں تک کہ زرعی غلامی اور موروثی اطاعت کو بھی انسان کی طبعی آزادی کے خلاف سمجھکر برطرف کر دیا گیا ہے، انسان انسان کو اپنی ملک نہیں بنا سکتا کیونکہ انسان کوئی شے نہیں بلکہ ہمیشہ "شخص" (یعنی خود صاحب حقوق) ہے اس امر میں ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جس کام کو چاہے اسی کو اختیار کرے اور ہر کام باوقعت سمجھا جاتا ہے آبادی کے تمام طبقات سلطنت میں ایک سیاسی حیثیت رکھتے ہیں اور رائے دہی کا حق مزدوروں اور ملازموں تک کے لئے وسیع کر دیا گیا ہے غلاموں کی شورشوں کا خطرہ مفقود ہو گیا ہے کل سلطنت زیادہ وسیع بنیاد پر قائم ہے اس کی جڑیں تمام آبادی کے اندر پھیلی ہوئی ہیں

کی شورشیں پھوٹ پڑتی تھیں ۔ اور ظالمانہ طور پر دبائی جاتی تھیں ۔

سلطنت کے عمل کی حدود وسعت ۔

۲ ۔ سلطنت کا قدیم تخیل افراد قوم کی پوری انسانی زندگی پر حاوی تھا جس میں مذہبی، قانونی، اخلاقی، حرفتی، تہذیبی، علمی، سب حالات شامل تھے مذہبی پیشوائی بھی ایک سیاسی عہدہ تھی ۔ قدیم سلطنت نے افراد کی کامل دماغی آزادی کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا ۔

۲ ۔ جدید سلطنت اپنی طاقت اور اپنے حقوق کے حدود سے آگاہ ہوگئی ہے وہ خود کو حقیقتاً ایک قانونی اور سیاسی جماعت سمجھتی ہے، وہ مذہب اور عبادات پر حکمراں ہونے کے دعوے سے دست بردار ہے اور ان دونوں کو مذہب وافراد کی رائے پر چھوڑتی ہے، مذہبی پیشوائی ایک دینی عہدہ ہے ۔ جدید سلطنت کسی قسم کے علمی اور حرفتی اقتدار کا بھی دعویٰ نہیں کرتی، البتہ وہ علمی تحقیقات اور اظہار رائے کی آزادی کی قدر اور اس کی محافظت کرتی ہے ۔

شخصی آزادی، قانون شخصی

۳ ۔ قدیم زمانے کے انسان کو پورے حقوق صرف سلطنت کی رعایا ہونے کی حیثیت سے حاصل تھے ۔ یونانیوں میں عام قانون اور شخصی قانون کا فرق نہیں قائم ہوا تھا بلکہ دونوں قسم کے قانون آپس میں گڈمڈ تھے ۔ رومیوں نے ان دونوں کو اصولاً تو علیحدہ کیا مگر پھر بھی ان کا شخصی قانون کلیتہً قوم اور سلطنت کی مرضی پر منحصر رہا سلطنت کے مقابل میں شخصی آزادی اس وقت تک بھی تسلیم نہیں کی گئی تھی ۔

۳ ۔ موجودہ زمانے میں انسان کو انفرادی حیثیت سے حقوق حاصل ہیں ۔ قانون شخصی قانون عامہ سے بیّن طور پر ممیز ہے، سلطنت شخصی قانون کی وضع کرنے والی نہیں بلکہ اسے تسلیم کرنے والی ہوتی ہے اور اسے اپنے تابع کرنے کے بجائے زیادہ تر اس کی محافظ ہوتی ہے، آزاد شخص سلطنت میں جذب نہیں ہو جاتا بلکہ آزادانہ طور پر ترقی حاصل کرتا ہے اور اپنے حقوق کو حکمراں طاقت کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ خود اپنی مرضی کے موافق عمل میں لاتا ہے ۔

اقتدار سلطنت

۴ ۔ قدیم زمانے کی سلطنت کا اقتدار غیر محدود

۴ ۔ جدید زمانے کی سلطنت کا اقتدار آئینی طور پر

تھا۔

۵۔ صاحبان اختیار اپنے اختیارات عامہ کو براہ راست کام میں لاتے تھے۔ قدیم جمہوری سلطنت میں سارے شہری، بڑے بڑے عام جلسوں میں جمع ہوتے تھے (جنہیں یونانیوں کے ہاں اکلیسا اور رومیوں کے ہاں کومی ٹیا کہتے تھے) اور سلطنت کے اہم معاملات کا فیصلہ اُنھیں عام جلسوں میں کرتے تھے۔

۶۔ یونانی سلطنتیں درحقیقت شہروں کی سلطنتیں تھیں، روما ایک شہر ہی کی سلطنت سے ترقی کرکے دنیا کی سلطنت بن گیا تھا۔

۷۔ قدیم سلطنت میں فرائض عامہ کی تفریق اُن کی نوعیت اور اغراض کے لحاظ سے کی گئی تھی مگر پھر بھی بالعموم ایک ہی مجلس اور ایک ہی عامل مختلف النوع فرائض انجام دیتے تھے یعنی قانونی بھی اور انتظامی بھی۔

۸۔ قدیم سلطنت اگر اپنے اقتدار کو اپنے ملک کے حدود کے اندر ہی تک محدود سمجھتی بھی تھی محض تو اس وجہ سے کہ دوسری سلطنتوں کی مقاومت سد راہ تھی، نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو کسی عام بین الاقوامی قانون کا پابند سمجھتی تھی چنانچہ روما تمام دنیا پر مسلط ہو جانے کو بیباکی کے ساتھ اپنا فطری حق سمجھتا تھا۔

محدود ہے۔

۵۔ جدید سلطنت نیابتی ہے، ان عام جلسوں کی جگہ ایک نیابتی مجلس ہوتی ہے جسے اہل ملک منتخب کرتے ہیں۔ اس زمانے کی نیابتی مجلسوں کو زمانہ قدیم کی عمومی مجلسوں کے بہ نسبت قوانین کو جانچنے، تجاویز پر غور کرنے اور امور سلطنت پر قابو رکھنے کی زیادہ قابلیت حاصل ہے۔

۶۔ جدید سلطنتیں حقیقتاً قومی سلطنتیں ہیں شہر سلطنت کا صرف ایک جزو ہے اس کا قلب نہیں ہے۔

۷۔ جدید سلطنت میں مختلف فرائض کے لئے مختلف کارکن معین ہیں پس اختیارات کی وہ قدیم تفریق جس کی بنا محض اشیا پر قائم ہوئی تھی اب ترقی کرکے ایک ایسی تفریق بن گئی ہے جو فرائض کی شخصی تقسیم پر مبنی ہے۔

۸۔ جدید سلطنتیں بین الاقوامی قانون کو اپنے اقتدار و تسلط کی حد سمجھتی ہیں۔ بین الاقوامی قانون تمام قوموں اور سلطنتوں کی ہستی اور آزادی کی حفاظت کرتا اور تمام قوموں پر کسی ایک سلطنت کے عالمگیر تسلط کو مسترد کرتا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ اور دور جدید کی سلطنت کے فرق بابت خدائی یا انسانی مبداء

ازمنہ وسطیٰ اور دور جدید کی سلطنتوں کے درمیان فرق حسب ذیل ہیں :-

ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت

۱- ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت اور سلطنت کے اختیار کا مبداء خدا کو سمجھتے تھے۔ سلطنت گویا ایک تنظیم تھی جس کو خدا نے اپنی مرضی سے پیدا کیا تھا۔

۲- سلطنت کا تصور مذہبی اصول پر مبنی تھا اور یہی اصول اس کا انضباط کرتے تھے۔ اسلام جس کا تعلق تمامتر ازمنہ وسطیٰ سے ہے وہ صرف خدا کی ایک سلطنت کو تسلیم کرتا ہے جسے خدا نے سلطان کے تفویض کر دیا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کی عیسائیت، مذہب اور سلطنت کی دوگونگی کا اقرار کرتی ہے مگر یہ یقین رکھتی ہے کہ روحانی اور دنیاوی دونوں تلواریں خدا کی ہیں، اور اس نے ایک تلوار پوپ کو اور دوسری شہنشاہ کو تفویض کر دی ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے روحانی تلوار کے خیال کو منتشر کر دیا اور صرف سلطنت کی ایک تلوار کو تسلیم کیا مگر وہ بھی اس مذہبی خیال پر مضبوطی سے جما رہا کہ شاہی اقتدار خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

دور جدید کی سلطنت

۱- دور جدید کی سلطنت انسانی ذرائع سے انسانی فطرت کے تقاضے کی بنا پر قائم ہوئی ہے سلطنت حیات مشترکہ کا ایک نظام ہے جسے انسان نے انسانی اغراض کے لئے بنایا اور وہی اس کا انتظام کرتا ہے۔

مذہب و علم

۲- سلطنت کے بنیادی اصول کا تعین انسانی علوم فلسفہ و تاریخ سے ہوتا ہے۔ جدید علم السیاست سلطنت کی تشریح کرتے وقت انسان ہی سے شروع کرتا ہے، بعض اشخاص سلطنت کو افراد کی ایک جمعیت (سوسائٹی) سمجھتے ہیں۔ جو اپنے امن و آزادی کی حفاظت کے لئے باہم متحد ہو گئے ہیں، بعض اسے قوم کی ہیئتِ اتحادی کا مجسمہ سمجھتے ہیں۔

سلطنت کا جدید تخیل مذہبی نہیں ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غیر مذہبی ہے یعنی وہ سلطنت کا انحصار مذہبی اعتقاد پر نہیں رکھتا مگر وہ اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے اور حکومت عالم میں اس کی مرضی شریک ہے۔ جدید علم السیاست خدا کے طریقوں پر حاوی ہونیکا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ سلطنت کو ایک انسانی تنظیم جان کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کا منتہائے خیال قدیم ایشیائی قوموں کی طرح براہ راست خدائی حکومت کا خیال نہیں تھا بلکہ سلطنت بالواسطہ خدائی حکومت سمجھی جاتی تھی، حکمراں خدا کا نائب تھا۔	۳۔ کسی قسم کی خدائی حکومت کا خیال جدید اقوام کے احساس سے بالکل مستبعد ہے، جدید سلطنت انسان کی معین کی ہوئی آئینی تنظیم ہے سلطنت کا اختیار قانون عامہ سے مشروط ہے اور اس کے سیاسیات کی غایت المرام قوم کی بہبود (یا رفاہ عام) ہے جسے انسانی عقل سمجھ سکتی ہے اور جو انسانی ذرائع سے عمل میں آتی ہے۔
۴۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت مذہبی ملت پر مبنی اور اتحاد اعتقاد کی خواہاں تھی منکروں اور ملحدوں کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے، اُن پر ظلم ہوتا اور اُن کا استیصال کیا جاتا تھا، ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات یہ تھی کہ اُن سے تعرض نہ کیا جائے۔	۴۔ جدید سلطنت مذہب کو قانونی معیار کی کوئی شرط نہیں سمجھتی۔ قانون عامہ و قانون شخصی دونوں اعتقاد مذہبی سے آزاد ہیں جدید سلطنت آزادی اعتقاد کی حفاظت کرتی ہے اور مختلف مذاہب اور دینی انجمنوں کو امن و آشتی کے ساتھ متفق رکھتی ہے، وہ غیر مذہب والوں کو یا منکروں کو کسی قسم کا آزار پہنچانے سے باز رہتی ہے۔
۵۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مسیحی دنیا کلیسا کو روحانی اور اس وجہ سے افضل و برتر اور سلطنت کو جسمانی اور اس وجہ سے کمتر سمجھتی تھی۔ چنانچہ پیشوائے مذہبی کی حکومت یا کم از کم اُس کی ولایت بادشاہوں پر قائم سمجھی جاتی تھی مقتدایان دین کا فرقہ عام لوگوں سے بہت زیادہ بلند تھا اور ایسے خاص حقوق رکھتا تھا جن سے بعضے جرموں کے ارتکاب پر بھی سزا لازم نہ آتی تھی۔	۵۔ جدید سلطنت اپنے کو ایک شخص سمجھتی ہے جس میں روح بھی ہے (یعنی قومی روح) اور جسم بھی (یعنی آئین سلطنت) وہ اپنے کو کلیسا تک کے مقابل میں آزاد سمجھتی ہے کیونکہ کلیسا بھی اُس کے مثل جسم و روح پر مشتمل ہے اور ایک مذہبی مجموعی شخصیت رکھتا ہے۔ سلطنت مختار اور آزاد ہے اور کلیسا پر بھی اپنی برتری کو قائم رکھتی ہے۔ وہ مقتدایان دین کے تفوق کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ اُس نے اُن کے ایسے حقوق کو جن کی بنا پر وہ قانون کی پابندی سے مستثنیٰ تھے

ازمنۂ وسطیٰ	جدید سلطنت	
	منسوخ کردیا ہے اور قانون کے اختیار کو تمام طبقات پر یکساں طور پر وسیع کردیا ہے۔	
۶۔ ازمنۂ وسطیٰ میں نوجوانوں کی تربیت کا ہادی ورہبر کلیسا تھا اور علم پر بھی اُسی کا اختیار چلتا تھا۔	۶۔ جدید سلطنت نے صرف مذہبی تربیت کو کلیسا کے ہاتھ میں رہنے دیا ہے مدرسہ سلطنت کا مدرسہ ہے۔ علم دینی اقتدار سے آزاد ہے اور سلطنت اُس کی آزادی کی محافظ ہے۔	تعلیم
۷۔ ازمنۂ وسطیٰ میں عام قانون اور شخصی قانون آپس میں خلط ملط تھے۔ مملکتی اقتدار ملکیت اراضی کے مشابہ سمجھا جاتا تھا اور شاہی اختیار گویا ایک خاندانی حق تھا۔	۷۔ جدید سلطنت نے عام قانون اور شخصی قانون کو ایک دوسرے سے ممتاز کردیا ہے اور اُس نے حقوق عامہ کے ساتھ فرائض عامہ کو بھی لازم کردیا ہے۔	قانون عامہ وقانون شخصی
۸۔ ازمنۂ وسطیٰ کا رجحان زعامت (یعنی جاگیرداری طریق) کی طرف تھا۔ پس سلطنت کی طاقت کے ٹکڑے ہوگئے اور تدریجی نزول کے ساتھ یہ طاقت خدا سے بادشاہ کو، بادشاہ سے نوابوں (امرا) کو نوابوں سے جاگیرداروں (یا منصبداروں) اور شہروں کو حاصل ہوگئی تھی قانون کی تعمیر نے ایک تخصیصی نوعیت اختیار کی تھی (یعنی اُس کی بنیاد یکساں اور ہموار نہ تھی)۔	۸۔ جدید زمانے میں سلطنت قوم کی تنظیم کا نام ہے جو اپنے اختیارات کی متحدہ قوت کو ایک مرکز پر قائم رکھتی ہے۔ سلطنتیں قومی اتحاد پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کی کوشش کرتی ہیں کہ اُن میں افراد کی تعداد بہت زیادہ ہوجائے۔ قانون ایک قومی اور انسانی عضویہ ہے اور سب پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔	مخصوصیت اور مرکزیت
۹۔ نیابت، طبقات کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اشرافی طبقات یعنی پادریوں اور اعیان کو غلبہ حاصل تھا۔ قانون بھی ہر طبقے کے لئے مختلف تھا۔	۹۔ جدید سلطنت تمام قوم کی یکساں نیابت کی خواہاں ہے۔ قوم کے کثیر التعداد گروہوں کی طاقت غالب ہے۔ پس سلطنت کی بنا عمومیت پر ہے حقوق شہریت میں تمام فرقے یکساں طور پر شامل ہیں۔ قانون تمام ملک و قوم کے لئے ایک ہی ہے۔	نیابت
۱۰۔ امرا چھوٹے ہوں یا بڑے ان کی خاندانی اور	۱۰۔ جدید سلطنت تمام گروہوں میں شہریت کی	آزادی۔

طبقاتی آزادی اس درجہ محفوظ تھی کہ سلطنت کا اقتدار کمزور ہو گیا تھا، دوسری جانب کاشتکاروں کا طبقہ غیر آزاد حالت میں مقید تھا۔

۱۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت محض ایک قانونی سلطنت تھی مگر عدالت کے ذریعے سے حقوق کی پوری حفاظت نہیں ہوتی تھی اور لوگوں کو اکثر اپنے حقوق کی حفاظت خود ہی کرنی پڑتی تھی۔

حکومت اور انتظام دونوں کمزور تھے اور اُن میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

۱۲۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کو خود اپنی روح کا احساس بہت کم تھا سلطنت کی بنا شعور فطری اور رجحانات پر قائم ہوتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک خودرو چیز تھی۔ اُس کے قانون کا اصل ماخذ رواج تھا۔

عام آزادی کو ترقی دیتی ہے، اور ہر شخص کو اقتدار سلطنت کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔

۱۱۔ جدید سلطنت چونکہ آئینی سلطنت ہے اس وجہ سے وہ بھی ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کی طرح قانونی سلطنت ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ معاشی اور تہذیبی سلطنت بھی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ سیاسی سلطنت ہے۔

جدید زمانے کی سلطنت کی حکمرانی پُر قوت ہے اور اُس کا نظم و نسق قوم اور سوسائٹی کی بہبود کے نقطۂ نظر سے مضبوط طور پر قائم کیا گیا ہے۔

۱۲۔ جدید سلطنت کو خود اپنا احساس و ادراک ہے اس کے کام شعور طبعی کے بجائے اصول و عقل کے تابع ہوتے ہیں، اس کے قانون کا خاص منبع تشریع ہے

ساتواں باب

سلطنت کے مختلف نظریوں کا ارتقا

سلطنت کے تخیل اور اُس کے واقعی مفہوم کی تبدیل ہیئت میں علم السیاست[۹۲] نے بھی بہت ہی اہم حصہ لیا ہے؛ جدید سیاسی نظریہ، جدید سیاسی عمل سے پہلے وجود میں آیا عملی سلطنت کے تغیرات کی راہ میں ہر قدم پر نظریۂ سلطنت چراغ ہدایت بن کر اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ نظریۂ عمل کے پیچھے پیچھے رہا۔

نظریہ سلطنت کی علی ارتقا کے حسب ذیل اہم مراحل خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:-

نشاۃ جدیدہ

نشاۃ جدیدہ کے وقت میں سلطنت کا جو تصور بالخصوص ماکیاویلی بوڈن اور کسی قدر ہوغو غروتیئس[۹۳] کی تحریرات میں ملتا ہے؛ وہ قدیمی خیال کا بلا واسطہ نتیجہ ہے مگر اُس سے منحرف ہونا شروع ہوگیا تھا۔

ماکیاویلی

ماکیاویلی کے نزدیک سلطنت کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی ہے؛ وہ انسانی سرشت کی شریف ترین آفرینش سمجھ کر اس کا احترام کرتا اور ولولہ انگیز طور پر اُس سے الفت رکھتا ہے وہ بلا تامل ہر شے کو یہاں تک کہ مذہب اور نیک صفاتی کو بھی اُس پر قربان کر دیتا ہے مگر اُس نے سلطنت کو اس قسم کی قانونی یا آئینی سلطنت نہیں باقی رکھا ہے جیسی رومیوں کی قدیمی سلطنت تھی؛ اُس کے نزدیک قانونِ عامہ صرف سلطنت کی بہبود کے ترقی دینے اور اُس کی ترقیِ طاقت کی حفاظت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

---

[۹۲] بلنچلی کی تصنیف: "قانون ملکی اور سیاسیات کی تاریخ (میونک ۱۸۶۷ء، طبع ثالث ۱۸۸۲ء) میں علم السیاست کی اس ارتقا کا زیادہ تفصیلی بیان درج ہے۔

[۹۳] یاد رہے کہ ولندیزی زبان میں g کا تلفظ ہمیشہ خ کیا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں ح۔ (مترجم)

اُس کا تخیل سلطنت بتامہ سیاسیات سے بھرا ہوا اور اسی کے تابع ہے۔ اُس کے نزدیک سلطنت نہ اخلاقی ہے اور نہ قانونی بلکہ وہ محض ایک سیاسی شے ہے۔ پس سلطنت کے تمام کاموں کا معیار محض سود مندی ہے۔ سلطنت کی قوت اور اس کا اقتدار جس امر کا متقاضی ہو صاحب سلطنت (مدبر ملک) کو وہی کرنا چاہیئے۔ اور اخلاقی ضوابط اور قانونی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانا چاہیئے البتہ جو امر سلطنت کی بہبود کے حق میں مضر ہو اُس سے پہلو بچا جانا چاہیئے۔

میکیا ویلی کی بڑی خدمت یہ تھی کہ اُس نے علم السیاست کو دینیات سے بالکل آزاد کر دیا اور قانون عامہ اور سیاسیات کا فرق دریافت کیا مگر اس نے ایک خلاف اخلاق اور خلاف قانون طرز عمل کو سراہا ہے اور اپنی دانشمندانہ مشورت کو ظلم و جور کے تابع کر دیا ہے اور اس طرح گزشتہ چند صدیوں کے سیاسی دستور کو خراب کرنے میں مدد دی ہے۔

بوڈن، سلطنت کا مفہوم یہ سمجھتا ہے کہ "چند خاندان اور اُن کے مشترک مقبوضات کی صحیح حکومت شاہی اقتدار کے ساتھ ہو۔" وہ سلطنت کی بنا بالتخصیص خاندان مقبوضات مشترک اور اقتدار شاہی پر رکھتا ہے اور قدما کے ان سیاسی خیالات کو مورد الزام سمجھتا ہے کہ اُنھوں نے خوشحالی و کامیابی پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی۔ حکمراں کے اقتدار شاہی کے اصول سے اس نے فرانسیسی بادشاہوں کی مطلق العنانی کو علمی تقویت دیدی۔

ہوغو غروتیس ہنوز سیسرو کی تعریفات کی طرف رجوع تھا مگر پھر بھی جدید سیاسی خیالات کی طرف اس کا میلان بہت ہی بین طور پر نظر آتا ہے۔ قدما کی طرح وہ بھی سلطنت کی بنا انسانی فطرت پر رکھتا ہے مگر نسبتاً وہ بنی نوع انسان یا تمام قوم کا خیال کم کرتا ہے وہ سب سے زیادہ منفرد اشخاص پر نظر ڈالتا ہے اس کا یہ قول کہ انسان مدنی الطبع ہے ارسطو کے اس قول کا ناقص ترجمہ ہے کہ "انسان ایک سیاسی حیوان ہے۔" مگر اس سے ایک خصوصیت کے ساتھ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جدید طبائع سلطنت سے ابتدا نہیں کرتیں جیسا کہ متقدمین کا عمل تھا بلکہ افراد سے ابتدا کرتی ہیں اور اُن کے مجموعے کی طرف بعد کو توجہ کرتی ہیں، کلیسا کی مذہبی جماعت کا سلطنت کی دنیاوی اور سیاسی جماعت سے قطعی علیحدہ کر دینا اور شخصی آزادی پر زور دینا اس ولندیزی مصنف کے جدید میلان طبع کے دو مزید شواہد ہیں۔ وہ سلطنت کو "آزاد اشخاص کا اتحاد کامل بتاتا ہے جو قانون سے نفع اُٹھانے اور عام بہبود کے خیال سے باہم متفق ہو جاتے ہیں۔"

سلطنت کی شخصیت سے بھی وہ ناواقف نہیں تھا مگر اس کے سیاسی نظریئے پر اس خیال کا غلبہ نہیں ہے، عام رضامندی کو قانون عامہ کا اہم ماخذ قرار دینے سے اُس نے اُسی خیال کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے بعد کے زمانے میں نظریۂ معاہدہ کی صورت اختیار کی۔

۲۔ قانون فطرت کے نظریے اور سلطنت معاہدہ اور سلطنت ارتباط۔

قانون فطرت کے نظریہ جدید کی بنا یہی خیال معاہدہ ہے اور اُس تخمینی فلسفہ سیاسی کی بنا بھی یہی ہے جو سلطنت کے قدیم نظریات سے بالکل آزاد ہو کر قائم کیا گیا ہے فلسفی جماعتوں اور سیاسی فریقوں کے اختلافات نے رایوں میں بڑا تفرقہ ڈال دیا اور مشکل سے کوئی ایک مصنف دوسرے مصنف سے پورا اتفاق کرتا تھا، مگر فطری قانون کے متعدد بیانوں اور سلطنت کے عام تصور میں موجودہ صدی تک یہ بنیادی خیال پھیلا ہوا تھا کہ سلطنت دراصل افراد کا ایک اجتماع ہے اور اس لیئے وہ شخصی آزادی کا ایک علی الاطلاق فعل ہے (جو کسی قاعدے کا پابند نہیں) اس معاملے میں حکومت علی الاطلاق کا حامی، ہابس جس نے بادشاہ کے اختیار کو ایک بلا نوشش عفریت بنا دیا ہے، اور وہ اصول پرست خانہ برانداز روسو جس نے اُپنے قومی اقتدار اعلیٰ" کے نظریے سے سارے نظم سلطنت کے استقرار کو ایک بحث طلب مسئلہ بنا دیا ہے، دونوں ہمنوا ہیں ذہیں ساموئیل پوفن ڈورف سلطنت کو ایک "اخلاقی شخص" قرار دیتا ہے، مگر اُس کے نزدیک بھی سلطنت کی مرضی جملہ افراد کی مرضی کا مجموعہ ہے اور سلطنت کی تشریح وہ بھی معاشرتی معاہدے کے نظریہ سے کرتا ہے۔ جان لاک نے مذہبی متعصبوں کے مقابلے میں نظریۂ معاہدہ کی پرجوش حمایت کی ہے اور اُس کی نظر میں یہی نظریہ انگریزوں کی ملکی آزادی کی ایک ضمانت ہے۔ کانٹ[1] بھی اس سے آگے نہیں بڑھا ہے اگرچہ اس کا میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دائرے سے نکل جانا چاہتا ہے اور فشتے بھی اپنی سابقہ تحریروں میں اسی خیال پر قائم ہے۔

فطرتی حقوق کے تمام فلسفے کے مطابق سلطنت کی حقیقی بنا معاہدے اور اجتماع پر

---

[1] دیکھو کانٹ کی تصنیفات (مرتبہ روزن کرانتس)، جلد ۷، صفحہ ۱۹۷:۔
تمام معاشرتی معاہدات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی خاص غرض کے لیئے بہت سے لوگ متحد ہو جاتے ہیں مگر ایسا اتحاد جو فی نفسہ مقصود آخری ہو وہ صرف تنظیم معاشرت ہی میں پایا جاتا ہے مگر اُسی حد تک جہانتک کہ نظم معاشرت ایک مجموعی حیثیت رکھتا ہو۔

اگر قدیم فلسفیوں نے افراد کے حقوق پر کافی توجہ نہیں کی، تو جدید فلسفیوں نے اُن کے برعکس یہ غلطی کی ہے کہ انھوں نے انفرادی حیثیت کو اتنا بڑھایا کہ سلطنت کی مجموعی ہستی سے غافل ہو گئے۔

فطری قانون کی بنا پر جو نظریہ سلطنت معاشری کا قائم ہوا تھا، اسے دورِ جدید میں اگر عام مقبولیت حاصل ہو سکی۔ اور اسی دور میں اُسے عمل میں لانے کی کوشش کی گئی، بن ۱۷۸۹ء سے قبل کی دو صدیوں کے خود مختارانہ رنگ طبیعت کو ایک ایسا ہی نظریۂ سلطنت پسند آسکتا تھا جس میں سلطنت کی بنیاد اقتدارِ اعلیٰ پر رکھی ہو۔ اُس زمانے میں اس بات کے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ خود اقتدارِ اعلیٰ کا ماخذ کہاں ہے۔ کبھی تو لوگوں کو کلیسا کے اس روایتی اعتقاد سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ حکومت کی تلوار خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے، اور کبھی وہ اس پشتینی روایت کی طرف مائل ہو جاتے تھے کہ امیر یا حکمراں ملک کا مالک اعلیٰ ہے لیکن اس اثنا میں ان قدیمی معتقدات میں تغیر ہوتے رہا۔ کچھ تو اقتدارِ اعلیٰ میں قانونِ عامہ کی خصوصیت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اور کچھ عام بہبود پر لحاظ کرنے کی ضرورت سے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس طرح سلطنت کی نسبت یہ خیال پیدا ہو چلا کہ کسی بالاتر شخص کی حکمرانی کے دائرۂ عمل کا نام ہے، اور اقتدارِ اعلیٰ واقعتاً سلطنت کے ہم معنی ہو گیا (جیسا کہ لوئس چہاردہم کہا کرتا تھا کہ "میں ہی سلطنت ہوں") اس خود مختاری کے نظریۂ سلطنت کا بنیادی خیال یہی تھا جسے بوڈن اور ہابس نے تیار کیا اور جسے بالتخصیص فلمر (انگریز) اور بوسیویت (فرانسیسی) کے توسط سے مذہبی رنگ میں ترقی حاصل ہوئی اور سیکڑوں مختلف طریقوں سے اسی ایک خیال کی تعلیم ہوتی رہی۔ اقتدار کی اس یک طرفہ بحث میں بالطبع محکوم کی آزادی اور اس کے حقوق بالکل نظر انداز کر دیے گئے تھے جس طرح رومن کیتھولک کلیسا اپنی ہستی کا لب لباب صرف فرقۂ مذہبی کو اور اُس کے سرگروہ پوپ کو قرار دیتا ہے اور دنیا داروں کو بھیڑوں کا گلہ سمجھتا ہے جس کی ہدایت و خبرگیری (اور اس سے انتفاع) مذہبی گلہ بانوں پر موقوف ہے، اُسی طرح اس نظریۂ سلطنت کے موافق صرف حکمراں اور عہدہ دارانِ حکومت ہی ایک حیثیت رکھتے ہیں اور رعایا محض ایک مطیع و منقاد گروہ ہے، جس پر حکومت کرنا طبقۂ بالا کا کام ہونا چاہیے اور خود رعایا کو اپنے انتظام یا حکومت میں شریک ہونے یا حکمرانوں کے اطوار کی نگرانی کا کوئی حق نہیں ہے۔

سلطنت؛ بحیثیت قانونی سلطنت کے

کانٹ اور ول ہیلم فون ہمبولٹ نے سلطنت کو جو اس مفہوم میں ایک قانونی سلطنت بتایا کہ اُس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ ہر شخص کے قانونی حقوق کی حفاظت کو برقرار رکھے اس دعوے سے اُن کی پہلی غرض اُس وسعت کو تنگ کرنا تھا جو نظریۂ قانونِ فطرت اور نظریۂ اقتدار دونوں کے بموجب حکومت کو حاصل ہو گئی تھی مگر فشتے نے در حقیقت اپنی توضیح سلطنت میں ان تنگ حدود کو توڑ دیا کیونکہ اس نے معاشیات کو بھی سلطنت کے ساتھ مربوط کر دیا بلکہ معاشی سلطنت کی طاقت کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا اور اپنی زندگی کے آخر زمانے میں جرمانیا کی آزادی کے قومی جوش سے متاثر ہو کر اُس نے سلطنت کی طرف اس سے بھی برتر روحانی فرائض منسوب کر دیے مگر اُس سے اگلی پشت کے اکثر جرمانی فلسفی اور مقنن اس نظریہ سے متعلق کانٹ ہی کے تنگ مفہوم پر قائم رہے۔

قانونی سلطنت بمقابلۂ احتسابی سلطنت

یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ یہ خیال بہت سے ایسے لوگوں میں مقبول ہو گیا جو اُس زمانے کی حکومت کے خبط سے اور کوتوالی اور فوج کی بے لگام کارروائیوں سے پناہ ڈھونڈتے تھے مگر جو لوگ "قانونی سلطنت" کو احتسابی (یا کوتوالی) سلطنت کا مقابل قرار دیتے تھے اور جن کے نزدیک زمانۂ جدید کا یہ فرض ہے کہ وہ کوتوالی سلطنت کو ہٹا کر اُس کی جگہ قانونی سلطنت قائم کرے اُنھوں نے صاف طور پر یہ نہیں سمجھا تھا کہ سلطنت کیسی وسیع چیز ہے۔ سلطنت کو خالص قانونی سلطنت، بنا دینا ایسا ہی ناموزوں ہے جیسا اُسے صرف "کوتوالی سلطنت" بنانا نازیبا ہے اگر سلطنت کی تدوین یک طرفہ طور پر کر کے وہ "قانونی سلطنت" بنا دی گئی تو وہ بالآخر محض انصاف رسی کی ایک تنظیم ہو کر رہ جائے گی جس میں قانون وضع کرنے والی قوت کی جانب سے قانونی قواعد مقرر کر دیے جائیں گے اور اختیارِ عدالت ان کی حفاظت کرے گا اور انہیں منفرد حالتوں پر عائد کرے گا اور حکومت کی کارفرمائی کے لیے اس کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا کہ وہ قانونی عدالتوں کی خادم یعنی اہلکار کوتوالی بن جائے اقتصادی اغراض، تعلیم تہذیب اور قومی قوت کا نشو و نما سب اُس مپرسی کی حالت میں پڑ جائیں گے اور ملک کی حکمت عملی میں کسی قسم کی عظمت و رفعت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے برعکس "احتسابی سلطنت" کی یک طرفہ تدوین انجام کار میں ہر قسم کے انفرادی حق[1] اور آزادی کو ان مقاصد پر قربان

[1] مقابلہ کیجیے مقالہ ہفتم باب سوم۔ یہ عیاں ہے کہ بلنچلی کی "قانونی سلطنت" کا مفہوم وہی ہے جسے انگلستان میں (بقول پروفیسر بلیک اسٹیل تنقید ہربرٹ اسپنسر) انتظامی احدامیت "یا لاحکمیت مع پولیس" کہا گیا ہے۔ پس یہ اس سے بالکل مختلف ہے جسے بلنچلی "احتسابی سلطنت" کہتا ہے جس کا مفہوم وہ ہے جیسے "دادی جان کی قانون سازی" کے نام سے بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ زیادہ حال کے بعض جرمانی مصنفین نے "قانونی سلطنت" کا لفظ محض آئینی حکومت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یہ وہ حکومت ہے کہ آئین اور جو کچھ بھی ہو مگر وہ قانونی کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ مقابلہ کیجیے ہولز تدارف: اصول سیاسیات (طبع دوم) صفحات ۲۱۳ - ۲۱۴

کردے گی جو مجموعۃً مفید معلوم ہوں گے، اور آزاد شخصوں پر ناقابل برداشت حد تک تولیت قایم کردے گی۔
پس اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا جائے کہ (۱) سلطنت صرف ایک تنظیم ہے جس کا فریضہ افراد کے حقوق کی حفاظت ہے تو پھر سارا قانون عامہ محض ایک ذریعۂ قانون شخصی ہی کا رہ جائے گا اور سلطنت افراد کے ذاتی خادم کی حیثیت تک تنزل کر جائے گی۔
اور اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا جائے کہ (۲) سلطنت کا کام قوم کے حقوق کو منتظم کرنا اور اس کے ساتھ افراد کے حقوق کو تسلیم کرنا ہے تو یہ ایک بالکل صحیح مگر غیر مکمل رائے ہے کیونکہ اس میں مدبران سلطنت کے سب سے زیادہ نتیجہ خیز ساعی یعنی قوم کی مادی بہبودی اور اس کی دماغی ترقی کی فکر کرنے کے کام کلیتہً نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔
یا (۳) اگر یہ سمجھا جائے کہ سلطنت کا کام عملاً فوائد عامہ کو ترقی دینا بھی ہے مگر ضابطے کی رو سے اُسے صرف اُس حد تک جبر کرنے کا اختیار ہے جس قدر کہ کسی قانونی ضرورت کے لئے درکار ہو تو اس خیال کے خلاف مشکل سے کچھ کہا جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سے سیاسی کارفرمائی کا صرف ایک پہلو متعین ہوتا ہے اور مفاد عامہ کے معاملات مثلاً اشیائے خوردنی کی بہم رسانی، تجارت اور عام تمدن کے حالات سے کچھ اعتنا نہیں کیا گیا ہے حالانکہ یہ سب انھیں قانونی حدود کے اندر آزادانہ طور پر جاری ہیں اور ان کے لئے جبر کی کسی شکل کے اختیار کرنے کی حاجت نہیں ہے۔
اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا گیا ہے کہ (۴) سلطنت کی مذہبی بنا سے انکار اور اس کے انسانی بنا رحدود کا اقرار کیا جائے یا یہ کہ (۵) ہر قسم کے اقتدار علی الاطلاق اور شورونی سلطنت سے جس میں اکثر جا بیجا پولیس کی مداخلت بھی شامل ہو جاتی ہے مقاومت کی جائے اور اس امر کا دعویٰ کیا جائے کہ معاملات عامہ میں اہل ملک کو شریک کرنا چاہئے تو اس سے "جدید سلطنت" کے خصوصیات ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے طریق اظہار اس کے لئے ناموزوں واقع ہوا ہے۔ اسے "آئینی سلطنت" کہنا زیادہ مناسب ہے۔
جس طرح سلطنت کے دو پہلو ہیں، سکون اور حرکت، قایم رہنا اور نشو و نما پانا، ہم اور ربع اور اس داخلی اعتبار کے حسب حال دو علوم سیاسیہ ہیں "قانون عامہ" اور "سیاسیات"
اُسی طرح دو مہتم بالشان اصول سلطنت بھی ہیں جو دو روشن ستاروں کے مانند سلطنت کی

زندگی کو بنانے اور اُسے بارآور کرتے ہیں اور جو سلطنت کی صوریت اور معنی دونوں کو متشکل و متعین کرتے ہیں۔ یہ دو مہمات اصول، معدلت گستری اور بہبود عامہ ہیں۔ بہبود عامہ بالخصوص مدبرین کے پیش نظر ہوتا ہے اور معدلت گستری پر مقنن کی نظر رہتی ہے۔ خیال عدل، قانون عامہ کا تعین کرتا اور خیال بہبود سیاسیات کی رہبری کرتا ہے۔

حکومت کا اشتغال اگرچہ حدود قانونی ہی کے اندر رہے مگر اس کا تعلق زیادہ تر بہبود عامہ سے ہوتا ہے۔ اہل روما جن کی قوم سیاسی اعتبار سے بہترین قوم تھی انھوں نے بہبود عامہ کی خبر گیری کو اپنے اعلیٰ ترین حکام کا مقدم فرض قرار دیا تھا، عدالت قانونی کے مشاغل قانون کے برقرار رکھنے تک محدود ہیں لیکن سلطنت اگر اپنی زندگی و خوش حالی کی خواہاں ہے تو اسے بہبود عامہ، قانون دونوں پر مسلسل توجہ رکھنا چاہیے، نیز بہبود عامہ کی ضروریات ہی جدید سلطنت ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کے بہ نسبت بہت زیادہ توجہ کرتی ہے اور اس لئے سابق الذکر آخر الذکر کی بہ نسبت "قانونی سلطنت" کی حیثیت کم رکھتی ہے۔

۵۔ فرقہ مورخین، سلطنت کا نظریہ عضویت

یہ فخر فرقۂ مورخین ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے سلطنت کے عضوی خصوصیات کا از سر نو احساس کیا، بعض بڑے بڑے مدبروں نے تو سلطنت کی عضوی حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا تھا چنانچہ پروشیا کے فریڈرک اعظم نے اپنی تصنیف "انٹی ماکیا ویل" (یعنی ماکیاویلی کے رد) میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ "جس طرح سے انسان پیدا ہوتے، ایک عرصے تک زندہ رہتے اور پھر کسی بیماری سے یا بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں، اسی طرح سلطنتیں بھی وجود میں آتی، چند صدیوں تک پھلتی پھولتی اور پھر برباد ہو جاتی ہیں" مگر اہل فن نے اس خیال کے ساتھ اس وقت اعتنا کیا جب فرقۂ مورخین نے اس کی تجدید کی تو وہ ایک نئی تحقیقات معلوم ہونے لگی اور علم السیاسیات کے ارتقا نے آیندہ کے لیے ایک بالکل نیا اور زیادہ حاصل خیز راستہ اختیار کیا ہے اثنا میں فرقۂ مورخین تصور سلطنت کو ضرورت سے زیادہ قومی رنگ میں لانے کی طرف مائل رہے اور اس کی بلند تر انسانی اہمیت کو انھوں نے نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ اس کے ماننے سے انکار کرتے رہے چنانچہ سوی نی نے صاف یہ لکھا ہے کہ "سلطنت قوم کے اجتماع روحی کی مجسم شکل یا قوم کا عضوی مظہر ہے"[1] مگر ایک

---

[1] سوی نی:۔ رومیوں کا نظام قانون Savigny System (Lesromischen Rechtes) ج ۱۔ ص ۲۲

ممتاز انگریز اڈمنڈ برک نظریات انقلاب کے خلاف بحث کرتے ہوئے تاریخی سلطنت کو دنیا کی "ترتیب خداوندی" کی روشنی میں لایا۔ اپنی تحریر (فرانس کے انقلاب پر اظہار خیالات) میں ایک مشہور فقرہ اس نے یہ لکھا ہے کہ "نظم معاشرت فی الواقع ایک طرح کا معاہدہ ہے، محض وقتی ضرورت کی اشیاء کے لئے جو معمولی اور ضمنی معاہدے ہوتے ہیں وہ حسب مرضی منسوخ کئے جا سکتے ہیں مگر سلطنت کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کالی مرچ، قہوے، چھینٹ یا تمباکو یا اسی قسم کی ادنیٰ درجہ کی چیزوں کی تجارت کے معاہدۂ اشتراک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جو کسی ادنیٰ اور عارضی غرض سے قائم کیا جاتا ہے اور فریقین کے دل میں جب خیال آجائے وہ اسے برطرف کر سکتے ہیں۔ سلطنت کو ایک دوسری ہی طرح کے احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ وہ اُن چیزوں کا اشتراک نہیں ہے جو کیفیت حیوانی ہستی کے لئے عارضی و فنا پذیر قسم کی ہوا کرتی ہیں بلکہ ہر طرح کے علم، ہر طرح کے فن، ہر طرح کی نیک صفاتی، ہر طرح کی تکمیل کا اشتراک ہے۔ چونکہ اس قسم کے اشتراک کے اغراض کئی نسلوں میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے یہ صرف اُن لوگوں کا اشتراک نہیں رہتا جو الحال زندہ موجود ہیں بلکہ یہ ایک اشتراک ہے اُن لوگوں کے درمیان جو اس وقت زندہ ہیں اور جو مر گئے ہیں اور جو آنے والے ہیں۔ ہر ایک مخصوص سلطنت کا ہر ایک معاہدہ دائمی نظم معاشرت کے عظیم و وسیع ابتدائی معاہدے کی ایک دفعہ ہے۔ یہی وہ دائمی نظم معاشرت ہے جو مرئی اور غیر مرئی دنیا کو مربوط کرتا ہے جو ایک معین عہد و پیمان کے ذریعے سے (جسے اس ناقابل الفسخ حلف کی منظوری حاصل ہے جو جملہ طبعی و اخلاقی ہیئتوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم کئے ہوئے ہے) ادنیٰ فطرتوں کو اعلیٰ سے اور مرئی دنیا کو غیر مرئی دنیا سے مربوط کرتا ہے۔

سلطنت کا یہ تصور اس سے بدرجہا زیادہ بلند ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے اصول کے موافق ممکن تھا کہ سلطنت کا تعلق کلیسا (مذہب) سے ویسا ہے جیسا جسم کا تعلق روح سے۔

لیکن فرقۂ مورخین نے سلطنت کو اس حالت میں دیکھا جو قائم ہو چکی تھی، صرف گذشتہ پر نظر کرنے سے اُن پر قدیم زندگی کے مناظر کا ایسا قوی اثر پڑا کہ ان میں سے بہتوں سے موجودہ حالت کا ادراک اور حالات عامہ کو ترقی دینے کا میلان ہی جاتا رہا۔ نظریۂ قانون طبعی کے موئدوں پر بکثرت یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے سلطنت کو افراد کی خود کامی کا کھلونا بنا دیا ہے، اسی طرح فرقہ مورخین پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے تصور سلطنت کو روایتی اقتدار اور موروثی تعصبات سے سخت جکڑ بند کر دیا ہے۔

۶ موجودہ زمانے کا جرمانی فلسفہ سیاسی - ہیگل -

اگرچہ فرقۂ مورخین کی تصنیفیں کم و بیش خاص ہی خاص سلطنتوں کی قانونی اور سیاسی تاریخ تک محدود ہیں پھر بھی اس جدید تحقیقات سے فلسفۂ تخمینی کو بھی نفع پہنچتا ہے۔

ہیگل تک نے اپنے نظریۂ قانون میں سلطنتوں کی تاریخ تکوین پر اُس سے زیادہ توجہ کی ہے جتنی اُس سے پہلے فطری قانون کے نظریے کے ماننے والوں نے کی تھی۔ اُس نے یہ ضرور سمجھا کہ دنیا کی تاریخ میں اُسے ایک منطقی طریقۂ استدلال مل گیا ہے "ہستی موجود ہی اُسے قرین عقل" معلوم ہوئی۔ اُس کے نظریے نے اُس وقت کی سلطنت پر دسیا کو آسمان پر چڑھا دیا جس کی حکومت ہنوز مطلق العنان تھی گو کہ فہم الکل عامہ کا احساس بھی پر دسی حکومت میں شامل تھا۔ اس نے شاہی طاقت کی حمایت کی اور آئینی آزادی کی کچھ پروا نہیں کی لیکن اس نے سلطنت کی اخلاقی اہمیت پر زور دیا اور اس لغو خیال کے علی الرغم کہ سلطنت صرف ایک لابدی خرابی ہے، اس نے سلطنت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی کہ "سلطنت "حق" کے تخیل کی بلند ترین اور شریف ترین تشکیل ہے۔

باایں ہمہ ہیگل کی سلطنت ایک منطقی تفرد ہے، کوئی زندہ عضویہ نہیں ہے، وہ محض ایک منطقی تصور ہے، کوئی شخص نہیں ہے۔ ہیگل[1] نے سلطنت اور قانون کی بنا محض عرضی پر قائم کرنے سے اس حقیقت نفس الامری کو نظر انداز کر دیا ہے کہ سلطنت محض مجموعی انسانی عرضی ہی کی عاطلانہ صورت نہیں ہے بلکہ وہ انسانی طبیعت و احساس کی تمام قوتوں کی جامع ہے۔

اشٹال

فریڈرش - ی - اشٹال جو ہیگل کے بعد برلن میں فلسفیانہ نظریۂ سلطنت کا سب سے زبردست نمائندہ تھا اس نے نظریۂ "قانون فطرت" کے ماننے والوں اور نظریۂ ہیگل کے خلاف جوش اور سلیقے کے ساتھ بحث کی، اُس نے رجحان تاریخی کو شیلنگ کی متخیلی تخمین سے ملا دینے کی کوشش کی۔

اشٹال نے اپنی مناظرانہ اور نقادانہ قابلیت سے نئے نکات پیدا کر کے اور اپنی

---

[1] ہیگل اپنی تصنیف Rechtsphilosophie (فلسفۂ قانونی) فقرہ ۲۵۷ میں لکھتا ہے کہ سلطنت اخلاق کے تصور کی تشکیل ہے۔ یہ اخلاقی روح ہے جو ارادی آزادی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، وہ خود اپنے تئیں جانتی ہے صاحب فکر و علم ہے اور جن امور کا اُسے علم ہے اور جو کچھ وہ جانتی ہے اُس کی تکمیل کرتی ہے مقابلہ کرو ہیگل کی کتاب فلسفۂ تاریخ سے (مترجمہ سیبری) صفحات ۴۰ - ۴۳ -

دقت نظر سے اکثر مبہم بیانات کو واضح کر کے علم السیاست میں مختلف طریقوں سے ترقی دی مگر اور اعتبارات سے اس نے اپنی تاریخی قابلیت کی کمی اور کسی قدر بے تبدل سوفسطائیت کے باعث جدید کلیات کو چھوٹے بڑے مطلق العنان حکمرانوں کے افسانہ وار توہمات کے تابع کردیا جس سے فن کو بہت نقصان پہنچا۔ اشٹال سلطنت کو ایک اخلاقی و ذہنی مملکت، یعنی ایک منتظم مشترک ہستی کے لئے ایک گروہ کا اتفاق" سمجھتا ہے بالفاظ دیگر ایک پرشوکت و عظمت اخلاقی اقتدار و قوت کا قائم ہو جانا جس کے سامنے تمام رعایا سر تسلیم خم کردے، اُس کا تصور سلطنت ہیگل کے تصور سے زیادہ جاندار ہے۔ اُسے یہ بھی تسلیم ہے کہ سلطنت کی حکمرانی "عام اغراض تک محدود ہے" اور اس طرح وہ اپنے تئیں قدیم سلطنت کے غلو سے بھی بچاتا ہے مگر پھر بھی عہد نامۂ عتیق کی حکومت مذہبی کا اثر ایک لال ڈورے کی طرح اُس کے تمام نظریۂ سلطنت میں دوڑ گیا ہے جس سے اُس کا نظریۂ جدید یورپی دنیا کے لیے بالکل ناقابل قبول ہو گیا ہے۔ سلطنت کی طاقت کے لیے ربانی یا فوق الانسانی عظمت کا ہونا انسانی و ملکی آزادی کے ساتھ ہمنوا نہیں ہو سکتا۔

جرمنیا میں فلسفیانہ اور مورخانہ فرقوں کی قدیم جنگ کلیتہً بند ہو گئی ہے سنہ ۱۸۴۲ء کے بعد ہی دونوں میں صلح ہو گئی تھی اُس وقت سے ہر طرف یہ مسلم ہو گیا ہے کہ تاریخ کے تجربات و مشاہدات کو تفکر کی شمع سے روشن کرنا چاہیئے اور تخمین اگر قوم کی زندگی کے حقیقی حالات کا لحاظ نہیں کرتی تو وہ محض طفلانہ توہم ہے۔ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تلافی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں طریقوں کے اتحاد سے مختلف مصنفوں کی رایوں کا تنوع محو نہیں ہو سکتا کیونکہ طبیعتوں کا اختلاف ایک فطری چیز ہے بعض مصنفوں کا رجحان فلسفے کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور بعض کا تاریخ کی طرف۔

جدید علم السیاست کی ایک دوسری خصوصیت وہ زیادہ دقیق تنقید ہے جس سے نہ صرف واقعات کی تنقیح میں بلکہ واقعات سے نتائج کے اخذ کرنے میں اور مفہومات کی تشکیل میں بھی کام لیا جاتا ہے اس قسم کی تنقید میں سلطنت پر نہایت ہی مختلف پہلوؤں سے نظر کی جاتی ہے سب سے زیادہ سربرآوردہ مصنفوں میں سے چند کا نام لیا جا سکتا ہے۔ روبرٹ فون مول کی تصنیفیں بیشتر ادبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں مگر ساتھ ہی اُن میں علمی فائدہ مندی کا لحاظ ہوشمندانہ اور عاقلانہ طور پر رکھا گیا ہے الکسس دی توکے ول جا ہے امریکہ کی جمہوریت کا بیان

کر رہا ہو یا انقلاب فرانس کا قدیمی سلطنت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہو یا انگریزی حکومت اعیانی کی حالت دکھاتا ہو ہر موقع پر وہ سیاسی زندگی کی حرکت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ہرن ایوٹ فوس کی تحریریں اُن بدگمانیوں سے متاثر ہیں جو جدید خیالات کی طرف سے پھیلی ہوئی تھیں جان اسٹوارٹ مل معاملات عامہ پر تجریدی منطق کے اصولی نقطۂ نظر سے بحث کرتا ہے مگر اسکی انگریزی سرشت وطینت نے اس میں گونہ اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ ٹامس ہکسلی علم طبعی کے طریقوں سے نظریہ سلطنت میں کام لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کے مطابق سلطنت کی زندگی کی تشریح کرے۔

تاریخی تنقید۔ دوسرے مصنفوں نے تنقید کی نوعیت کلیتہً مورخانہ کر دی ہے جیسے گنائیسٹ نے کیا ہے جو انگریزی آئینی تاریخ پر خاص سند ہے۔ یہی حال ایڈورڈ لابولی کا ہے جس نے امریکی نظام سلطنت پر نہایت شوق کے ساتھ لکھا ہے، ہائن ریش فون ترائچکے جس نے سب سے اول پروسی شاہی کی اہمیت ظاہر کی وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہے لورنتیس فون اشٹائن بھی اسی طریق کا پیرو ہے مگر وہ خاصکر انتظامی جزئیات میں مشغول ہو گیا ہے۔

مقننانہ طریق۔ گیر بر کے نسبتاً نئے طریق میں تنقید نے بالخصوص مقننانہ نوعیت حاصل کر لی ہے یہ طریقہ جو تجریدات اشکالیہ کے ذریعے سے ترقی کی رفتار کو روک دینے کی طرف مائل ہے اس کے بہت سے شاگردوں کی تحریروں میں مضر حد تک پہنچ گیا ہے۔

نفسیاتی طریق۔ دوسری جانب جو لوگ نفسیاتی طریقے پر سلطنت کے متعلق غور کرتے ہیں، وہ سلطنت کی زندگی کو انسانی طینت کے خواص واشکال کے مطابق زیادہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں، اس طریقے میں طریقۂ سابق کے مخالف خطرہ پیدا ہوتا ہے یعنی سیاسیات کی حرکت قانون کے معینہ ویقینی تسلط پر کافی لحاظ نہ کرے بلکہ اسے مضطر ومبدل کر دے۔

تقابلی طریقہ۔ طریق تقابلی جو زیادہ اہم سلطنتوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں لاکر غور کرتا ہے وہ حال کے میلانات کے موافق ہے۔ جن مصنفوں کا ابھی ذکر ہو چکا ہے ان میں سے بہتوں نے اس طریق کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، عام نظریہ سلطنت کے لئے یہ طریقہ لابُد و ضروری ہے۔

قومی نظریہ سلطنت۔ سب سے آخر امر یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جب میں قومی سلطنتیں قائم کی جارہی ہیں

نظریۂ سلطنت قطعی طور پر سلطنت کی قومی خصوصیت کے متعلق بہ نسبت سابق کے زیادہ زور دیتا ہے۔ اٹلی اور جرمانیا کے اپنے اپنے قومی اتحاد پیدا کرنے کی کوششوں سے پہلے فرائی برگ میں ولکر، نیوبارک میں فرانٹس لی برگنٹ میں فریڈرک، لورین، تستیبورش اور میونک میں بلنچلی نے نظری حیثیت سے اس میلان کی پیروی کی ہے۔ اہل اطالیہ کا نوبیدار علم السیاست اپنے جوانانہ جوش میں سلطنت کو قومی بنیاد پر قائم کرنے کے مسئلے کو بہت خاص نمود کے ساتھ زیر بحث لایا، ابتداءً یکطرفہ جذبات کا بھی اظہار کیا، اس خیال کے ممتاز ترین حامی روما میں من چینی اور پادسے لیتی اور نیپلیز میں پیرانتو لی ہیں جرمانیوں کی طرح اطالوی بھی اپنے تصانیف میں مورخانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو متحد رکھتے ہیں۔

تعلیق: ابھی تک سلطنت کے عضوی یا بہتر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کی نفسیاتی و انسانی حقیقت کا ادراک و افہام بہت کم ہوا ہے جس طرح بہت سے لوگ ہیں جن میں تعلیم یافتہ اشخاص بھی شامل ہیں کہ اُن کے کان موسیقی سے آشنا نہیں ہوتے یا تصویر اور نقاشی کے حسن کا مطلقاً احساس نہیں رکھتے، اسی طرح بہت سے ذی علم اشخاص ہیں جو کسی شے کے متعلق حیاتی یا نفسیاتی غور و فکر سے بالکل معرا ہیں ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ کوئی شخص اپنے طبعی خصائل کے خلاف نہیں چل سکتا مگر ان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ جس شے کو وہ نہیں سمجھتے اُس پر حکم لگانے سے باز رہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو صرف یہ ہوگا کہ ان کی کوتاہی کے ساتھ ان کی خود بینی کا بھی اظہار ہوگا۔

عضوی طریقے کے اولیں پیشرووں میں ایک فریدرش اشٹہیر بھی تھا جس نے سلطنت کو ایک "اخلاقی عضویت" قرار دیا اور اس کا مقصد یہ بتایا کہ انسان کی ظاہری زندگی اور قانون اور بہبود عامہ اور تعلیم و تہذیب کے عام معاملات کو اپنے ذمے لے۔

نظریۂ سلطنت کو تمام قوموں کی نفسیات پر مبنی کرنے کی ایک بے مثل ہی قابل یادگار کوشش فولگراف نے کی (اس نے ۱۸۵۳ء میں ایک کتاب تین حصوں میں شائع کی جس کا نام ہے "عام علم الاقوام کی علم الانسان کے ذریعے سے اور فلسفہ سیاسیات و قانون کی علم الاقوام یعنی اقوام کی قومی خصائص کے ذریعے سے تشریح کی پہلی کوشش"۔ یہ تصنیف پہلی کوشش ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور اس اعتبار سے وقعت کی مستحق ہے مگر نفسیاتی طریقے کی قدر و منزلت قائم کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے اس میں تو قوائے ذہن انسانی کا بیان قابل اطمینان ہے اور نہ مختلف طبائع کا اندازہ درست ہے اور جو معتدبہ تاریخی مواد جمع کیا گیا ہے اور

مشاہدات سیر و سیاحت کے تجربات کا بڑا حصہ اس درجہ غیر تنقیدی ہے اور اس درجہ خالص
اور وہمی تصویروں سے ملا ہوا ہے کہ اس کی صحت کا اثر دل پر نہیں پڑتا۔

آرنیبس

فلسفہ کراؤزے کی پیروی میں آرنیبس نے ایک کتاب بنام "عضوی نظریہ سلطنت"
لکھی ہے (- آرنیبس: عضوی نظریۂ سلطنت پہلی جلد۔ ویانا ۱۸۵۰ء) مگر سلطنت سے
عضویہ سے وہ اس درجہ ایک زندہ اور شخصی مجموعی وجود مراد نہیں لیتا جس قدر وہ اسے قوم
کے لیے "قانون کی ایک عضوی تنظیم" سمجھتا ہے۔

وائٹیس

وائٹیس (پالٹک ۱۸۶۲ء جلد ۱ باب ۵) کہتا ہے کہ سلطنت کوئی ایسی شے نہیں
ہے جو حسب مرضی قائم کر لی جائے یہ نہ تو لوگوں کے معاہدہ باہمی سے پیدا ہوتی ہے نہ ایک
یا زائد افراد کی قوت سے وجود میں آتی ہے سلطنت مثل ایک عضویے کے نمو پاتی ہے
مگر نہ محض طبعی زندگی کے قانون کے موافق اور نہ محض اس زندگی کے اغراض کے لئے بلکہ
اس کی بنیاد انسان کے اعلیٰ تر اخلاقی رجحانات پر قائم ہے اور وہ اخلاقی خیالات کے حصول کا
ایک ذریعہ ہے پس وہ ایک طبعی نہیں بلکہ ایک اخلاقی عضویہ ہے سلطنت قوم کی عضوی تنظیم کا نام ہے"، مگر حقیقت میں
سلطنت عام اخلاقی زندگی کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے انسان کے اخلاقی خصائل اور اخلاقی خیالات
اس کی خانگی زندگی کا بھی تعین کرتے ہیں اور اس کی سلطنتی زندگی کا بھی اس کے مذہب کا بھی اور
سلطنت کا بھی اس کے خاندان کا بھی اور معاشرت کا بھی تحلیل سلطنت کے لئے ایک صاف
اور قابل اطمینان بنیاد کا ادراک ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم اقوام اور نوع انسان کی
مجموعی خصلت انسانی کو نفسیات کی رو سے سمجھ لیں۔ میں نے اپنی تصنیف "سلطنت و کلیسا پر نفسیاتی مطالعہ"
Psychlogische (Studien uber Staat und, Kirche. Zurich, 1844

بلنچلی

مطبوعہ زیورش ۱۸۴۴ء) میں پہلی بار کوشش کی ہے کہ سلطنت کی تشریح فریڈرک روھر
کی نفسیات کی رو سے کروں۔

میں نے خطا کی جو یہ فرض کر لیا کہ یہ علم جسے میں نے اپنی کتاب "سیاسی فرقوں کے
نظریے" (Lehrevon den porteien) میں ظاہر کیا ہے، اشاعت پذیر ہو گیا ہے۔ مجھے
بہت جلد تجربہ ہو گیا کہ نہ صرف یہ علم مفقود ہے بلکہ سلطنت کی نسبت نفسیات کی رو سے
غور و فکر کرنا تعلیم سے مطلقاً خارج ہو چکا ہے اور اسے کوئی جانتا ہی نہیں سے [illegible]"
یہ کہہ کر علیحدہ رکھ دیے گئے کہ یہ ایک ایسے شخص کے ناقابل یقین مقولات ہیں جو اس کے سوا اس کی

باتوں میں بلا شبہ کچھ دار ہے ان "مطالعات" کے ثمر جو پختہ ہو کر اس موجودہ تصنیف میں پیش کئے گئے ہیں، عام طور پر مقبول ہوں گے اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ جس راہ پر ان "مطالعات" میں قدم رکھا گیا تھا وہ خطرناک نہ معلوم ہو اور سلطنت کا عضوی اور نفسیاتی مطالعہ مستعدی کے ساتھ جاری ہو جائے، اس وقت لوگ اس امر کا بہتر فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ "مطالعات" قابل قدر ہیں یا نہیں، اس اثنا میں مجھے اس بات کے جاننے سے بہت سی غلط فہمیوں اور ناقدر دانیوں کا معاوضہ مل گیا کہ جرمانی مدبرین میں سے سب سے زیادہ درخشاں مدبر یعنی فریڈرش اعظم اور پرنس بسمارک نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ قوموں اور سلطنتوں کے اندر نفسیاتی زندگی کو محسوس کرتے ہیں۔

دوسرا مقالہ

سلطنت کے بنیادی شرائط انسان اور اقوام کی سرشت اور طینت کے اعتبار سے

پہلا باب

نوع انسان، انسانی نسلیں اور قوموں کے خاندان

نوع انسان، اُس کا توحد اور اُس کے اختلافات

نوع انسان ابھی تک عالمگیر شہنشاہی کی کوئی مجموعی تنظیم قائم نہیں کر سکی ہے۔ ازمنہ گزشتہ کی تاریخ میں صرف ایسی منفرد شہنشاہیوں اور سلطنتوں کا ذکر ملتا ہے جو نوع انسان کے خاص خاص حصوں تک محدود تھیں، اس لئے قانون عامہ کا موجودہ زمانے کا نظریہ عام انھیں حصوں کے مشاہدات اور نوع انسانی اور سلطنت کے ساتھ اقوام کے تعلقات کے متعین کرنے سے شروع ہونا چاہیئے۔

اعلیٰ مذہبی احساس کے لیے بنی نوع انسان کی ایکی کا یقین کرنا بہت ضروری ہے[1] مسیحیت نے تمام آدمیوں کو خدا کی اولاد بتایا ہے۔ مہذب سلطنتیں نوع انسانی کی ایکی کو مانتی اور پست درجے کی نسلوں اور قبیلوں تک میں ایک مشترک انسانی فطرت کا اعتراف کرتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی نسلوں کا تخالف، سلطنت اور قانون عامہ دونوں کے لیے نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ سلطنت میں انسان ایک نظم و ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور نظم و ترتیب بغیر اختلاف و امتیاز کے ممکن نہیں ہے۔ نوع انسان کی اہم نسلوں کے پراسرار آغاز پر جو پردہ پڑا ہے اُس کے اُٹھانے سے سائنس اب تک عاری رہا ہے سوال یہ ہے کہ آیا نسلیں تخلیق کے جدا جدا افعال کا نتیجہ ہیں اور بعض نسلیں پہلے پیدا ہوئیں اور بعض بعد کو یا مختلف نسلیں ایک ہی ابتدائی نسل سے رفتہ رفتہ جدا ہو گئی ہیں اور اگر ایسا تھا تو کن فطری قوتوں کے باعث یہ تغیر پیدا ہوا ہے۔ ہمیں ہنوز اسکا علم نہیں ہے مگر

---

[1] لیکن تمام مذاہب سے اعلیٰ ترین خیال اس "ایکی" (توحد) کا اسلام میں موجود ہے یعنی یہ کہ کل بنی نوع انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہے، اور تمام مخلوقات میں اس کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور وہ خالق مطلق نہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اُس کی اولاد ہے۔ (ناظر مذہبی)

انسانی ترقی کی تاریخ کے عین ابتدا ہی کے جو حالات ہمیں معلوم ہیں انھیں میں ہم دیکھتے ہیں کہ خاص خاص نسلوں کے جسموں کی ساخت اور ان کے رنگ نیز ان کی ذہنی قابلیتوں میں فرق موجود تھا، اور وہی فرق حقیقتاً اس وقت تک بدستور موجود ہے۔

یہ سچ ہے کہ کوئی نسل کلیتہً خالص نہیں رہی ہے، اور ابتدائی نسلوں کے بہت بڑے بڑے حصے اپنی قرابت قریبہ سے جدا ہو گئے اور بعض ان میں نئی قوموں کی صورت میں مبدل ہو گئے ہیں۔

مگر اس تمام دور میں سفید، سیاہ، زرد، اور شاید سرخ رنگوں کی نسلوں کا امتیاز صاف نظر آرہا ہے اور یہ امتیاز محض رنگوں کے بہ نسبت جو کبھی دھوکے میں ڈال دیتے ہیں زیادہ تر انسانی ارتقا کی تاریخ میں نمایاں ہوتا ہے بعض نہایت عالی دماغ لوگ بھی ہیں جو ان نسلوں کے دماغی تفاوت کو اصولاً نہیں مانتے مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو عملی زندگی میں بالاستقلال اس تفاوت کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ دنیا کی تمام تاریخ، نسلوں کی ذہنی قابلیت کے اختلاف کی شاہد ہے بلکہ ان نسلوں سے جو قومیں پیدا ہو گئی ہیں ان تک میں نامساوی قابلیت کا ثبوت عیاں ہے۔

اغلب یہ ہے کہ سیاہ رنگ حبشی نسل کی قومیں جن کو کاروش "اقوام اللیل" کہتا ہے، کسی وقت میں نہ صرف افریقہ پر محیط تھیں (جو دنیا میں ان کا خاص حصہ ہے) بلکہ ایشیا کے جنوبی ممالک میں بھی کالی نسل پھیلی ہوئی تھی اور خود براعظم یورپ کے جنوبی اقطاع پر قابض تھی۔ اس نسل کی طویل عمر میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور یہ شاید دنیا میں سب سے مقدم نسل ہے مگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں اس نے بطور خود کسی معقول حد تک قانونی یا سیاسی ترقی نہیں حاصل کی۔ اُس کی کوئی حقیقی تاریخ بھی نہیں ہے۔ گوری نسل کے افراد یا قبائل سے جب کبھی اُس کا مقابلہ ہوا وہ فوراً اُن کی مطیع ہو گئی۔ تخیل کی کثرت اور جلد اشتعال میں آجانے والے جذبات کے ساتھ کالی نسل میں کم فہمی اور ضعف ارادہ بھی شامل ہے۔ فطرتاً اس کی طبیعت بچوں کی سی بنی ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ اعلیٰ قومیں

اسے اپنے زیرِ تربیت رکھیں اور اس پر حکومت کریں۔

قدیم زمانے میں بھی ہندوستان اور مصر کی کالی قوموں پر آریائی اور سامی قومیں حکمرانی کرتی تھیں۔ افریقہ کی قدیم حبشی بادشاہتیں آج بھی صحیح مفہوم میں سلطنت نہیں ہیں بلکہ جابرانہ متلون مزاج مطلق العنان حکومتیں ہیں۔ یہ قبیلے جب مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کی ہدایت میں آگئے تو بالخصوص شمالی افریقہ میں اور وسطی سوڈان کی سلطنتوں نے ایک نمایاں ترقی حاصل کی، ہیٹی اور لبریا کے حبشیوں کا فرانسیسی شہنشاہی اور ممالک متحدہ امریکہ کی نقل کرنے کی کوشش کرنا سیاسی قوموں کی زندگی کا ایک تمسخر ہے۔

(۲) لال رنگ والی نسل

بر خلاف اس کے امریکہ کے اصل باشندوں کی سرخی مائل نسل میں اس درجہ بچوں کی سی حالت نہیں ہے، مگر سلطنت کی قابلیت اُن میں بھی بہت ہی کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ میں یورپیوں کے آباد ہونے سے پہلے وہاں بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں اور اُن میں ایک معقول حد تک قابلِ وقعت تمدن پایا جاتا تھا مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیرو اور میکسیکو کی مذہبی بادشاہیاں خود وہاں کے اصل باشندوں کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ مشرقی اور جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے آبادکاروں کی قایم کی ہوئی تھیں۔ پیرو میں قبیلہ انکاس کو "سورج کے سفید بچوں" کا نام دیا جانا اور "دیوتاؤں کے بیٹوں" کی حیثیت سے گورے آدمیوں کی وقعت کرنا بلا شبہہ پیرو والوں کی آریائی اصل کا ثبوت ہے جہاں امریکی خود اپنی مرضی پر چھوڑ دئے گئے تھے، وہاں وہ پھر وحشی شکاریوں کی حالت کی طرف پلٹ گئے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان کے قبائلی جمہوریئے باوجود اپنے وقتاً فوقتاً بدلتے رہنے والے سرگروہوں اور اپنے پرزور تقریر کرنے والوں اور اپنی سیاسی مجلسوں کے کسی مضبوط قانونی بنیاد پر قائم نہ تھے اور اُنکے تنظیمات کا قیام یقینی اور قابلِ اطمینان نہ تھا۔ وہ سلطنت نہیں ہیں بلکہ شکاریوں کے جرگے ہیں۔ منفرد شخصوں کو شاید ایک طرح کی خودسرانہ اور زبردستی کی آزادی حاصل ہو مگر جو بندش سب کو متحد کرتی ہے وہ پکی اور لوچ دار نہیں ہے۔ وہ گورے آبادکاروں کی ترقی میں کسی طرح سے

خارج نہیں ہوسکتے اور اس کے قدموں کے نیچے کچلے جاتے اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔

زرد نسل

سیاسی ترقی کی قابلیت کالی نسل کی بنسبت زردی مائل نسل میں زیادہ ہے۔ اس زرد نسل کا وطن ہمیشہ ایشیا میں رہا ہے اور وہ دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہے ایک طرف زیادہ بھورے رنگ والے اہل ملایا ہیں اور دوسری طرف ہلکے رنگ والے زنجی اور مغل ہیں۔ مغلوں میں بالتخصیص بڑے بڑے فرمانروا سپہ سالار اور مدبر پیدا ہوئے ہیں۔ بعض قبائل جو بلا شبہ مغل نسل سے ہیں اس وقت تک گلہ بانوں شکاریوں اور رہزنوں کی حیثیت سے خاص کر وسط ایشیا میں بادیہ نشین حالت میں رہ گئے ہیں۔ مگر اس نسل کی دوسری قوموں نے بڑی بڑی شاہنشاہیاں قائم کرلیں۔ مغرب میں انھوں نے اپنی درشت خوئی قائم رکھی ہے مگر مشرق میں وہ زیادہ نرم مزاج ہوگئے ہیں۔ حبشیوں اور لال امریکیوں کے بہ نسبت یہ ساری نسل کوہ قافی نسل سے زیادہ قریبی مشابہت رکھتی ہے اور اس نے قدیم زمانے سے سفید قوموں کے ساتھ ازدواج باہمی بھی قائم رکھا ہے۔ بالخصوص ان کے اعلیٰ طبقہ میں یہ رواج زیادہ ہے۔ چین اور جاپان کی متمدن قومیں ہنوں اور ترکوں کے بہ نسبت ترقی کے مدارج زیادہ طے کرگئی ہیں۔ انھوں نے ایک لطیف سیاسی فلسفہ پیدا کردیا ہے اور انھوں نے وحشت کے مقابل میں خیالات انسانیت کا اور شرافت نسب کے مقابلہ میں جوہر ذاتی کا اعتراف یورپ کی آریا قوموں سے بہت پہلے کیا تھا انھوں نے زراعت، تجارت، مدارس اور کوتوالی کے لئے بہت کچھ کیا ہے مگر قانون کے متعلق اُن کے خیالات ہمیشہ اخلاقی احکام کے ساتھ مخلوط اور خاندانی زندگی اور نابالغوں کی تربیت اور انضباط کے ضروریات سے محدود رہے ہیں، اُن کی حکومت ایک فیض رساں مطلق العنانی ہے۔ عزت کا احساس ان میں زیادہ نمایاں نہیں ہے اور قومی آزادی کے خیال نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ اس میزان میں کوہ قافی یا ایرانی قوموں

قافی نسل

کی نسل کا پلہ سب سے بھاری ہے، کارس انھیں کو "تاریکی اور شفق کی قوموں" کے مقابلے میں "روز روشن کی قومیں" کہتا ہے اور قدمانے انھیں کو آفتاب

اور آسمان کے فرزند" کہا ہے۔ یہ قومیں ممتاز طور پر تاریخی قومیں ہیں۔ دنیا کی تاریخ کو یہی قومیں معین کرتی ہیں، تمام اعلیٰ مذاہب جو انسان کا تعلق خدا سے قایم کرتے ہیں ان کا ظہور انھیں قوموں میں ہوا اور کم و بیش تمام فلسفہ انھیں کے افکار ذہنی کا نتیجہ ہے۔ دوسری قوموں سے جب ان کا تصادم ہوا ہے تو اس کا انجام ہمیشہ یہی ہوا کہ انھوں نے اُن قوموں کو مفتوح کر کے انھیں اپنا ماتحت بنا لیا ہے۔ ہر قسم کی اعلیٰ سیاسی تنظیم انھیں کی اُمنگ کا نتیجہ اور انھیں کی کارگزاری ہے۔ خدا کے زیر سایہ انھیں کی ذہانت اور انھیں کی قوت آزادی سے ہمیں انسانی طبیعت کی تمام اعلیٰ ترقیات کا مآل حاصل ہوا ہے۔

گوری نسل کے دو بڑے خاندان (ا) سامی، (ب) آریا

یہ "روز روشن" کی قومیں دو بڑے خاندانوں سامی اور آریا میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں سامیوں کا کام سب سے زیادہ مذہب سے متعلق رہا ہے، یہودیت، عیسایت اور اسلام ان سب کا پہلا ظہور سامی ہی قوموں میں اور مشرق ہی میں ہوا مگر سیاسی حیثیت سے ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ بخلاف اس کے آریا خاندان کی قومیں، جن کی زبان صوری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سلطنتوں کی تاریخ اور حقوق کے نشو و نما میں سب سے اول جگہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا صحیح وطن یورپ میں پایا ہے، اور یہیں آکر سیاسیات کے متعلق ان کی مردانہ فطرت کو غور اور پختگی حاصل ہوی۔ یہی بنا ہے یورپ کی آریا قوموں کے اس دعوے کی کہ وہ اپنے خیالات و تنظیمات سے روئے زمین کی تمام دوسری قوموں کے سیاسی سرگروہ بن جانا اور اس طرح نوع انسان کے انتظام کو مکمل کرنا چاہتی ہیں۔

نسلوں کے یہ فرق طبعی ہیں قومیت کے فرق تاریخی ہیں۔

پس نسلوں کا یہ اختلاف فطرت کی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہے، محض انسانی تاریخ کی پیداوار نہیں ہے برخلاف اس کے وہ قومیں جن میں یہ نسلیں تقسیم ہو گئی ہیں یا جو مختلف نسلوں کی مخالطت سے پیدا ہوی ہیں، وہ صاف طور پر انسانی تاریخ کی پیداوار ہیں۔ قومیں، نوع انسان اور انسانی نسلوں کی تاریخی ارکان ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نہایت ہی قدیم قوموں سے بھی آگاہ ہیں جنھیں ہم اوائل زمانہ میں دیکھتے ہیں مگر جن کی نسبت ہمیں بہت ہی خفیف سا علم ہے،

اور جن کی اصل و ابتدا قدامت میں گم ہو گئی ہے، لیکن ایک بہت کثیر تعداد اُن قوموں کی ہے جن کی اصل و ابتدا ہمارے تاریخی علم کی حدمیں واقع ہے اور ہمارے لئے یہ یقین کرنے کی کافی وجہ موجود ہے کہ ابتدائی قومیں بھی اسی طریقے سے پیدا ہوئی ہونگی، تاریخ نے اس طویل زمانے میں انفصال و اتصال کے مسلسل عمل نیز تبدل و ترقی کے ذریعے سے قوموں کو متفرق کر دیا ہے، اور نئی قومیں پیدا کر دی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قوموں کی خصوصیت، ان کی طینت و خصلت زبان و قانون کے بہ نسبت اُن کے جسم کی ساخت میں کم ظاہر ہوتی ہے۔

تعلیقات

(۱) پریچرڈ نے اپنی "انسان کی فطری تاریخ" میں بڑی بڑی نسلوں کی جسمانی ساخت اور زبان کے تخالف و توافق کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے اور اے ڈی گوبینو نے اپنے مضمون "انسانی نسلوں کے عدم مساوات" میں سیاسی اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے[۱]۔ یہ تصانیف اگرچہ دلچسپ اور طبیعت میں حرکت پیدا کرنے والی ہیں مگر فیصلہ کن علمی نتائج کے حاصل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، سب سے آخری اور سب سے مکمل تصنیف تھیوڈور وائٹس کی کتاب "فطری (یعنے غیر متمدن) قوموں کی انسانیات" ہے[۲] جس کا چھٹا (آخری) حصہ خصوصاً ملاحظہ طلب ہے نیز پیشل کی کتاب "معلومات بابت اقوام" (پانچویں اشاعت ۱۸۸۱ء) صفحہ ۳۴ سے آخری بیان تک[۳]۔

---

[۱] A. de Gobineau, Essai sur l'inégalite des races humaines, Paris 1852-1855.

[۲] Th. Waitz, Anthropologie der Naturvolker. 6 vols, 1856-1872

[۳] Peschel, Volkerkunde 5. Aufiage 1881

(۲) قانون اور سیاسیات کے متعلق نسل کی جو اہمیت ہے اُس سے
اہل فن نے بہت زیادہ زمانے تک لاپروائی برتی ہے گوبینو اس کمی کو پورا
کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اکثر دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے اور ہر شئے کی تشریح
نسل کی طبیعت سے کرنا چاہتا ہے نیز وہ اس نسل پر ضرورت سے زیادہ
توجہ کرتا ہے جو توالد و توارث اور خون کے تسلسل سے قایم ہوی ہو اور
اس امر واقعی کو فراموش کردیتا ہے کہ تعلیم سے بھی نسل پیدا ہوسکتی ہے جیساکہ
ہم خاندانوں اور قوموں دونوں میں دیکھتے ہیں ایسی ثانوی نسل اگرچہ زیادہ تر
انسانی آزادی پر منحصر ہے مگر حقوق کی ارتقا پر بہت قوی اثر رکھتی ہے،
رومی پادری اس زمانے میں یورپ میں اس کی ایک نمایاں مثال ہیں کہ
تعلیم و تربیت کے اثر سے کیوں کر ایک نسل پیدا ہوسکتی ہے -
افراد کا اثر نسل کے اثر سے ایک جدا چیز ہے اور انفرادی اثر بھی
کچھ کم توجہ نہیں چاہتا - افراد نے تاریخ کی رفتار کا تعین نسلوں سے بھی زیادہ
کیا ہے - فریڈرش رومر نے ان اختلافات کا جو بیان اپنی کتاب "اصول جماعات سیاسیہ"
میں کیا ہے وہ اس سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے جو اُسے اب تک حاصل ہوی ہے -

دوسرا باب

تصورات امت وقوم

زبان کے عام استعمال میں "اُمت" اور "قوم" کے الفاظ خلط ملط ہو جاتے ہیں مگر علمی حیثیت سے لازم ہے کہ ان میں احتیاط کے ساتھ تفریق قائم کی جائے۔ لیکن خود علمی زبان میں بھی اکثر اس وجہ سے خلط مبحث ہو جاتا ہے کہ مختلف مہذب قومیں ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتی ہیں۔ جرمانی زبان میں ہم لفظ ناتسیون (nation) کو رومیوں کے لفظ ناتسیو (natio) اور اطالیوں کے لفظ ناتسیون نالتا (nazionalita) کی طرح تمدنی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر زمانہ حال کے فرانسیسی اور انگریز اس مفہوم کو پیوپل اور پیپل[1] (people امت) سے ادا کرتے ہیں۔ سیاسی مفہوم کو ہم (جرمانی) فولک (Volk) یعنی لاتینی لفظ پوپلس کے مرادف لفظ سے ظاہر کرتے ہیں مگر مغربی قومیں یعنی انگریز اور فرانسیسی اسی مفہوم کے لئے لفظ (nation نیشن یا ناسیون) استعمال کرتے ہیں۔ اشتقاق کی رو سے جرمانی استعمال صحیح ہے اس لئے کہ لاتینی لفظ (natio ناتسیو) جو nasci (ناس سی) سے مشتق ہے، پیدائش اور نسل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فولک (Volk اور پوپلس (populus) کے لفظ بیشتر سلطنت کی عام زندگی (یونانی πολις پولس یا لاتینی (respublica ریس پبلکا

---

[1] مگر انگریزی لفظ "پیپل" سے بسا اوقات "فولک" کا سیاسی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً فولکس فیرترتیتنگ Volksvertretung کا مرادف انگریزی میں Representation of the people ہے۔

کو ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ اہل جرمانیا ازمنۂ وسطیٰ میں ایک "امت" بھی تھے اور ایک قوم بھی اور اخیر کی چند صدیوں میں اُن کی حیثیت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک امت کی تھی جو مختلف سلطنتوں، ملکوں یا یوں کہئے کہ مختلف قوموں میں منقسم تھی آج جرمانی قوم (Volk) پھر زندہ ہوگئی ہے گو کہ جرمانی امت کے منفرق اجزا غیر جرمانی قوموں اور سلطنتوں کا جزو بھی ہیں، ہر چند کہ ہمارے زمانے میں قومیت کا خیال اُس سے زیادہ قوی ہے جتنا کہ کسی سابق زمانے میں رہا ہے مگر اب بھی "امت" اور "قوم" کے حدود کسی جگہ بھی تمام ایک نہیں ہوگئے ہیں۔

امت کی ابتداء

"اُمتیں" اور "قومیں" تاریخ کی پیدا کردہ ہیں، ایک امت نفسیاتی کارروائی کے ذریعے سے آہستہ آہستہ وجود میں آتی ہے جس میں آدمیوں کا ایک گروہ بتدریج معاشرت اور زندگی کا ایک انداز اختیار کر لیتا ہے، جو دوسرے گروہوں سے اُسے ممیز کر دیتا ہے اور یہی ایک نسل کی مستقل توریث ہو جاتی ہے کسی حکمانہ اتفاق یا اجتماع سے کبھی کوئی اُمت نہیں بنتی ہے بلکہ اشخاص کی ایک کثیر تعداد کے آپس کی رضامندی سے اتفاق کر لینے اور معاشرتی میل جول سے بھی کوئی امت نہیں پیدا ہو سکتی۔ امت کے لئے کئی نسلوں کے تجربات و حوادث کے تعامل باہمی کی ضرورت ہے، اور پھر بھی اس وقت تک اس کے استمرار کا یقین نہیں ہو سکتا جبتک کہ خاندانوں کی روایات تہذیب پشتہا بپشت تک جاری رہکر متوارث خصائل نہ پیدا کر دیں۔

قوم کی ابتداء

ایک قوم کے وجود میں آنے کے لئے پہلے سیاسی کارروائی یعنی ایک سلطنت کے قائم ہونے کی ضرورت ہے اور اس لئے ایک نیا نظام سلطنت جاری کر کے بہت عجلت کے ساتھ ایک قوم معرض ظہور میں لائی جا سکتی ہے مگر حقیقی تحفظ اُسے اُس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جبتک کہ اُس کی بنیاد قومیت پر نہ رکھی جائے۔

امت کے بنانے میں اُن متعدد قومی اور عناصر کو ایک ساتھ عمل کرنا پڑتا ہے جو مشتملہ گروہوں کو اُن کی مشترک عصبیت، مشترک اغراض اور مشترک رسم و رواج

کے ذریعے سے آپس میں متحد ہو جانے اور دوسرے اجنبی گروہوں سے جدا ہو جانے کی طرف مائل کر دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

مذہبی اعتقادات نے نہ صرف خصوصیت کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ ہی میں بلکہ قدیم ایشیا میں بھی انسان کے تمام خیالات اور زندگی پر ایسا قوی اثر ڈالا کہ ملّت دینی Community قومیت کی بنا قرار پا گئی اور اُس مذہب پر اعتقاد نہ رکھنے والے اجنبی قرار پا کر خارج کر دیئے گئے۔

ظن غالب ہے کہ ہندوستان اور ایران کے آریا اولاً مذہبی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور برہمنی مذہب کے پیرو اور بودھ مت کے ماننے والے نواحی مشترک بود و باش، زبان اور نسل کے باوجود یقیناً محض مذہب ہی کی بنا پر ایک دوسرے سے اس طرح لڑتے تھے گویا وہ ایک دوسرے سے بیگانہ امتیں (People) ہیں۔ اسی طرح اُمت یہود نے صرف اپنے وطن فلسطین میں بلکہ بابل کی غلامی میں اور راس کے بعد اسکندریہ کی رومی شہنشاہی کے تحت میں اور روما کے دوران قیام میں اور یہودی سلطنت کے تباہ ہو جانے پر دور دراز غیر ممالک اور اُمتوں میں منتشر ہو جانے کے بعد بھی اپنے خصوصیات کو قائم رکھا مگر اب کہ مذہبی یکجہتی کے مقابلے میں مذہبی آزادی کی زیادہ قدر ہونے لگی ہے اُمتوں کے بننے اور جدا ہونے کے لئے مذہب کا اثر نسبتاً کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اب اتحاد و تفریق کے لئے مذہب کی نسبت قومیت زیادہ قوی طاقت رکھتی ہے جرمانیوں میں بلا لحاظ اس کے کہ وہ کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ۔ موسوی مذہب والے ہیں یا ایک سے زیادہ معبودوں کے ماننے والے قومی اتحاد کا احساس و ادراک پیدا ہو گیا ہے اور وہ غیر ملکی اُمتوں سے اپنا امتیاز قائم رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ اکثر ان میں سے انھیں کے ہم مذہب ہیں۔

اُمتوں کی تفریق میں مذہب سے زیادہ قوی الاثر شئے زبان کا اختلاف ہے۔ زبان کا اشتراک اُمت کا خاص نشان ہے۔ مختلف ممالک کی آبادیاں اپنی زبانوں کو بتدریج اپنی ایک خاص وضع میں ڈھالتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ

ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ لوگ جو پہلے ایک ہی زبان بولتے تھے ایک دوسرے کی گفتگو کے سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کی زبانیں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس نوبت کے بعد بھی جو لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اپنا ہم امت سمجھتے ہیں اور اُن دوسروں کو جن کی زبان وہ نہیں سمجھتے اجنبی جانتے ہیں۔

زبان ہی مشترک جذبات کے اظہار کا ذریعہ اور تبادلہ خیالات کا آلہ ہے۔ وہ خاندان میں آگے بڑھتی رہتی اور ارث کے طور پر جاری رہتی ہے۔ اسلئے مادری زبان روزمرہ عمل کے ذریعے سے قومیت کے خیالات کو بیدار اور زندہ رکھتی ہے۔ خود اجنبی نسلیں جب وراثت کے ذریعے سے ایک نئی زبان کو اختیار کرتی ہیں تو رفتہ رفتہ اُن نسلوں کی طینت میں اُس زبان کے اثر سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اُسی قوم میں شمار ہونے لگتی ہیں جس کی زبان وہ بولتی ہیں۔ اس طرح جرمانی قبائل اوسٹ گوٹ اور لوم بارڈ جو اٹلی میں تھے وہ رفتہ رفتہ اٹیالوی ہو گئے؟ فرانس میں کلٹ فرانک اور برگنڈوی فرانسیسی بن گئے اور پروشیا میں سلاوی اور وینڈ جرمانی ہو گئے۔

ہمارے وقت میں اگر قومیت کا احساس تمام سابق زمانوں سے زیادہ قوی اور موثر ہو گیا ہے تو اس کی خاص وجہ زبان اور ادب (لٹریچر) کا اثر ہے اور سب سے بڑھکر یہ نتیجہ ہے موقت الشیوع مطبوعات کا۔ قومی تحریک کو سب سے زیادہ قوت قومی ادب سے پہنچی ہے۔ کیونکہ قومی ادب ہی وہ چیز ہے جو خیال اور احساس کا اتحاد قائم کرتی اور جو مشترک ذہنی خزانوں کو وسعت دیتی ہے۔

تاہم زبان ہی ہمیشہ قومیت کا فیصلہ نہیں کرتی اور اس لئے "امت" اور موروثی زبان کا جتھا دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں بریٹنی (واقع فرانس) کے رہنے والے اور باسک[1] اپنے آپ کو امت فرانسیسی کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔

---

[1] باسک واقع فرانس کے باشندے ایک قدیم زبان بولتے ہیں۔ اور اس کا نام اسکیورا ہے۔

حالانکہ وہ فرانسیسی زبان یا تو بولتے ہی نہیں یا اُس کا استعمال مثل ایک سیکھی ہوئی غیر زبان کے کرتے ہیں۔ اس موقع پر فرانسیسی قومیت کا احساس ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی طور پر متحد ہوتے، مشترک حوادث اور مشترک اغراض اور ایک ہی تہذیب سے پیدا ہوا اور انہیں سے قائم ہے۔ دوسری جانب انگریز اور شمالی امریکی اگرچہ ایک ہی زبان بولتے ہیں، مگر وہ قومیت میں ایک دوسرے کو علیحدہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق قریبی ہے مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے ممیز ہیں۔ یہاں زبان کا سوال نہیں ہے بلکہ طبعی کیفیات اور مقاصد اور تاریخی، معاشری اور سیاسی حالات کے اختلاف نے ایک امت کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی اُمتوں کے بننے میں مذہب اور زبان کے سوا (ا) وطن اور ملک، (ب) طرز معاشرت فرائض زندگی اور رسم و رواج اور (ج) سیاسی تعلقات کے ایک ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے۔

ان سب کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کا اثر اس خصوص میں زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی مختلف قومیتوں کا میل جس کے ذریعے سے ایک قومیت کے بعض حصے ایک دوسری قومیت کے ارکان کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اس طرح سے ایک نیا کینڈا اور ایک نئی خصلت اور اُسی سے ایک نئی قومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ ل

روح اُمت کا اصلی جوہر اُس کے تمدن میں مخفی ہے اُس کا اندرونی اتصال اور غیر امتوں سے اُس کا افتراق زیادہ تر اُسی تمدنی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا اظہار بالتخصیص اُس کے حالات پر اثر ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اسے ہم صرف نفسیاتی نقطہ نظر سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے اصلی جوہر کو ہم اُسی مشترک جذبے اور مشترک خصلت میں دیکھ سکتے ہیں جو اس کے محرک ہیں۔ اُسے ہم اُسی حد تک عضوی (ذی حیات) کہہ سکتے ہیں جہاں تک اس کی کیفیت کا بدیہی اظہار نسل کے قد و قامت اُس کے خط و خال، زبان، عادات، و اطوار سے ہوتا ہے مگر حقیقت میں امت شخصیت کے اعلیٰ مفہوم کے لحاظ سے کوئی عضوی ہستی نہیں ہے جیسی ایک قوم کی ہستی ہوتی ہے

امت میں باہمی ارتباط کا احساس اور اتحاد کا میلان موجود ہے مگر قانونی ارادے اور عمل کا اتحاد نہیں ہے اور نہ قانونی شخصیت کا وجود ہے جب تک کہ وہ ایک سلطنت کے حدود میں ایک قوم نہ بن جائے۔

اگرچہ انسانی طبیعت اور انسانی کوششیں "امتوں" کی ساخت پر بہت بڑا اثر رکھتی ہے مگر زیادہ تر یہ عمل ایک فطری ضرورت کے غیر ارادی طور پر جاری رہتا ہے محض اس بات سے کہ ایک اکیلی نوع انسانی مختلف امتوں میں منقسم ہو گئی ہے یہ موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی مسابقت اور ان کے انواع واقسام کے قوائے عملیہ کے ذریعے سے ان کی فطرت کی وہ تمام پوشیدہ قوتیں عیاں ہو جائیں جن میں مشترک ترقی کی قابلیت موجود ہے اور اس طرح انسان اپنی غایت اصلی کو زیادہ وسعت اور فراوانی کے ساتھ پورا کر سکے امتوں کا نمو وارتقا، دنیا کی تاریخ کا ایک زبردست جزو ہے اور یقیناً اس کے خدائی نقشے کے بنیادی خطوط ہیں۔

امت کی تعریف

پس "امت" کے تصور کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے: امت ایک موروثی نظام معاشرت ہے ان مختلف پیشوں اور مختلف معاشری مدارج کے آدمیوں کے گروہوں کے مشترک جذبے، مشترک احساس اور مشترک نسل کا جو سیاسی یگانگت سے قطع نظر بھی خصوصاً ایک ہی زبان ایک سے رسم ورواج اور ایک سی تہذیب کے باعث یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے ہم قبیلہ ہیں اور ایک ہی سی تہذیب نے ان کے آپس میں رشتہ داری قائم کر دی ہے اور غیر امتوں سے ان کو جدا کر دیا ہے۔

امت کے حدود تحرک و تبدل کی قابلیت رکھتے ہیں، اپنی زبان اپنے عادات واطوار اور اپنے تمدن کو غیر گروہوں میں پھیلا کر اور اس طرح سے انھیں اپنے اندر جذب کر کے وہ مسلسل ترقی اور وسعت حاصل کر سکتی ہے، اسی طرح اگر کوئی غیر تمدن فاتحانہ طور سے اس پر غالب آجائے اور اس کے افراد کو اپنے اندر جذب کر لے اور ان کی حالت بدل دے تو وہی "امت" گھٹ سکتی، شکست ہو سکتی اور بالکل نیست ونابود ہو سکتی ہے۔ اس طریقے پر ایک بڑی امت کا اعلیٰ تمدن

چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے ناکمل تمدنوں کو آہستہ آہستہ فنا کر کے اُن کی جگہ پر اپنے مکمل اور وسیع نظام کو قائم کر دیتا ہے۔

لفظ "قوم" سے ہم بالعموم کسی سلطنت کے جملہ افراد کا اجتماع جس حیثیت سے کہ وہ سلطنت کے اندر متحد و منتظم ہوں مراد لیتے ہیں۔ قوم سلطنت کے قائم ہونے سے وجود میں آتی ہے وہ شے جو قوم کو امت سے بلند کرتی ہے وہ سیاسی یگانگت اور یکجہتی کا احساس و ادراک ہے خواہ اس احساس نے کم ترقی کی ہو یا زیادہ کوئی قوم جو اپنے ملک کو چھوڑ دے اس کی قومی حیثیت برقرار متصور ہو سکتی ہے مگر صرف عارضی طور پر یہاں تک کہ اسے کسی نئے ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کر لینے میں کامیابی ہو جائے۔ سوا اس کے قوم سلطنت سے پہلے بھی قائم ہو سکتی ہے جیسے یہود کی قوم موسیٰ کے تحت میں یہودی سلطنت سے مقدم تھی مگر یہاں بھی صرف اس وجہ سے ایسا تھا کہ حیات سلطنت کی تحریک یہودی قوم میں پوری قوت کے ساتھ ترقی کر چکی تھی، اور قوم کی متحد تنظیم بنائے سلطنت کے لئے راستہ صاف کر چکی تھی۔

یہاں تک تو قوم کے تخیل کے ساتھ سلطنت کا لابدی تعلق برابر قائم ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ "سلطنت نہیں تو قوم بھی نہیں"، سلطنت کی تخلیق پر ہم خصوصیت کے ساتھ چوتھے مقالے میں بحث کریں گے اگر ہم عام طور پر قوم کے لفظ کا اطلاق اُس گروہ امت پر نہیں کرتے جو محض ایک بے بس محکوم ہو اور اس کے کچھ سیاسی حقوق نہ ہوں اور اس لحاظ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ "قوم نہیں تو سلطنت بھی نہیں"۔ مطلق العنان حکومت قوموں کو نہیں جانتی۔ وہ صرف رعایا کو جانتی ہے۔

اگر پوری قوم یا اُس کا بڑا حصہ ایک ہی امت پر مشتمل ہوتا ہے، تو طبعاً اُس امت کی مشترک روح جبلت زبان اور رسم و رواج قوم پر چھا جاتا ہے، برخلاف اس کے اگر وہ مختلف امتوں کے اجزا سے مرکب ہوتی ہے، تو اس میں جذبات اور تنظیمات کا اتحاد ایک امت کے بہ نسبت کم ہوتا ہے۔

دوسری جانب قوم کو امت پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ قوم میں اتحاد حقوق زیادہ نمایاں درجے تک ترقی کر جاتا اور اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ امور سلطنت کے انصرام میں حصہ لے سکے اور اس میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے

کر نظام سلطنت میں موزوں اعضا کے قیام سے وہ اپنی عام آزادی کا اظہار اور اون کے عملی استحکام کا انتظام کر سکے۔ ایک لفظ میں کہہ سکتے کہ وہ قانونی و سیاسی طور پر ایک مجموعی شخصیت ہے۔

قوم کی روح اور ارادہ

اس لیے ہم قومی روح اور قومی ارادے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بجا ہیں۔ یہ روح اور یہ ارادہ اُن جملہ افراد قوم کی روح اور ارادے کے مجموعے سے کچھ زائد حقیقت رکھتا ہے جو قوم میں شامل ہیں۔ یہ روح اور ارادہ اپنے ظاہر و باطن میں منفرد اور متضاد نہیں ہے بلکہ مشترک روح اور عام ارادے کا کامل اتحاد اس کے اندر موجود ہے۔

قوم عضوی زندگی کے تغیرات کے تابع ہے۔

مزید براں اقوام ذی اعضا ہستیاں ہیں اور اس وجہ سے عضوی زندگی کے فطری قوانین کے تابع ہیں۔ ان کی تاریخ ترقی میں وہی مدارج ممیز طور پر پائے جائیں گے جو افراد کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ کسی قوم کی فطری قوتیں اور قابلیتیں۔ اس کے خیالات اور ضروریات پیرانہ سالی میں وہی نہ ہوں گے جو عہد طفلی میں تھے۔ افراد کے مانند اقوام میں بھی زندگی کا وسطان کی طبیعت اور طاقت کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ یہی زمانہ جو افراد کی زندگی میں دہائیوں سے شمار ہوتا ہے اقوام کی زندگی میں صدیوں سے شمار کیا جاتا ہے مگر فانی ہونے کے لحاظ سے اقوام افراد سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔

تعلیقات

(۱) سوئی کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ اس نے بحیثیت ایک عضوی ہستی کے قوم کی اہمیت کو اور جرمانیا میں ارتقائے قانون پر قوم کی عمر کے مختلف مدارج کے اثر کو نہایت واضح طور پر بیان کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔

(۲) خاندانی رابطے سے از خود نہ امت ظہور میں آتی ہے اور نہ قوم اور اشلائیرماخر Schleiermacher کا یہ کہنا تاریخ کے سراسر مخالف ہے کہ اگر بہت سے خاندان بذریعہ ازدواج آپس میں متحد اور دوسروں سے منقطع ہو جائیں تو قومی اتحاد اس کا نتیجہ ہوگا۔ روما کے پیٹریشین Patrcian آپس میں ازدواجی رشتہ

رکھتے تھے اور یہی حال پلیبے این (Plebeian) گروہ کا تھا۔ مگر اولاً اُن میں باہمی ازدواج کا طریقہ رائج نہیں تھا پھر بھی یہی دونوں ملکر رومی قوم بنے تھے۔

جرمانی (شیوٹنی) قومیں طبقات کے اتحاد پر مشتمل تھیں جن میں سے ہر ایک اپنے طبقے کے اندر ہی اپنے برابر والے گھر میں بیاہ کر سکتا تھا۔ موجودہ زمانے میں ہم مختلف امتوں میں باہمی ازدواج کا رواج دیکھتے ہیں۔ مگر اُس سے کوئی نئی اُمت نہیں پیدا ہوتی۔

(۳) من چینی اپنی کتاب (Della nazionalita come fondamento del Diritto delle Genti) مطبوعہ ٹیورن ۱۸۵۱ء صفحہ ۳) میں "قومیت" کی تعریف اس طرح کرتا ہے "ایک فطری اتحاد اُن انسانوں کا جو اپنے وطن، نسل، رواج اور زبان کے ایک ہونے سے مشترک زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس اجتماعی زندگی کا احساس رکھتے ہیں" من چینی کا یہ تسلیم کرنا تو درست ہے کہ سلطنت قائم کرنے کی طبعی قابلیت قومیت میں موجود ہوتی ہے۔ مگر اُس کی رائے سے قوم اور امت کا فرق کافی وضوح کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا نیز وہ اس طرف مائل ہے کہ امت کو ایک قانونی شخص تصور کرے حالانکہ کوئی امت اس وقت تک قانوناً شخص کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتی جبتک وہ ایک سیاسی عضویے کے درجے پر نہ پہنچ جائے۔

تیسرا باب

قومیتوں کے حقوق

حقوق جن کا ایک امت دعویٰ کر سکتی ہے

اس امر سے کہ ہم قومیتوں کے حقوق کے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کرنے لگے ہیں ترقی تمدن میں ایک قدم آگے بڑھنے کا اظہار ہوتا ہے۔ قومیتیں چونکہ نوع انسانی کے اجزا اور تاریخ عالم کے ایک عظیم الشان عمل ارتقائی کا نتیجہ ہیں اس لئے وہ اس بات کی مستحق ہیں کہ اُن کے قیام و دوام کی بھی حرمت و حفاظت کی جائے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ قرین فطرت اور بنیادی حق اپنی ہستی کا برقرار رکھنا ہے۔ لیکن ایک امت کی "روح عامہ" سے زیادہ اپنی بقائے ہستی کا حق انسانی زندگی کی کس ہیئت و شکل کو حاصل ہو سکتا ہے یہی "روح عامہ" انفرادی زندگی کا اساس اور اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانی کی شرط اولین ہے مگر اس کے لئے وقت چاہیے کہ یہ خالص اخلاقی اقتضاء قانونی اصول کی صورت اختیار کرے۔ اس حد تک اصول قومیت کی بڑی اہمیت حکمت عملی کی حد میں داخل ہے قانون عامہ سے اُسے تعلق نہیں ہے۔

مگر ایسے اصولی قومی حقوق بھی ہیں جن کا دعویٰ ایک ہی قومیت کے اعضائے مختلفہ جائز طور پر کر سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اپنی قومی زبان پر حق

۱۔ ایک "امت" کے لئے اس کی زبان اُس کی نہایت ہی خاص ملک ہے زبان ہی میں امت کی تخصیصی صفت رونما ہوتی ہے اور یہی وہ نہایت مضبوط زنجیر ہے جو امت کے افراد کو باہم ملائے ہوئے ہے اس لئے سلطنت کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کسی قومیت (امت) کو اس کی زبان کے استعمال[1] سے روکے نہ اس کے ترقی دینے اور اس کے ادب کو رواج

---

[1] ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کے آسٹروی اساسی قانون میں شہریوں کے عام قصوں کی بابت دفعہ ۹ ایس

کرنے سے منع کرنا چاہئے بلکہ اس کے برعکس سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جس حد تک تمدن کے عام اغراض کو نقصان نہ پہنچے وہ ہر ایک زبان کو آزادی کے ساتھ پھیلنے دے اور خیر خواہانہ اس کے رواج کو ترقی دے اہل روما کا اپنے صوبوں کی دیسی زبانوں کا دباتا اور ریٹوٹنی نظم ونسق کے ممالک میں سزائے موت سے وینڈی زبان کے استعمال کو روکنا حقوق پر وحشیانہ دست درازی تھی۔

مگر اس اصول سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سلطنت کے اغراض کے لئے تمام زبانوں کو ترک کر کے کسی ایک خاص زبان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ جہاں سلطنت کی زندگی کا تعلق ہے وہاں قوم کی بہبود بہ حیثیت مجموعی اس امر کی متقاضی ہے کہ زبان کا اتحاد قائم کیا جائے انگریزی پارلیمنٹ سے ویلزی اور گیلی زبانوں کا، فرانسیسی مجلس ملکی سے باسک اور برٹن اور جرمانی رائشس تاگ سے پولی ڈینی اور فرانسیسی زبانوں کا اخراج حق بجانب ہے مگر سویزرلینڈ ان مختلف قومیتوں کو جن سے وہ مرکب ہے زیادہ وقعت دیتی ہے اور سرکاری زبان میں فرانسیسی کے ساتھ جرمانی کو شامل کر رکھا ہے اور بعض مواقع پر ایتالوی زبان کو بھی تسلیم کرتی ہے۔

سلطنت کو اس امر کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ مدارس میں زیادہ ترقی یافتہ زبان کی تعلیم کا انتظام کرے تاکہ ہنوز غیر تکمیل یافتہ امت کے بچے ایک پاکیزہ اور مقتدر علم ادب کا ورثہ حاصل کر سکیں بخلاف اس کے ایک متمدن اُمت اسے نہایت ہی سخت ظلم سمجھتی ہے کہ ایک غیر ملکی زبان کی طرفداری میں اس کی زبان مدرسے اور کلیسا سے خارج کر دی جائے۔

علاوہ براں ہر ایک اُمت کو اپنے خاص رسم ورواج پر عمل کرنے کا اس حد تک حق ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی قانون انسانی کے مخالف یا حقوق سلطنت کے لئے ضرررساں نہ ہوں لہٰذا ہندوستان کی بیواؤں کو اپنے شوہروں کے مرنے پر ستی ہو جانے کی اجازت نہ دینے میں انگریز حق بجانب ہیں مگر غیر مضر قومی کھیلوں کے بند کرنے کا

۴۔ اپنے خاص رسوم

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ یہ تحریر ہے کہ قوم کے اندر تمام قبائل کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور ہر ایک کو اپنی قومیت اور زبان کے قائم رکھنے کا ناقابل الفسخ حق ہے۔

سلطنت کو کوئی حق نہیں ہے ۔

۳۔ فلاح کے سلطنت کے حدود کے اندر اپنے خاص قوانین پر عمل پیرا ہونا ۔

خاص قانونی تنظیمات کے حدود میں کسی اُمت کو اپنے اس قسم کے قانونی تنظیمات کے سلطنت کی طرف سے تسلیم کئے جانے اور اس کی محافظت ہونے کی امید کم رکھنا چاہیئے اس لئے کہ ایسی صورت میں اُس اُمت کے مقابلے میں کچھ تو سلطنت کا اتحاد اور اس کی یکسانی اور کچھ سلطنت کی متمدن قوم کے اغراض فطرتاً زیادہ اثر رکھتے ہیں ۔

ایک ترقی یافتہ سلطنت کے لئے ایک ایسا قانون ضروری ہے جو ساری آبادی کو شامل ہو اور منفرد اُمتوں کے حقوق کو بدل سکے یا منسوخ کر سکے۔ ہم اہل روما پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ انھوں نے اپنی تمام شاہنشاہی میں رومی قانون جاری کرنے کی کوشش کی مگر بیباکانہ مداخلت ضرور قابل ملامت ہے۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں نہایت ہی سخت غلطی کی کہ اُس نے ۱۷۷۳ء میں انگریزی قانون اور طریق عدل جوئی کو بنگال کے لوگوں میں زبردستی نافذ کرنا چاہا جو اس کے لئے ہنوز تیار نہیں تھے ۔ دوسری جانب اُسی زمانے میں جرمانی سلطنتوں میں بیحد اضطراب تھا کہ قوم کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے لئے روایتی قرابتی حقوق کا ایک انبار پریشان جمع ہو گیا اور ساتھ ہی تمام امت کے لئے ایک غیر ملکی قانون کے دلیرانہ اور انقلابانہ طور پر جاری کر دینے کی روش بھی قائم رہی ۔

پس قانون کے ارتقاء میں قوم کو بہ نسبت "اُمت" کے زیادہ قوی حق حاصل ہے، قانون و انصاف سب کے لئے ایک اور یکساں ہونے کے خیال سے قومیت کے اختلافات کو دب جانا چاہیئے ۔

یہ یقینی ہے کہ رومیوں کے لئے یہ آسان تھا کہ ماتحت اُمتوں کو قانون کے لحاظ سے رومی بنا لیں مگر یہ مشکل تھا کہ وہ زبان کے لحاظ سے انھیں لاطینی بنا لیتے اور ہم اسی طرح فرانسیسیوں پر اس امر کا الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ اپنا نپولینی ضابطہ جرمانی السّاس اور قدیم گالی بریٹنی پر کیوں نافذ کرتے ہیں، انگریزوں کو ہر طرح یہ حق حاصل ہے کہ اہل ویلز اور اہل آئرلینڈ پر یکساں قانون جاری کریں تاہم یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ رومیوں کا غیر متمدن جرمانیوں پر رومی طریق عدل گستری کے نافذ کرنے ہی کا اثر تھا کہ جرمانی آزادی کی

عظیم الشان جد و جہد کا شعلہ بلند ہوا اور اسی وجہ سے صدیوں تک جرمانی نظریہ قانون کا یہ مسلمہ اصول رہا ہے کہ ہر "امت" کو اپنے خاص قانون پر عملدرآمد کی اجازت ہونا چاہیئے اور ہر شخص کی اس کے خاص وطنی اور قومی حقوق کے مطابق حفاظت ہونا چاہیئے۔

قدیم رومی اصول اگر انتہائی حد تک پہنچایا جاتا تو وہ قومی قانون کے ساتھ ہر طرح کی قومی آزادی کو بھی برباد کر دیتا اور اگر قدیم جرمانی طریقے پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو حکومت اور قانون کی ہر طرح کی اعلیٰ تہذیب غیر ممکن ہو جاتی۔ آزادی اقوام اور ترقی تمدن کی خوش نصیبی تھی کہ رومی اور جرمانی دشمنوں کے طور پر ایک دوسرے سے ملے اور کسی اصول کو کامل غلبہ نہیں ہونے پایا۔

اگر کسی اُمّت کی اخلاقی اور ذہنی زندگی پر سلطنت کی طاقت کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے تو اس اُمت کے افراد نہایت ہی سخت مقاومت پر آمادہ ہو جاتے ہیں انسان کے واسطے ظلم و تعدی کی مقاومت کے لئے قومیت کی محافظت سے بڑھکر کوئی سبب نہیں ہو سکتا [1] اس کشمکش میں ضابطہ پیمائی کو نقصان پہنچ سکتا ہے مگر خود نفس قانون کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

اخلاقی زندگی کا رکھنا۔

[1] نی بور (Niebuhr) اپنی تصنیف میں جس کا نام "پروسیا کا حق سکسونی دربار کے مقابلے میں" ہے لکھتا ہے: "سیاسی تعلقات کے بہ نسبت جو ایک ہی نسل کی مختلف امتوں کو متحد یا متفرق کرتے ہیں عام قومیت کے حقوق بہت بلند ہیں صرف نحو، زبان، رسم و رواج، روایات اور ادبیات ایسا رشتۂ اخوت قائم کر دیتے ہیں جو غیر قبائل سے انھیں علحدہ کر دیتا اور اپنے قبیلے کے برخلاف دوسرے قبیلے کے ساتھ اتحاد کو جرم بنا دیتا ہے"۔

چوتھا باب

تعمیر سلطنت میں قومیت بہ حیثیت اصول کے

قومیت ہمیشہ قوی رہی ہے

تاریخ عالم کے ہر زمانے میں سلطنت اور سیاسیات پر قومیت کا زبردست اثر پڑتا رہا ہے قومی یگانگت اور مخصوص قومی صفات کے احساس نے یونانیوں کو ایران کے مقابلے میں جنگوں پر برانگیختہ کیا۔ اپنی قومی آزادی کے خاطر جرمانیوں نے رومیوں سے مقاومت کی۔ رومی عالمگیر شہنشاہی کے لاطینی اور یونانی شہنشاہیوں میں تقسیم ہوجانے کی اصلی وجہ قومیت ہی کے اختلافات تھے۔ فرانکی شاہی کا شکست ہونا، فرانس اور جرمانیا کا ایک دوسرے سے الگ ہوجانا بہت کچھ رومانی اور جرمانی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوا ازمنۂ وسطیٰ تک میں قومیت کے قوی اختلافات وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتے رہے ہیں مگر موجودہ زمانے تک یہ نہ ہوسکا کہ قومیت کا اصول ایک قطعی سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہو۔

مگر سیاسیات کے اصول کی حیثیت سے وہ تھوڑے ہی زمانے قبل مسلّم ہوئی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت کی بنا خاندانی یا طبقاتی اغراض پر ہوا کرتی تھی اور اس کے حدود قومی کے بجائے زیادہ تر ملکی تھے، بعد کی صدیوں میں بڑی بڑی یورپی اُمتوں نے نشوونما پائی مگر اُس وقت تک بھی سلطنت نہ تو قومیت کی بنا پر قائم ہوسکی اور نہ اُسے اظہار قومیت کا موقع ملا بلکہ بادشاہ اور اس کے عمال کو مرکز قرار دیکر اُس نے ایک ناظمانہ خصوصیت حاصل کرلی تھی۔

نیز بہ حیثیت ایک سیاسی نظریہ کے۔

فطرتی حقوق کا نظریہ بھی اپنے حسب دلخواہ سلطنت کے دعووں کی بنا عام قومیت پر نہیں قائم کرتا تھا بلکہ انسانی فطرت اور اُس کے ضروریات اور منفرد اشخاص کی آزادانہ مرضی پر اُس کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ روسو کے نزدیک سلطنت کی بنا معاشرت پر ہے نہ کہ "اُمت" پر قوم جس سے وہ سلطنت کی اعلیٰ طاقت کو متعلق کرتا ہے وہ ایک متحدہ امت نہیں ہے، بلکہ ایک مجتمعہ گروہ "یا شہریوں کی کثرت" ہے جو بلا کسی وجہ موجہ کے ایک سلطنت کے قیام کے لئے باہم متفق ہوگئے ہیں۔ خواہ وہ

ایک ہی امت کا ایک چھوٹا سا جزو ہو خواہ متعدد قومیتوں کے اتحاد سے مرکب ہو۔ انھیں اصول پر ۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کے فرانسیسی دستوروں کی بنا قائم ہے (دیکھو فرانسیسی دستور ۱۷۹۱ء عنوان ۳ دفعہ ۱، ۱۷۹۳ء دفعات ۲۵-۲۸، ۱۷۹۵ء، دفعہ ۱) کہیں ''امت'' کا اور کہیں ''قوم'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر دونوں کا مفہوم یہی تھا کہ وہ شہریوں کا ایک مجتمعہ گروہ ہے۔ جو کچھ ہوا صرف یہ تھا کہ سلطنت کی حکومت مرکز سے دائرے کی طرف منتقل کردی گئی یعنی بادشاہ کے ہاتھ سے عوام کے ہاتھ میں آگئی۔

نپولین نے جب انیسویں صدی کے اوائل میں چارلس اعظم کی سلطنت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور فرانسیسی امت پر اعتماد کر کے یورپ پر ایک ہمہ گیر شاہی قائم کرنا چاہی تو دوسری امتوں سے جو فرانسیسی حکومت کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتی تھیں اسے ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ باوجود اپنی ذہانت اور طباعی کے شہنشاہ کے لئے جو قومیت کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھ سکتا تھا، قومی مقاومت بہت ہی سخت ثابت ہوئی، لیکن اس وقت تک بھی قومیت کے احساس میں پوری ترقی نہیں ہوئی تھی اگرچہ یہ جذبہ غیر ارادی طور پر عوام پر اثر ڈال رہا تھا مگر قومیت کی روح ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھی فرانسیسیوں سے انگریزوں تک کی مستحکم اور دیرپا نفرت بھی قومیتوں کے آزاد کرنے کی خواہشوں پر اس قدر مبنی نہیں تھی جس قدر کہ فرانسیسی انقلاب سے انگریزی طبقۂ امرا کی نفرت یورپ میں فرانسیسی غلبے کے خوف اور تجارتی اغراض پر منحصر تھی۔

انگریز باوجود اپنے اُس بلند سیاسی احساس کے جو اُن کے مردانہ غرور اور آزادانہ پاس قانون سے پیدا ہوتا ہے، قومیت کو سیاسی اصول کی حیثیت سے مشتبہ سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے جزیرے کی بادشاہی میں مختلف قومیتیں داخل ہیں اور کلٹی آیرش لوگوں کے قومی جذبات نے ایک سے زائد بار سلطنت کے اتحاد کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ قومیت پر بہت زیادہ زور دینے سے ان کی ہندوستان اور سمندر پار ملکوں کی عالمگیر شاہی کے بھی خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ فرانسیسیوں کے ساتھ کشمکش میں ہسپانویوں نے اپنے اتحاد کو ایک قوم کی حیثیت

سے محسوس کیا اور فرانسیسیوں کو غیر ملکی سمجھکر ان سے نفرت کرتے رہے مگر وہ اپنی ان مساعی کو اس درجہ قومیت کی جد و جہد نہیں سمجھتے تھے جس قدر وہ اُنھیں شیاطین انقلاب کے مقابلے میں اپنے جائز بادشاہ اور کیتھولک مذہب کی مساعدت تصور کرتے تھے۔ اہل جرمانیا اختلافات مذہب اور شہنشاہی کے مختلف خاندانی سلطنتوں میں منقسم ہو جانے کی وجہ سے سیاسیات میں قومیت کا احساس بالکل کھو بیٹھے تھے اور جب فشتے نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور آرنٹ نے تحریروں سے جرمانی قومیت کے احساس کو تازہ کرنا چاہا تو صرف معدودے چند تعلیم یافتہ اشخاص نے اُدھر توجہ کی۔ رعیتوں نے جب اپنے کو جنگ اور موت کے منہ میں ڈال دیا تو صرف اس لئے کہ وہ اپنے زار اور اس کی مقدس شہنشاہی کو مغرب کے بیدینوں کے مقابلے میں بچانا چاہتے تھے ورنہ اپنے کو ایک قوم سمجھنے کا خیال ان کے ذہن میں مطلقاً نہیں تھا۔

فرانسیسی انقلاب نے مبہم طور پر قومیتوں کی آزادی کا اعلان کیا مگر شاہی کی "رجعت" کے بعد یہ خیال پیروں کے نیچے روند ڈالا گیا۔ وائینا کی کانگرس نے قومی حقوق پر مطلقاً لحاظ نہیں کیا اور بڑی بڑی اُمتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے واپس شدہ شاہی خاندانوں میں تقسیم کر دیا، جس طرح روس، آسٹریا اور پروشیا نے اس کے قبل ہی پولستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اُسی طرح اب اٹلی اور جرمانیا کی تقسیم متعدد شاہی سلطنتوں میں کر دی گئی اور بلجیم اور ہالنڈ باوجود متضاد قومیتوں کے ایک میں باندھ دیئے گئے۔

قومیت سنہ ۱۸۴۸ء کے بعد سے

اس امر واقعہ سے کہ قومیت کو نہ تو انقلاب کے مدبروں نے اور نہ رجعت شاہی کے مدبروں نے سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا، اس کا اثر موجودہ زمانے کی سیاسی تاریخ پر اور بھی زیادہ نمایاں اور حیرت انگیز ہو جاتا ہے۔ علم نے بالخصوص جرمانیا اور ایتالیا میں اس کے قبل ہی قومیت کے تصور کو ظاہر اور سیاسیات میں اس کے نتائج کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مگر اُمتوں کے اس فطرتی حق کی طرف کہ وہ اپنے کو سلطنت کی صورت میں ہویدا کریں عملی توجہ تقریباً ۱۸۴۸ء ہی سے ہوئی۔ قومیت کی تحریکات عوام الناس تک میں سابق کے بہ نسبت زیادہ زور کے ساتھ برانگیختہ ہو گئیں اور نہ صرف ادبیات میں بلکہ سیاسیات میں بھی خواہشوں کے پورے ہونے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُمتوں میں اپنے اتحاد کو سیاسی شکل میں بدلنے اور

قوموں" کی حیثیت اختیار کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی خاندانی دستور جو ازمنۂ وسطیٰ سے یورپی سلطنتوں کی وراثت میں چلا آتا تھا اب وہ قومی مطالبات و جذبات کے خطرے میں پڑ گیا تمام مملکتوں خصوصاً آسٹریا کو اُن مختلف قومیتوں کی آزادی حاصل کرنے کی متواتر کوششوں نے ہلا دیا جو وہاں سکونت پذیر تھیں۔ نئی مملکتوں اور اُن میں سب سے پہلے ایک متحدہ اٹیلیا اور جرمانی شہنشاہی کا قائم ہونا اسی تصور قومیت کی ولولہ انگیزی کا نتیجہ تھا جس نے ایک امت کے منتشر اجزا کو مجتمع کر کے انھیں ایک جسم سلطنت میں عضو بند کر دیا۔ اس قومی جوش و تحریک کی قوت میں کوئی کلام نہیں ہے گو کہ اس کی حد و غایت میں بحث کی گنجائش ہے۔

بہ ظاہر ہے کہ قومیت کو کلیسا کے بہ نسبت سلطنت سے زیادہ قریبی اور قوی تعلق ہے کیونکہ کلیسا کے لئے عالمگیر ہیئت کا اختیار کر لینا زیادہ آسان ہے سلطنت ایک قومی عضویہ ہے اور قوموں کے خصائص و جذبات زیادہ تر وہ انہیں متعین کرتی ہیں جو اس سلطنت کے اندر رہتی ہیں، اس لئے اُمت اور قوم کے درمیان ایک فطری تعلق اور مسلسل تعامل جاری رہتا ہے۔

اُمت کوئی سیاسی اجتماع نہیں ہے بلکہ ایک ایسا اجتماع ہے جو ایک مشترک تہذیب پر قائم ہے لیکن اگر واقعتہً اسے دماغی یکجہتی کا احساس ہو تو یہ امر طبعی ہے کہ وہ اُسے ایک ایسی عام آزادی کے ساتھ جو عملاً ظاہر ہو سکے ایک پوری شخصیت میں ترقی دینے کی خواہاں ہو گی یعنی دراصل وہ ایک سلطنت بن جانا چاہے گی۔

یہی ہے اس سیاسی اصول قومیت کی بنیاد جو آج مانا جاتا ہے۔ وہ اس پر قانع نہیں ہے کہ سلطنت قومی زبان، رسم و رواج اور تہذیب کی حفاظت کرے بلکہ وہ چاہتی ہے کہ خود سلطنت قومی سلطنت ہو جائے مجرداً ہم اسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہر امت کا یہ فرض اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ ایک سلطنت قائم کرے چونکہ نوع انسان کثیر التعداد امتوں میں منقسم ہے اس لئے دنیا کو بھی اسی تعداد کی سلطنتوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے ہر امت کے لئے ایک سلطنت ہو اور ہر سلطنت کی کی بنا قومیت پر ہو۔ کیا یہ واقعتہً صحیح ہے؟ ہمیں اول اُمت اور سلطنت کا مقابلہ باعتبار اُن کے حدود و وسعت کے کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ان میں کیا کیا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

اگر سلطنت کے حدود اُمت کے حدود سے تنگ ہوتے ہیں تو ان میں دد

متضاد رجحان پائے جاتے ہیں۔

رجحان تفرد

اگر شہریوں میں اپنے سیاسی اتحاد کا مضبوط و زندہ احساس موجود ہے تو سلطنت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باشندوں کی ایک جدید و ممیز اُمت قائم کرلے چنانچہ قدیم زمانے میں ایتھنز اور اسپارٹا والوں نے اپنی سیاسی تربیت اور تفرد کی وجہ سے جداگانہ قومیتوں کی صورت اختیار کرلی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں وینس اور جینوا والوں کا بھی حال ہوا اور اس سے بھی بعد کے زمانے میں ولندیزیوں (یعنی ڈچ لوگوں) اور کسی قدر سوئزرلینڈ والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا مگر سیاسی جذبات کی قوت سے ایک نئی اُمت بن جانے کی عظیم ترین مثال شمالی امریکی سلطنتوں کا انگلستان سے جدا ہوجانا ہے گو کہ اس میں شک نہیں کہ اس معاملۂ خاص میں جغرافی اختلافات کا بھی اثر ہے۔

رجحان اتحاد

لیکن دوسری طرف اگر قومی جذبات کسی تنگ سلطنت میں فسردہ ہوجاتے ہیں تو وہ اُس کے حدود سے باہر نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسی قومیت کی دوسری سلطنتوں سے ملکر ایک بڑی اور قومی سلطنت قائم کرلیں۔ قدیم زمانے میں فرانسیسی سلطنت کی اور اُنیسویں صدی میں متحدہ اٹالیا و متحدہ جرمانیا کی ابتدا یوں ہی ہوئی۔

(۲) ایک سلطنت میں متعدد امتیں داخل ہوں اور وہ (الف) پہلو بہ پہلو آباد ہوں

اگر سلطنت کے حدود ایک اُمت کے دائرے سے زیادہ وسیع ہیں یعنی اس میں دو یا زیادہ اُمتیں یا امتوں کے ٹکڑے شامل ہیں تو پھر اگر مختلف اُمتیں ایک ہی ملک میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنی مجموعی حیثیت سے آباد ہیں تو مختلف صورتیں پیدا ہوں گی:۔

(۱) جذب

(۱) سلطنت ایک امت کے برتر تمدن پر مبنی ہونے کی صورت میں بآہستگی دوسرے اجزا کے ہضم کرنے کی طرف مائل ہوجاتی ہے اور اس طرح تمام قوم کو ایک امت میں تبدیل کردیتی ہے۔ چنانچہ قدیم رومی شہنشاہی میں مغرب پر لاتینیت اور مشرق پر یونانیت چھا گئی تھی، اسی طرح موجودہ زمانے میں سلطنت بلجیم جس کی بنا قوم کو لون اور اس کے فرانسیسی پایۂ تخت بروسلز پر ہے وہ فلیمی (Flemish) آبادی کے اعلیٰ طبقات کو گال بنا لینا چاہتی ہے۔ اسی طرح روسی پولستان و الزاس کو

بزور روسی بنا لینا چاہتے ہیں۔

اس طریق میں کامیابی اُسی وقت ہوتی ہے جب ایک مادّی و غالب اُمت تعلیم اخلاق وطنیت اور طاقت میں دوسری اُمتوں سے قطعی طور پر فائق ہو۔ جرمانیوں اور ایرانیوں کی مقاومت نے روما اور قسطنطنیہ کی لاطینیت اور یونانیت کی عمل پیرائی کی دھجیاں اُڑا دیں۔

(۲) مختلف اُمتیں سیاسی انفصال کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ آئرلینڈ میں تنسیخ (اتحاد) کی تحریک اہل لمبارڈی اور اہل وینس کا آسٹریا سے جدا ہو جانا خود آسٹریا میں نظام سلطنت کے متعلق بالعموم تنازعات کا برپا رہنا آسٹریا اور ہنگری کی دوہری حکومت کی تجدید اسی طرح مگیاروں اور سلاووں اور جرمانیوں اور چیشوں کا تصادم ان سب سے اسی رجحان کی مستقل قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت مختلف اُمتوں کو باہم ملائے رہے بغیر اس کے کہ کسی ایک قومیت کو مرجح سمجھکر اسی کے موافق اوروں کی حالت کو بدل دے مگر اس صورت میں خود سلطنت کو غیر جانب دار ہونا اور تخصیص کے ساتھ قومی ہونے کے حقوق سے ہر طرح دست بردار ہو جانا چاہئے۔ اُسے ہر اُمت کو اُس کی اندرونی زندگی اور تمدن میں آزادانہ اختیار دینا چاہئے اور یہ خیال کر لینا چاہیے کہ سب کے حقوق یکساں ہیں۔ اس کی طرز عمل مخصوص قومی اغراض کے زیر فرمان نہ ہونا چاہیے بلکہ عام اغراض کے تابع ہونا چاہیے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے سویزرلینڈ نے سلطنت کے اتحاد کو خطرہ پہنچائے بغیر مختلف قومیتوں کو پہلو بہ پہلو برقرار رکھنے کے مشکل مسئلہ کو حل کر لیا اور اس طرح پر جرمانیا فرانس اور اتالیا کے درمیان کے اس پہاڑی ملک میں ان تین بڑی امتوں کے ٹکڑوں نے چھوٹی چھوٹی جمہوری جماعتیں قائم کر لیں اور انہیں اور غیر جانب داری کے ساتھ متحد ہیں اس میں شک نہیں کہ منفرد صوبوں میں قومی خصوصیت موجود ہے۔ اب چاہے یہ اس وجہ سے ہو کہ ان خاص صوبوں میں ایک ہی امت آباد ہے جیسے شمالی اور مشرقی سوئٹزرلینڈ میں جرمانی یا مغربی سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی یا ٹیسنیو میں اتالوی آباد ہیں اور چاہے اس وجہ سے کہ ایک خاص قومیت کو قطعی غلبہ حاصل ہے۔ جیسے برن اور گراؤبنڈن میں جرمانیوں کو ویلشوں پر غلبہ حاصل ہے اور فرایبرگ اور والیس میں فرانسیسیوں

کو جرمانیوں پر۔

(ب) مصنوعی طاقت کے ذریعے سے

مختلف اُمتوں کو بلا تمیز سیاسی اتحاد میں قائم رکھنے کا ایک بالکل ہی دوسرا طریقہ جوزف ثانی کے آسٹریا کو جرمانی بنا لینے کی کوشش کی ناکامی کے بعد ایک مدت تک آسٹریا کی حکمت عملی سے ظاہری کامیابی کے ساتھ چلتا رہا وہ طریقہ یہ تھا کہ ہر منفرد سلطنت کو باقی دوسری سلطنتوں کی قوت سے دبا رکھنا چاہیے لیکن جبری اتحاد کا یہ بے روح طریقہ منتشر اجزا کو صرف مصنوعی طور پر متحد رکھے گا اور وہ بھی صرف اُسی وقت تک جبتک جابر طاقت کا خوف غالب ہے" اگر اُس کی آہنی گرفت ڈھیلی پڑ جائے یا وہ اپنا اثر نہ ڈال سکے تو ستم رسیدہ قومیتیں بہت زور کے ساتھ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں آسٹریا نے ۱۸۶۶ء کے بعد سے اس امر کو سمجھ لیا ہے۔

(ب) انہضام

ایک ہی ملک میں مختلف امتیں بجائے خود مجتمع ہوکر ایک دوسرے سے متصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ آپس میں خلط ملط ہوکر رہتی ہیں پس ایسی حالت میں سلطنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے البتہ اگر خطرہ ہے تو یہ کہ کمزور امت کو قوی اُمت مغلوب اور بالآخر تباہ کردیگی۔ اعلیٰ دماغی قابلیت رکھنے والی اُمت حاوی ہوجاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ دوسری اُمتوں کے منفرد اجزا کو ہضم کرلیتی ہے یہی وجہ تھی کہ جو جرمانی سابق رومی صوبوں میں بستے تھے وہ بالآخر رومی ہوگئے گو کہ وہ خود حکمراں نسل سے تھے، اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ میں آئرلینڈی، جرمانی اور فرانسیسی دو تین پشتوں کے بعد اینگلو سیکسن آبادی میں جذب ہوجاتے ہیں۔

قومیت کے دعاوی کا خلاصہ

اس عام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قومیت اور سلطنت کے اصول ایک دوسرے پر مؤثر ہوتے ہیں مگر اُمت اور قوم لازمی طور پر بہمہ وجوہ مرادف نہیں ہیں اس لئے ہم قومیت کے اصول کو ایک ضمنی دعوے سے زیادہ نہیں قرار دے سکتے اور زیادہ غائر نظر سے دیکھنے سے ہم نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں۔

(۱) سیاسی قابلیت

ہر اُمت میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ سلطنت کی بنا ڈال سکے اور اسے قائم رکھ سکے، اور صرف وہی اُمت ایک آزاد قوم بن سکتی ہے جو سیاسی قابلیت رکھتی ہو۔ جن اُمتوں میں خود قابلیت نہیں ہوتی انھیں ضرورت ہے کہ دوسری زیادہ ذی جوہر قومیں اُنکی رہبری کریں، کمزور اُمتوں کو یا تو دوسری اُمتوں سے

مل جانا پڑے گا یا اپنے سے زیادہ قوی طاقتوں کی حفاظت میں آنا پڑے گا چنانچہ تمام مغربی یورپ میں کلٹک امتوں کا صرف یہی کام ہے کہ وہ بے چون وچرا رومانی اور ٹیوٹنی سلطنتوں کی تعمیر کے لئے غیر متحرک مواد کا کام دیں۔ جنوب مغربی یورپ کی بہت سی مختلف اُمتیں اپنی سیاسی ہستی صرف اسی طرح قائم رکھ سکتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار کریں، ہندوستان میں انگریزی حکومت کا استحقاق اسی بنا پر ہے کہ اُس ملک کی اُمتوں کو اپنے سے ایک بلند تر قوم کی رہبری کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک قومی سلطنت کی بنیاد ڈالنے اور اسے قائم رکھنے کی پوری دماغی اور اخلاقی طاقت صرف وہی اُمتیں رکھتی ہیں جن میں مردانہ قوتیں (مثلاً فہم اور جرات) غالب ہوں۔ جن اُمتوں میں زنانہ صفات غالب ہوتے ہیں وہ انجام کار کہیں ہمیشہ دوسری فائق قوتوں کی محکوم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ اُمت کا جوہر اصلی اس کے مشترکہ تمدن میں مخفی ہے نہ کہ سیاسی اتحاد میں اس لئے ممکن ہے کہ کسی اُمت کو اپنی تمدنی قرابت مندی کا احساس ہوا ور پھر بھی وہ اپنے سیاسی خیالات میں غیر متحد ہو۔ ممکن ہے کہ ایک حصہ اُس کا شاہی کی طرف مائل ہو اور دوسرا جمہوریت کی طرف راغب ہو اور ہر ایک اپنے پسند کردہ سیاسی منتہائے خیال کے حاصل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہو اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اُمت مختلف صورتوں کے نظام سلطنت میں اپنی خصوصیت کو ظاہر کرے اور اسی مختلف النوع تعمیر سلطنت سے اُسے تشفی حاصل ہو مگر یہ تخالف کبھی اُمت کی سیاسی کمزوری کا باعث ہو جاتا ہے۔ یونانی جو اول مقدونیہ اور بعد کو روما کے شکار ہو گئے اُس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتوں میں منقسم ہو گئے تھے ایسی ہی تفریقوں کی وجہ سے اٹیلیا اور جرمانیا اپنے تئیں بیرونی قوت کی زد سے پوری طرح نہ بچا سکے اور اسی وجہ سے اُن کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔

دوسری جانب ایک اُمت کا دو یا زاید سلطنتوں کی صورت میں نمو حاصل کرنا بسا اوقات اس اُمت کے ذرائع و وسائل کو مالا مال کر دیتا اور ایک بلیغ قوت حیات کا ثبوت دیتا ہے جیسا کہ انگلستان اور شمالی امریکہ کی اینگلو سیکسن برادرانہ

سلطنتوں کا حال ہے جن میں سے ایک میں اعیانی بادشاہت قائم ہے اور دوسری میں عمومی جمہوریت ہے اسی طرح جرمانی شہنشاہی سے باہر ایک جرمانی سوئٹزرلینڈ اور ایک جرمانی آسٹریا کا وجود جرمانی اُمت کی وسعتِ وسائل کا ثبوت ہے۔

(۳) سیاسی موزونیت۔

کوئی امت جسے خود اپنا احساس ہو اور جس میں سیاسی موزونیت موجود ہو اُسے ایک سلطنت میں متشکل ہو جانے کی طبعی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اگر اس اشتیاق کے پورا کرنے کی طاقت بھی اس میں موجود ہے تو ضرور اسے اپنی ایک سلطنت قائم کرنے کا فطرتی حق حاصل ہے۔

کسی امت کی بقا و ترقی کے اعلیٰ حق کے مقابلے میں اُس کے منفرد ارکان اور اُس کے بادشاہوں اور امیروں کے حقوق محض ایک ذیلی اہمیت رکھتے ہیں۔ نوعِ انسان کی غایت پوری نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ وہ امتیں جن سے وہ مرکب ہے اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو پورا کرسکیں بقول پرنس بسمارک کے امتیں اگر زندہ رہنا چاہتی ہیں تو انھیں سانس لینے اور ہاتھ پانوں ہلانے کے قابل ہونا چاہیے۔ اُمتوں کے سیاسی تشکل اختیار کرنے اور اپنی عام زندگی کی حرکت و اظہار کے لیئے اپنے اعضا کو ترقی دینے کے مقدس حق کی بنا یہی ہے، خود انسانیت کے حق کو چھوڑ کر بقیہ تمام حقوق میں سب سے زیادہ مقدس اور اُن سب کی بنیاد اور رابطہ یہی حق ہے۔

(۴) قومی سلطنت

مگر ایک قومی سلطنت کے قائم ہونے اور برقرار رہنے کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس اُمت کے تمام لوگوں پر حاوی ہو۔ قومی سلطنت کی تعمیر کا امت کے صرف ایک ایسے بڑے اور قوی حصے پر محتوی ہونا کافی ہے جو اپنے اخلاق اور جذبے کو سلطنت پر موثر طور پر کلیتہً نافذ کرنے کی کافی وسعت و قوت رکھتا ہو۔ اس لئے قومی سلطنت کے حدود کو اتنا ہی وسیع کرنے کی خواہش جتنی اُمت کی زبان وسیع ہو گویا قومی اصول کا از اندازہ ضرورت کھینچ تان کرنا ہے ایسی خواہش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت کے حدود بھی ویسے ہی متحرک ہو جائیں جیسے زبان کے حدود اور یہ تزلزل خود شخصیتِ سلطنت کے استمرار اور حقوق کی عام محافظت کے منافی ہوگا۔ فرانس اپنا لیا اور شاہی جرمانیا قومی سلطنتیں ہیں گو کہ فرانسیسی اپنا لوئے

اور جرمانی امتوں کے ایسے اجزا بھی موجود ہیں جو اُن سلطنتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔

کوئی امت جو قوم بن گئی ہو یا قوم بننے کے قریب ہو وہ اپنے ایسے منتشر اجزا کو جمع کرنے کا حق رکھتی ہے جو اس کی بقائے ہستی کے لئے ضروری ہوں لیکن اگر وہ اُن کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتی ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انھیں کسی دوسری سلطنت کے اتحاد سے جس سے وہ مطمئن ہو بزور علیحدہ کرے۔

اعلیٰ التعمیر سلطنت اپنے تئیں کسی ایک اکیلی "قومیت" (یعنی اُمت) تک محدود نہیں رکھتی۔ انسانیت کی ترقی اپنی شرط اولین کے طور پر یہ چاہتی ہے کہ نہ صرف اُمتوں کا آزادانہ ظہور اور اُن کے آپس میں مقابلہ ہو بلکہ وہ بار بار یہ بھی چاہتی ہے کہ اُمتیں آپس میں متفق ہو کر اعلیٰ اتحاد بھی پیدا کریں۔ قانون کا انحصار اُمتوں کی طبعی خصوصیات کے بہ نسبت انسانی طینت پر زیادہ ہے۔ مہذب قوموں کا ترقی یافتہ قانون قومی رسم ورواج سے زیادہ انسانی تعلقات کی ضروریات سے متعین ہوتا ہے سلطنت کے اصولی تنظیمات، مختلف قوموں میں ایک ہی ہیں۔ سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بنا انسانیت پر ہو۔

پس ایک قومی سلطنت میں مختلف قومیتیں شامل ہو سکتی ہیں، یہانتک کہ وہ سلطنت جس کی بنا صاف طور پر قومی اصول پر ہو وہ بھی بیرونی اجزا کے شمول سے (جو دوسری اُمتوں کے تمدن سے سلسلۂ ارتباط پیدا کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کا کام دیں) وسعت وتنوع حاصل کر سکتی ہے۔ یہ مخالطت کبھی سلطنت کے لئے نہایت سودمند اور معین ترقی ہوتی ہے اُسی طرح جیسے اعلیٰ دھاتوں میں تانبے کا میل اُن کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ داد وستد کی ضرورتوں میں سکّہ بن کر چل سکیں۔

بخلاف اس کے سلطنت کی یکجہتی کے لئے یہ بہت ہی مفید ہے اگر قوم کی بنا بحصۂ غالب ایک معین قومیت پر ہو اور آبادی کے دوسرے اجزائے ترکیبی کا

واکمل
نت۔

پڑتا اُس کے مقابلے میں قلیل التعداد ہو جیسے کہ روس میں جرمانی، پروشیا میں سلاوی، جرمانیا میں یہودی اور شمالی امریکہ میں فرانسیسی جب کہ متعدد امتیں قوت اور اہمیت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہوں اُس صورت میں یہ بہت ہی مشکل ہے کہ قوم کا اتحاد قائم و برقرار رہے انگلستان کو اس مشکل پر اس طرح غالب آنا پڑا کہ پہلے سکسونی نارمنوں سے متحد ہوئے پھر انگریزوں نے اسکاچ سے اتحاد کیا اور آخر میں یہ دونوں آئرلینڈ سے متحد ہوگئے، یہ وہ مشکل ہے جس پر آسٹریا ابھی تک غالب نہیں آسکی ہے۔

(۷) مساوات

اگر کوئی سلطنت مختلف امتوں سے مرکب ہو جو سب ملکر ایک قوم نہیں ہوں تو سیاسی حقوق قومیت کے اعتبار سے تقسیم نہیں کئے جاسکتے بلکہ سیاسی جمعیت اور حقوق یکسانی بلالحاظ قومیت کے قائم رکھنا چاہیئے۔

(۸) تاریخ کا فیصلہ

قانون بین الاقوام کی ناتکمل حالت میں کسی انسانی قانون کی رو سے اس امر کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس حد تک کوئی امت ایک سلطنت کے قائم کرنے کی اہلیت وقابلیت رکھتی ہے اس کا فیصلہ صرف خدا کے حکم سے ہو سکتا ہے جو تاریخ عالم کے ذریعے سے ظاہر کیا گیا ہے، عموماً یہی ہوتا ہے کہ بڑی جد و جہد سے بہت تکالیف برداشت کرنے اور بہت سے کام انجام دینے ہی سے کوئی قوم اپنے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کرسکتی ہے۔

سلطنت کو بہ حیثیت جسم قومی کے۔

اگر سلطنت بہ حیثیت قوم کے جسم ہونے کے کار منصبی کو پورا کرنا چاہتی ہے تو یہ صاف واضح ہے کہ اُس کے قوانین و تنظیمات کو قوم کی ضرورتوں اور قابلیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے خلاصہ یہ کہ اُسے عام پسند ہونا چاہیئے۔ ایک ایسا دستور سلطنت جو قوم کے خصائل کے لئے موزوں نہیں، جو اُس کی خصوصیات کی پروا نہیں کرتا اور جو اُس کے جذبات وخیالات سے موافقت نہیں رکھتا وہ ایک غیر طبعی اور ناکارہ جسم ہے۔ اگر کوئی غیر طاقت کسی امت پر ایسے غیر موزوں دستور کو جبراً عائد کردیتی ہے یا جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کسی بڑے سیاسی ہیجان کے وقتوں میں کوئی غلط رو اور بیمار قوم اُسے خود اختیار کرلیتی ہے تو جوں ہی وہ باہری طاقت کمزور پڑجاتی ہے یا قوم دوبارہ عقل سے کام لینے لگتی ہے، فوراً ہی وہ نظام سلطنت منہدم ہوجاتا ہے مگر دونوں صورتوں میں سیاسی جسم کو ایسا شدید نقصان پہنچ جاتا ہے کہ اُس میں قوم کے زوال تک کا امکان موجود ہوتا ہے

اور کم از کم اس کی طاقت تو ایک مدت کے لئے ضرور ہی پژمردہ ہو جاتی ہے۔
ہر بڑی اُمت جو ایک سلطنت والی قوم بننے کی موزونیت رکھتی ہے وہ بحیثیت سلطنت کے اپنا ایک خاص سیاسی نصب العین اور اپنا ایک مخصوص فرض رکھتی ہے اور یہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جبتک کہ قوم اپنی خاص خصلت سے سلطنت کو موثر نہ کردے۔ کسی قوم کے قومی نظام سلطنت کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔ اس لئے نظامہائے سلطنت کا اختلاف قوموں اور اُمتوں کے ان مواہب سے مطابقت رکھتا ہے جو خدا نے اُنھیں عطا کی ہیں۔

قوم کے نشو ونما کے ساتھ ترقی کرنا چاہیئے

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی قوم کے تخصیصی صفات اُس کی سلطنت میں ایک ہی بار منعکس ہو کر ہمیشہ کے لئے اُسی نہج سے رونما رہتے ہیں۔ قوم اپنے نمو کے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے اور اس کی ضرورتیں اور اُس کے خیالات اُس کی عمر کے دوروں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں گو کہ خود قوم وہی رہتی ہے جو تھی، ایک قومی اور عام پسند سلطنت نمو کے ان مراحل میں بھی قوم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اپنے اعضائے عمل میں بھی اُن کے مطابق تغیر و تبدل کرتی جاتی ہے مگر اپنی شخصیت کو کلیۃً نہیں بدل دیتی۔ رومی ہی سلطنت کو دیکھو کہ اُس کی تاریخ کے مختلف دوروں میں اُس کی ظاہری صورت کس درجہ مختلف رہی ہے مگر اس پر بھی کتنے واضح طور سے اُس سلطنت میں رومی جبلّتِ قومی ہمیشہ رونما رہی۔ شاہی جمہوریہ اور شہنشاہی قوم کے مختلف مدارج حیات کے موافق صورت پذیر ہوتی رہی ہیں، اور ان سب میں روما کا نقش صاف نمایاں ہے، انگلستان میں خاندان ٹیوڈر کی شاہی، خاندان ہینوور کی شاہی سے اُسی مناسبت سے مختلف تھی جس نسبت سے سولھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگریز قوم کی ترقی کے مدارج مختلف تھے۔ کسی قوم کے اپنے نظام حکومت کو زمانے کے موافق رکھنے کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ سلطنت مطابق فطرت ہے جو ہر وقت اُس میں بسنے والی قوم کے خصوصیات اور مدارج ارتقا کے مطابق رہے۔

تعلیقات

(۱) سیسرو کی کتاب "ریپبلک" (ج ۲ (۲۱) میں کاٹو کہتا ہے: "دستور سلطنت نہ کسی ایک زمانے کی چیز ہے نہ کسی انسان کی۔"

(۲) فریڈرش اعظم (اپنی کتاب ماکیاویل ۱۲۰۔ میں) کہتا ہے: "کائنات میں ہر چیز مختلف ہے: انسانوں کے طبائع مختلف ہیں اور فطرت نے وہی اختلاف سلطنتوں کے طبائع میں بھی پیدا کر دیا ہے۔ سلطنت کی طبیعت سے میری مراد ہے اس کا محل وقوع، اس کی وسعت کے حدود، اس میں بسنے والی قوموں کی تعداد اور ان کے جذبات کی افتاد، اس کی تجارت، اس کے رواج و عادات، اس کے قوانین، اس کی قوت، اس کی کمزوریاں، اس کی دولت اور اس کے وسائل۔"

(۳) ڈیمیسٹر (۱۷۹۶ء) اپنی کتاب "فرانس کے متعلق خیالات" (کون سی ویراسیون سیور لافرانس (Considerations sur la France) باب ۶ میں کہتا ہے: ایک دستور سلطنت جو تمام قوموں کے لئے بنایا گیا ہو وہ کسی قوم کے بھی کام کا نہیں۔ وہ ایک نری تجرید ہے اور متکلمین کی گھڑی ہوئی ایک چیز ہے جس کا مصرف سوا اس کے کچھ نہیں کہ انسان کا دماغ خیالی مقدمات کے قائم کرنے کی مشق کرے اور جس کے مخاطب وہی انسان مطلق ہیں جو صرف تخیل کے فضا میں پائے جاتے ہیں۔"

(۴) نپولین (۱۸۰۳ء میں) سوئٹزرلینڈ والوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے: "حکومت کی ایسی شکل جو ایک قوم کے واقعات اور ناکامیوں، جد و جہد اور اولوالعزمیوں کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ نہ ہو وہ کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتی۔"

(۵) سیس مون دی اپنے "آزاد قوموں کے دستور کے مطالعات" (مقدمہ ص ۳۸) میں کہتا ہے: "کسی قوم کے صرف قوانین ہی نہیں بلکہ اس کا دستور بھی اس کے میلان، یادِ ایام اور طرز تخیل پر قائم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک حد درجے کا سطحی اور غلط محرکِ عمل ہے کہ کسی قوم کے لئے ایک ایسا نیا دستور قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو اسی قوم کے مزاج اور اس کی تاریخ کے مطابق نہ ہو بلکہ جس کی

بنیاد چند عام فقروں پر رکھی گئی ہو جن کو لوگوں نے غلطی سے "اصول" کا باوقعت نام دے رکھا ہے پچھلے پچاس سال میں بہت سے دستور بڑے بڑے دعووں کے ساتھ قائم ہوئے اور بہت سے دستوروں کو ایک ملک نے دوسرے سے لے کر اختیار کیا۔ لیکن اس طویل تجربے سے بھی یہی بات ثابت ہوئی کہ ان تمام دستوروں میں سے ایک نے بھی اپنے بنانے والے کی آرزوؤں یا جس قوم کے لیے وہ دستور بنایا گیا تھا اُس کی امیدوں کو پورا نہیں کیا ہے!

(۶) ٹرائیکے (رسالہ = Zeitschriflft ج ا ص ۱۹۱) کہتا ہے: "ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک اصول عمل ہے۔ مگر پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قومی آزادی تمام طبائع میں جاری و ساری ہے اُس کے معنی کیا ہیں۔ کیا اُس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ کوئی غیر ملکی جج (حاکم قضا) ہمارے شہروں میں نشست نہ کرے اور کوئی غیر ملکی فوج ہماری زمین پر سے نہ گذرے؟ اس سے بڑھ کر کیا اُس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے آزاد ہو کر اپنی خاص ذہنی طاقتوں کو ان کی انتہائی حد قابلیت تک ترقی دیں؟"

پانچواں باب

نظم معاشرت (سوسائٹی)

فرانسیسی سیاسی نظریہ خاصکر روسو کے وقت سے اس خیال کی طرف مائل رہا ہے کہ سلطنت کو سوسائٹی کے ہم معنی اور راست و قوم کے تصورات کو سوسائٹی کے تصور کے مرادف سمجھنا چاہیئے مختلف اصطلاحوں کی اس تلبیس کی وجہ سے سلطنت کے علم میں خلط مبحث ہوگیا ہے اور سیاسی عمل و دستور کو بھی نقصان پہنچا ہے جرمانی سیاسی نظریہ زیادہ دقیق طور پر ان مختلف تصورات میں فرق کرتا ہے اور بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے اس سے سلطنت کو ایک زیادہ قوی بنیاد اور زیادہ مستحکم عمل حاصل ہوتا ہے اور معاشرت کی آزادی سلطنت کی تعدی سے محفوظ رہتی ہے۔

نظم معاشرت کا تعلق (۱) قوم اور سلطنت سے

"قوم" لازماً ایک مربوط مجموعہ ہے بخلاف اس کے معاشرت افراد کی ایک تعداد کا ایک اتفاقی اجتماع ہے۔ قوم سلطنت کی صورت میں مجسم ہوکر ایک ذی حیات شے کی طرح سر و اعضا رکھتی ہے، معاشرت افراد کا ایک غیر عضو بند انبوہ ہے۔ قوم ایک قانونی شخصیت رکھتی ہے، معاشرت کوئی مجموعی شخصیت نہیں رکھتی بلکہ محض ایک انبوہ ہے جو بہت سی شخصیتوں سے مرکب ہے۔ قوم اتحاد ارادی سے غرض ہے اور سلطنت کے اندر اپنے ارادے کو عمل میں لانے کی قوت رکھتی ہے سوسائٹی کا نہ کوئی مجموعی ارادہ ہے اور نہ اس کی کوئی مختص سیاسی طاقت ہے، وہ نہ قانون بنا سکتی ہے، نہ حکومت کر سکتی ہے، نہ عدالت کو عمل میں لا سکتی ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں صرف ایک رائے عامہ ہے اور وہ سلطنت کے اعضاء پر اپنے بیشتر بالکل افراد کے خیالات، اغراض اور مطالبات کے موافق بالواسطہ اثر ڈالتی ہے قوم ایک سیاسی تخیل ہے سوسائٹی سلطنت کی قلمرو میں ذاتی حیثیت سے افراد کا

ایک تغیر پذیر مجموعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم اور سوسائٹی جو ایک ہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے متعدد طریق سے ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ سلطنت سوسائٹی کے لئے قانون وضع کرتی، اس کی حفاظت کرتی اور مختلف طریقوں سے اس کے اغراض کو ترقی دیتی ہے۔ دوسری جانب سوسائٹی اپنے معاشی اور ذہنی وسائل سے سلطنت کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایک مصیبت زدہ سوسائٹی سلطنت کو بھی اپنے ساتھ مصیبت میں ڈال دیتی ہے، ایک بیمار سوسائٹی سلطنت کو بھی خطروں سے دوچار کر دیتی ہے، بخلاف اس کے ایک صحتور خوش حال اور تربیت یافتہ سوسائٹی سے سلطنت کو تقویت ہوتی ہے اور اس طرح کی سوسائٹی سلطنت کی بہبود کے لئے شرط لازمی ہے۔

مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ سوسائٹی اور سلطنت کے درمیان کامل ہمنوائی ہو۔ بعض وقت سوسائٹی اپنے ہی خاص اغراض پر نظر رکھنے کی وجہ سے یا رائے عامہ کے سیماب صفت اثرات سے متاثر ہو کر سلطنت سے ایسے مطالبات کرنے لگتی ہے جنھیں سلطنت نامنصفانہ یا غیر دانشمندانہ سمجھکر مسترد کرنے پر مجبور ہوتی ہے بعض وقت سلطنت سوسائٹی سے ایسے خدمات اور ایسے ایثار کی خواہاں ہوتی ہے جن کی انجام دہی سوسائٹی پر گراں ہوتی ہے سلطنت کی دائمی حفاظت (کی ضرورت) کبھی کبھی وقتی اغراض و خواہشات سے ٹکرا جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً معاشرت میں ابتری پھیل جاتی ہے جسے رفع کرنا سلطنت ہی کا کام ہے، اور اسی طرح کبھی سلطنت نئے دستور یا اس کے نظم ونسق میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے رفع کرنے کی تحریک سوسائٹی کی طرف سے ہوتی ہے۔ قانون عامہ اور سیاسیات کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ مناقشات کا فیصلہ اور ان کی تلافی عادلانہ اور دانشمندانہ طور پر کر دی جائے۔

اسی طرح سوسائٹی اور امت کے تصورات بھی ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ بھی بالکل مرادف نہیں ہیں۔ ایک متوارث امت کے مقابلے میں سوسائٹی افراد کا ایک تغیر پذیر ازدحام معلوم ہوتی ہے، امت نے اپنی روح عامہ

کے حیاتی اظہار کے لیے ایک عام زبان پیدا کر لی ہے اور سوسائٹی اپنی حسب آسائش قومی زبان کا استعمال کرتی ہے مگر سوسائٹی کی حیثیت سے اُس کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی، ایک اُمت شاخ در شاخ ہو کر مختلف سلطنتوں میں پھیل سکتی ہے ہم اپنے تصور معاشرت کو صرف ایک ہی سلطنت کے باشندوں تک محدود رکھتے ہیں، یا مثلاً اگر ہم "یورپی سوسائٹی" کہتے ہیں تو تمام متمدن یورپی سلطنتوں کے باشندوں کو اس میں شامل کر لیتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ مختلف اُمتوں سے تعلق رکھتے ہیں، خود سلطنت کے اندر سوسائٹی کا تصور امتی اختلافات سے آزاد ہے اور اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو سلطنت کے اندر رہتے ہیں۔ اُمت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم مادی حیثیت سے اپنی ایک خاص فطری تنظیم رکھتی ہے اور سوسائٹی صرف منفرد اشخاص کا ایک مجموعہ ہے۔

گناسٹ کی معاشرت حرفت

گنا لسٹ نے سلطنت اور معاشرت کے فرق کو نمایاں کر کے اور اُن کے تصادم کی طرف توجہ دلا کر علم السیاست کی ایک خدمت انجام دی ہے مگر اُس کے ہمنوا ہو کر موجودہ زمانے کی سوسائٹی کو کاروباری سوسائٹی کہنا بہت ہی تنگ نظری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دولت کا حصول سوسائٹی کے سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ وسیع الاثر اغراض میں سے ہے مگر پھر بھی سوسائٹی کی صرف یہی ایک غرض نہیں ہے ورنہ یہ غرض سب سے زیادہ اہم غرض ہے۔ سوسائٹی دولت کے انتفاع سے بھی ویسا ہی تعلق رکھتی ہے جیسا اس کے حصول سے مزید براں دولت کے تمام خیالات سے قطع نظر سوسائٹی خاندانی زندگی کو بھی بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے؟ وہ مدنیت کی قدر کرتی ہے اور تہذیب و شائستگی ادبیات اور فنون لطیفہ سے پر جوش دلچسپی رکھتی ہے۔ سوسائٹی کی تعریف کرتے وقت محض حصول دولت پر زور دینا اسے زائد از ضرورت مادی اور خود غرض بنا دینا اور افکار ذہنی اور بہبود عامہ کے متعلق اُس کی ساری کوششوں کو نظر انداز کر دینا ہے اس دعوے کی صحت کی کافی تائید اُن کثیر التعداد اداراتِ و انتظامات سے ہوتی ہے جنھیں غریبوں اور بیماروں کی آسائش اور علوم و فنون کی

ترویج کے لئے سوسائٹی نے بغیر سلطنت کے دباؤ کے برضا و رغبت خود قائم کر لیا ہیں اور کثیر دولت اُن کے لئے وقف کر دی ہے ۔

چھٹا باب

قبائل

جس طرح انسانی نسلیں مختلف اُمتوں میں منقسم ہو جاتی ہیں اُسی طرح اُمتیں قبائل میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ ایک دقیق النظر مبصر اُمتوں کی زبان، رسم و رواج و قوانین سے اُن کے آپس کی قرابت کا پتہ چلا لیتا ہے مگر خود وہی اُمتیں جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئی ہیں اور ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتیں۔

قبائل سے اُمت کے اندرونی تفرقوں کا اظہار ہوتا ہے۔

بخلاف اس کے ایک ہی اُمت کے مختلف قبائل اپنی مشترکہ زبان اور رسم و رواج کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایک عام زندگی میں مربوط ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مشترک قومیت کے احساس کی راہ میں قوم کے اندرونی یعنی قبائلی امتیازات و خصوصیات حائل ہو جاتے ہیں، اور وہی اجزا جو قوم کے وسیع دائرے میں شامل تھے ایک دوسرے سے گو جدا ہو جاتے ہیں مگر اُمت کی زبان جس سے سب ہی قبیلوں کے کان یکساں آشنا ہوتے ہیں، اُمتی یکجہتی اور قرابت کے احساس کو بیدار رکھتی ہے۔ مقامی بولیوں میں قومی اتحاد اور قبائلی خصوصیت دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان بولیوں کو زبان سے وہی نسبت ہے جو خاص قبائلی قانون کو عام اُمتی قانون سے ہے۔ اُمتوں کے مانند قبائل بھی تاریخ کی پیداوار ہیں اور تاریخ ہی اندرونی تفریقات کو نشو و نما دیتی اور روشنی میں لاتی ہے مگر یہ قبائل اُمت کے صرف ٹکڑے ہیں یعنی وہ خود کوئی اپنا مستقل قومی کینڈا نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف عام قومی جذبے کو مختلف رنگ و پیرایہ میں نمایاں کرتے ہیں۔ اس طرح قبیلے قائم رہتے اور اپنی جداگانہ ہستی کو مستقل کر لیتے ہیں اور اُن تفریقات کو جو قومی خصوصیات پر اثر ڈالتی ہیں، زندہ رکھتے ہیں۔ یہ تفریقیں جہاں قومی زندگی میں برگ و بار اور رنگارنگی پیدا کر دیتی ہیں وہاں بسا اوقات اتحاد

اُن کا اچھا اور برا اثر۔

سلطنت کے لئے ایک روک بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اگرچہ فرقوں کے اندرونی مناقشات سے جو فی الاصل قبائلی اختلافات پر مبنی تھے روما کو قوت حاصل ہو گئی مگر یہی قبائلی عناد کی شدت تھی جس نے یونانیوں کو ایک دیرپا مجموعی سلطنت بنانے سے روک دیا ڈوریں نظام سلطنت یونی سے مختلف تھا اور ایٹولی نظام ان دونوں سے جُدا۔

جدید یورپ میں بھی قبائلی عناد بڑا اثر رکھتے تھے خاصکر جرمانیوں میں جن کا قدیم نظام حکومت قبیلوں کی تنظیم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی انفرادیت پسندی کو اس سے ویسی ہی قوی مدد ملی جیسی موجودہ زمانے کے رجحان اتحاد کو اس سے سخت رکاوٹ پیش آرہی ہے۔ ایتالیا اور جرمانیا کی تاریخوں سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں ملکوں میں قدیم قبائل بہت پہلے ہی شکست ہو چکے تھے۔ ایتالیا میں زیادہ تر شہروں کی آزادانہ ترقی کی وجہ سے ایسا ہوا اور جرمانیا میں بالتخصیص بادشاہوں کی طرز روش اور ملکی امرا کی تفریق اس کا باعث ہوئی۔ بایں ہمہ قبائلی احساس اور انفرادیت شہروں میں ایک طاقت کی حیثیت سے برقرار رہی اور اگرچہ قدیم قبائلی ڈچیوں کے ایک بار شکست ہو جانے کے بعد مختلف قبائل بڑی بڑی مملکتیں قائم کرنے کے لئے متحد ہو گئے پھر بھی جرمانی شہنشاہی کے زوال میں قبائلی بغض وعناد کا بہت بڑا دخل تھا اور جرمانی اتحاد کے مخالفین آج بھی قبائلی تعلقات سے کام لیکر قومی ترقی کو اگر بالکل روک نہیں سکتے تو اس میں دقتیں ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک نئی قوم کے بننے کے لئے قبیلہ ابتدائے کار کا کام دیسکتا ہے۔ قبیلے میں ایک امت بننے کے بجائے ایک نئی قوم اور ایک نئی سلطنت بن جانے کا (خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی سلطنت ہو) زیادہ امکان ہوتا ہے۔ امت کا بننا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب پوری مخالفت واقع ہو اور اس کے ساتھ ہی زبان بھی بدل جائے جیسا کہ ایتالیا میں لمبارڈی کے ٹیوٹنی (جرمانی) قبیلے کو پیش آیا یا یہ کہ قبیلہ اپنی مختص مقامی زبان کو ترقی دیکر ایک نئی زبان بنا دے جیسا کہ ولندیزیوں نے کیا۔

ساتواں باب

ذاتیں

قوم اور قبیلے کے اندر تقسیم

اُمتیں، قومیں اور قبیلے سب ہی بہ ظاہر جغرافی حدود کے ذریعے جدا جدا دکھائی دیتے ہیں، مگر ان ہی اُمتوں، قوموں اور قبیلوں کے اندر ہی اندر ایسی مزید تفریقیں بھی موجود ہیں جو جغرافی لحاظ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور جو ایک سیاسی اہمیت رکھتی ہیں۔ اِن تفریقوں کو نظم معاشرت کے مستقل عناصر یا مجموعی زندگی کے مختلف رجحانات یا سیاسی اہمیت و ترقی کے مختلف مدارج کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ذاتیں یا طبقات یا درجات کہیئے۔

ذات کے طریقے پر ہندوستان میں تو بہت ہی کامل عمل ہوا ہے مگر مصر اور ایران میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کا تعلق مقدماً ایشیا کے آریوں سے ہے۔ یورپ میں اسے کبھی سرسبزی حاصل نہیں ہوئی البتہ امریکہ میں گوری اور کالی نسلوں کے فرق کی وجہ سے اس کے شیوع کی ایک نئی صورت نکل آئی ہے۔ طبقات کا طریقہ بہت ہی قدیم و جدید دونوں زمانوں کی قوموں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اسے انتہائی ترقی ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ٹیوٹنی اقوام کے درمیان حاصل ہوئی۔ درجات کے طریقے میں اولاً ایک ایسی سلطنت کا وجود فرض کرلیا جاتا ہے جو عقلاً ہر طرح منقسم و مرتب ہو جیسی چین، ایتھنز یا روما کی سلطنتیں تھیں۔ اس زمانے کی بہت سی سلطنتیں میں ذاتوں کی تقسیم فطرت کا فعل سمجھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے خدا نے خلق کیا ہے اور وہ غیر قابل تبدیل ہے۔ طبقات نتیجہ ہیں تاریخ اقوام اور پیشوں کے اختلافات کا۔ درجات خود سلطنت کی تنظیمات میں سے ہیں۔ ذات کی بنیاد مذہبی اعتقاد پر ہوتی ہے، طبقات میں معاشرتی زندگی اور اعتقادی اور تعلیمی حالتوں کا زور ہوتا ہے، درجات میں مدبرین کی قوت تنظیمی کا اثر رونما ہوتا ہے۔

پس ذات لامحالہ موروثی اور غیر قابل تبدل ہے۔ وہ گویا ایک مضبوط عمارت ہے جس کی ایک اینٹ پر دوسری اینٹ جمی ہوئی ہے۔ طبقات نباتات کی طرح بڑھتے ہیں اور اُمتوں اور سلطنتوں کے مانند ان میں ایک حیاتی نمو ہوتا ہے۔ ان میں پیشے آزادانہ انتخاب موروثی حقوق میں اعتدال پیدا کر دیتا یا انھیں بالکل فنا کر دیتا ہے زیادہ قدیمی زمانوں میں طبقات بھی ذاتوں ہی کے مثل اور انھیں کی طرح موروثی تھے مگر جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے پیشے کی آزادی بڑھتی جاتی ہے اور طبقات درجات کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ درجات سلطنت کے مختلف اغراض کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، اُسی طرح جیسے ایک نقاش اپنی صناعی کی اغراض کے لئے اپنی تصویر کی ہیئت کو بار بار (موقلم لگا کر) بدلتا رہتا ہے۔

ہندوستان میں ذات کا جو طریقہ رائج ہے اُسے نمونہ کمال سمجھنا چاہیئے۔ منو کے قوانین کی رو سے وہ برا ہما کا پیدا کیا ہوا ہے۔ **افلاطون** نے اپنی تخیلی سلطنت میں جس اعتقاد کو مصنوعی ذرائع سے جمانا چاہا تھا اُس نے ہندوؤں میں پورے طور پر واقعیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

سب سے اونچی ذات برہمنوں کی ہے جن میں آریہ خون اگرچہ کلیتہً دوسرے اجزا سے بالکل غیر مختلط تو نہیں رہا پھر بھی سب سے زیادہ صاف رہا، ہندو معتقدات کے مطابق برہمن خدا کے منہ سے نکلے ہیں اس لئے جیسا کہ ہونا چاہیئے وہ خدا کا زندہ کلام اور الوہیت کے صاف ترین و وسیع ترین مظاہر ہیں، علم، مذہب اور قانون یہ ان کے خاص کام ہیں اس حیثیت سے ادنیٰ ترین برہمن کا رتبہ بھی بادشاہوں سے برتر ہے۔ ان کی خلقت بہمہ وجوہ ربانی ہے اور اگرچہ دنیاوی عہدوں پر فائز ہونا اور دنیاوی معاملات میں پڑنا اُن کے لئے منع نہیں ہے لیکن مادی لذات سے محترز رہنے سے ان کی پاکی و قدر بہت بڑھ جاتی ہے جو شخص برہمن کو گھاس کی ایک پتی سے بھی مارے، وہ عقوبت دوزخ کا سزاوار ہو جاتا ہے۔

دوسری ذات چھتریوں کی ہے جن میں سے بادشاہ ہوتے ہیں وہ خدا کے بازو سے پیدا ہوئے ہیں وہ زور اور جسمانی طاقت کے مظاہر ہیں، وہ خلقی جنگ آور دل اور امیروں کی ذات ہے اگرچہ وہ تجارت کرنے سے ممنوع نہیں ہیں مگر ان کا خاص

کام سپہگری ہے ۔

(۳) ویش

تیسری ذات ویشوں کی ہے، وہ خدا کی رانوں سے نکلے ہیں۔ اعلیٰ معاشری پیشے ان سے متعلق ہیں۔ زراعت، پرورش مواشی اور تجارت ان کا کام ہے،

(۴) شدر

چوتھی اور سب سے ادنیٰ ذات شدروں کی ہے۔ وہ خدا کے پیروں سے نکلے ہیں وہ کمین ذات اور زندگی کی مادی ضروریات کے لئے مخصوص ہیں۔ کتب مقدس کا پڑھنا ان کے لئے ممنوع ہے۔

ذاتوں کے درمیان مناکحت

مناکحت کی اعلیٰ قسم میں نسب کی برابری مقدم سمجھی جاتی ہے، اگر ایک برتر ذات کا مرد ایک کمتر ذات کی عورت سے عقد کر سکتا ہے لیکن عورت اپنے سے کمتر ذات والے سے عقد نہیں کر سکتی مگر برور دہور بیشمار آمیزشوں نے بہت سی دشواریاں پیدا کر دی ہیں اور بہت سی موروثی مخلوط ذاتیں ایسی نکل آئی ہیں جو ذات سے خارج ہیں۔ بہت شاذ ونادر ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک ذات سے نکل کر دوسری ذات میں شامل ہو جائے، عام قاعدہ یہی ہے کہ ذاتوں میں قطعی علیٰحدگی قائم رکھی جائے ذات کا طریقہ مرنے کے بعد بھی موثر رہتا ہے، آئندہ زندگی پر اس کا ایسا ہی تسلط ہوتا ہے جیسا موجودہ زندگی پر، بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے اور وہ بھی ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد کہ کوئی چھتری برہمن کی مذہبی رفعت حاصل کر سکے برخلاف ازیں اگر ایک قدم بھی غلط پڑ جائے تو فوراً وہ قعر پستی میں گر جاتا ہے، جس سے نکلنے کی بہت ہی کم امید رہتی ہے ۔

ذاتوں کی اصل

ہم جانتے ہیں کہ ہندو اپنے اعتقاد میں غلطی پر ہیں اور ذاتیں ایک بڑی حد تک انسانی ہی تاریخ کا کارنامہ ہیں، ویدوں میں اُس زمانے کی یاد برقرار ہے جب امتیازی درجات موجود تھے مگر ہنوز ذاتیں وجود میں نہیں آئی تھیں ۔

نسلی تفریقات

تین اعلیٰ ذاتیں جو مجموعتہً آریہ کہلاتی ہیں ان کے اور شدروں کے درمیان اختلاف کا پتہ اصلاً تفریق نسل میں چلتا ہے، گورے رنگ والے آریوں نے سیاہ فام شدروں کے ملک کو فتح کر لیا تھا، اور آقاؤں کی حیثیت سے ملک میں آباد ہو گئے تھے یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے سفید رنگ یورپین امریکہ کے اصلی باشندوں میں آباد ہو گئے ہیں، ذات کے لئے قدیمی لفظ برن، جس کے معنی رنگ کے ہیں اسی گورے اور کالے

رنگوں کے اصلی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم ذات کے سلسلے میں جس قدر اوپر جاتے ہیں اُسی قدر گوری نسل کو زیادہ خالص پاتے ہیں اور جتنا ہی نیچے اُترتے ہیں اُتنا ہی قدیمی سیاہ نسل کے ساتھ اُس کی آمیزش میں زیادتی نظر آتی ہے[1] دونوں بلند ترین ذاتیں تیسری سے ویسی ہی فائق و برتر ہیں جیسے اکثر آریا قوموں میں ہم عوام سے بلند تر ایک طبقہ خواص کا دیکھتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اہل سیف و امرا بلکہ خود بادشاہوں تک پر برہمنوں کی فوقیت زمانے کے لحاظ سے آخری عمل تھا اور میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ برہما کے نئے 'ہمہ اوست' مذہب نے عروج حاصل کرکے قدیم معبودان فطرت کی تعدد پرستی کو مغلوب کردیا تھا۔ برہمن پوجاریوں، رشیوں اور منیوں میں مذہبی احساس بڑھ گیا تھا اور وہ ہر طرح کے خطرات برداشت کرکے اپنے مذہبی کام پر جوش و انہماک کے ساتھ ثابت قدم رہنا چاہتے تھے اس لئے اُنھوں نے بخوشئی خاطر دنیاوی حکومت بادشاہوں کے لئے چھوڑ دی تھی۔

پس اس طرح ذاتوں کا طریقہ باہستگی تاریخی واقعات اور جد و جہد سے پیدا ہوا اگر بعد کو اسے مذہبی تصدیق بھی حاصل ہوگئی اور وہ ہمیشہ کے لئے جم گیا نوعمروں کی تمام تعلیم میں معینہ مذہبی فرائض کو بھی خانگی اور عام زندگی کے تمام انتظامات میں ایسی تنگ و کاوش کے ساتھ نشو و نما دی گئی کہ اس سے کسی قسم کے انحراف کا خیالی امکان تک باقی نہیں رہا اور یہ طریقہ بلا کسی تغیر کے نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا۔

یہ ذاتوں کی ترتیب کوئی سلطنت کی تنظیم نہیں ہے نہ وہ نظام سلطنت کا جزو ہے بلکہ یہ ایک سانچہ ہے جس میں خود سلطنت ڈھالی جاتی ہے۔ یہ دنیا کا ایک ہمہ گیر و مستقل انتظام ہے جو تمام تعلقات پر غالب ہے، اس وجہ سے سلطنت کی اعلیٰ ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ سلطنت اس ذات کے طریقے کی تابع رہنے پر مجبور ہے۔ وہ خود اپنے

[1] ہندوستانی ذاتوں کی تاریخ و قومیت کے متعلق دیکھو لاسن کی کتاب "ہند کی قدیمیات" (Lassen's Indische Alterthums Kunde,) مقالہ ۲ صفحہ ۱۱۔
گوبنو کی کتاب "انسانی نسلوں کی نامساوات" "Del' inegalile de race humaines"، حصہ ۲ صفحہ ۱۳۵

اصول زندگی کے موافق آزادانہ نشو و نما نہیں حاصل کر سکتی یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی سیاسی نصب العین ان سخت ناقابل تغیر عادۃ الناس کے مقابلے میں عملی صورت اختیار کر سکے جو سلطنت کے قانون سے بھی ایک بالاتر قانون کے ذریعے سے ایک دوسرے سے جدا کر کے حالت غلامی میں رکھے گئے ہوں۔ جس صورت میں رعایا یہ اعتقاد رکھتی ہو کہ حکومت کی اطاعت ہزارہا برس کی مصیبت و تکلیف کا باعث ہے اس حالت میں سلطنت کے اقتدار کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اور وہ اپنے تہذیبی اختیار کو کیونکر عمل میں لا سکتی ہے۔

انتظام و استقلال کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موروثی اصول سلطنت کے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ گزشتہ و آئندہ کے درمیان تعلق قائم رکھتا ہے یا یوں کہیے کہ سلطنت کی ہیئت جسمانی کو (جو افراد کی زندگی سے زیادہ دیرپا ہے) مداومت عطا کر دیتا ہے مگر جہاں نہیں وہ کلیتہً و قاطبۃً قانون عامہ پر حاوی ہو جاتا ہے وہاں وہ بہترین قوتوں کو پابہ زنجیر و شل کر دیتا ہے، سلطنت ایک حنوط کردہ لاش ہو جاتی ہے جس میں حنوط کرنے والا اپنی چابکدستی سے موت کے اثرات کے چھپانے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔

ذات کا طریقہ طبقات سوسائٹی کی تفریقات کو سخت و دوامی کر دینے کی طرف مائل ہوتا ہے اوپر کی امیرانہ ذاتیں جنھیں وافر موروثی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اس طریقے سے مطمئن و معلوم ہو سکتی ہیں مگر اس سے طبقۂ اوسط و طبقۂ ادنیٰ پر اس کا دباؤ اور زیادہ پڑتا ہے وہ ان کی پستی پر نشان حقارت کا ایک اور داغ لگا دیتا ہے اور کسی شخص کے لئے ان مضبوط بندشوں سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رکھتا۔ یہ اصول اعلیٰ طبقات کے اقتدار کو بڑھاتا اور ادنیٰ طبقات کی آزادی کو برباد کرتا ہے۔

مگر ترقی و آزادی مقصود ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ منفرد پیشوں میں مقابلتہً زیادہ تکمیل کا حاصل ہو جانا اور اعلیٰ ترین حلقوں میں قابل و ادجودتِ ذہنی کا پیدا ہو جانا اس کا لازمہ ہے مگر نسل کے خاندانی توارث و روایت کو اعلیٰ ترین قانون بنا دینے سے وہ اس انفرادی آزادی سے کلیتہً انکار کرتا ہے جو ان حدود سے باہر نکلنا چاہتی ہے اس نے مقدس رشی بڑے بڑے فلسفی ممتاز شاعر، دلیر سورما، پر فضیلت باپ کے بیٹے چابکدست صناع پیدا کیے ہیں مگر اس نے کبھی کوئی بڑا مدبر نہیں پیدا کیا اور کہیں بھی آزادی اقوام کو روا نہیں رکھا۔

اس لئے تمام تنظیمات معاشرت کو بحال خود برقرار رکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کوئی تنظیم زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی فکر نہیں کرتی اس کا مطمح نظر سکون ہے، تحرک خطرناک سمجھا جاتا ہے، زندگی ایک غیر متغیر تکرار ہے ایک چرخی ہے جو ہمیشہ ایک ہی سمت میں ایک ہی محور پر چکر کھاتی رہتی ہے، جہاں زندگی ایسی کم قدر ہو وہاں بودھ کے مسئلہ نرواں کو دائماً ایک حال پر قائم رہنے کے مقابلے میں ایک حقیقی آسائش سمجھا جانا اور اسے کثیر التعداد پیروؤں کا مل جانا بالکل قرین قیاس ہے، ہندوستانی تمدن ذات کا شگوفہ و ثمر ہے لیکن باوجود اس کے کہ بنیادیں بہت گہری تھیں پھر بھی وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستانی تمدن کو اندرونی زوال سے نہ بچا سکا، اور نہ مخالف فتوحات کے مقابلے میں ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کر سکا۔

جدید ہندوستان ذات پات کی باقیات کو زمانۂ گزشتہ کا ایک وراثتی بار سمجھتا ہے، وہ اب اپنے نظم دنیا کے تصور کو اس بنیاد پر نہیں قائم کرتا بلکہ انگریزی جذبات سے متاثر ہو کر وہ اب دوسری ہی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔

آٹھواں باب

طبقات، گروہ ذی امتیاز

یورپ میں طبقات کا وسیع موضوع

یورپ کی تمام قوموں میں ہم ذاتوں کے بجائے طبقات (گروہ ذی امتیازہ) کا رواج دیکھتے ہیں۔ ذاتوں کی طرح طبقوں سے بھی قوم کے مختلف اجزا میں ایک عضوی نظم وترتیب پیدا ہو جاتی ہے مگران دونوں میں فرق یہ ہے کہ طبقات تاریخ کے تحرک سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں قوت نمو ہے خصوصیت سے یورپ میں ذاتوں نے طبقات کی شکل اختیار کر لی ہے اور متعدد و متنوع تغیرات کے اندر سے گزرتی رہی ہیں۔

طبقات کی قدیم ترین شکل ذاتوں سے بہت مشابہ ہے۔ ابتدا میں وہ موروثی تھے اور جو صفات اُن سے منسوب تھے اُن سے (یورپ کے) طبقات کی اندرونی قرابت ذاتوں کے ہندوستانی طریقہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ خود وہ افسانے بھی (ہندی افسانوں سے) بالکل مشابہ ہیں، جن کی بنا پر یہ مانا جاتا تھا کہ طبقات کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ (اسکینڈینویا کے قدیم مجموعۂ نظم ونثر کی کتاب) ایڈا میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح رگر (Rigr) دیوتا نے اپنے گشت میں پہلے تھریل (Thral) کو پیدا کیا جو کمین آبادی کا جد اعلیٰ تھا، پھر ایک اس سے بہتر گھر میں آزاد کارل (Karl) کو پیدا کیا جو آزاد کسانوں کا مورثِ اعلیٰ تھا اور آخر میں شریف یارل (Jarl) کو پیدا کیا جسے اس نے تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھلائی اور حرفوں کا مقدس راز اس کے تفویض کیا۔ یہ طبقات بھی اپنے جسم کی ساخت اور رنگ میں مختلف تھے، شرفا (Noble) نہایت ہی چمکتے ہوئے گورے رنگ کے ہوتے تھے، اُن کے بال ہلکے شفاف رنگ کے اور رخسارے درخشاں، غلاموں (ادنیٰ طبقے والوں) کے چہرے بدنما اور اُن کے اعضا بے ڈول ہوتے تھے۔

۱) پجاری

گال کے ڈروِیڈ (پیشوایانِ مذہب) برہمنوں کے مماثل سمجھے جا سکتے ہیں یہاں بھی مذہبی پیشوائی، علم اور قانون انھیں کے تفویض تھے[1] اگرچہ یہ ڈرویڈ اور ان سے بھی زیادہ مسیحیت سے قبل کے جرمانیوں کے مذہبی پیشوا (جن کا نام "گوڈی" اسی طرح گوٹ (خدا) سے مشتق ہے جیسے برہمن برہما سے نکلا ہے) قومی شرفا کے طبقے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں قسیسوں کی حیثیت مسیحی پجاریوں کے ایک خاص طبقے کے طور پر برہمنوں کی ذات سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

۲) طبقۂ اعیان

یورپ کی نہایت ہی ابتدائی تاریخ میں جس قدیم طبقۂ اعیان کو ہم ہر جگہ پاتے ہیں وہ ایک موروثی طبقہ اور بالعموم دونوں اعلیٰ ترین ذاتوں کے فرائض کا حامل تھا۔ محاورات زبان بالعموم اس موروثی خصوصیت کے شاہد ہیں اتھنز کے اوپتریدی (Eupatpidai) اور روما کے پیٹریسی (Patricu) اسی وجہ سے ان ناموں سے موسوم ہیں کہ وہ شریف باپوں کی اولاد ہیں اور جرمانی ادالِنگون (Adalinge) کا نام ایک خاندان (آدال Adal) سے نکلا ہے جس کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے[2]

اِٹرُوریا کے لیوکوموِنی (Lucumones) اور گال کے نائب (Knight) موروثی طبقۂ اعیان میں سے تھے۔ افسانوں میں یہ پسند کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے خاندان اور بالتخصیص حکمران خاندانوں کا سلسلہ براہ راست خداؤں یا اوتاروں سے ملحق کر دیا جائے اور خداؤں کی اولاد کی طرح ان کی تعظیم و توقیر کی جائے۔

پس مذہبی پیشوائی اور خدائی امور کا علم، نیز قانون کا علم و عمل لازمی طور پر اسی

---

[1] قیصر کی کتاب "گالی جنگ" مقالہ ۶، فصل ۱۳ مذہبی فرائض اُن کے سپرد ہیں یعنی عام قربانیاں اور منفرد اشخاص کی طرف سے قربانیاں کرنا اور مذہبی احکام کی شرح بیان کرنا نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ان کی طرف حصول علم کی غرض سے رجوع رہتی ہے جو ان کا احترام کرتی ہے، گو تمام شخصی اور عمومی قضیوں کا فیصلہ وہی کیا کرتے ہیں۔

[2] اشمٹ ہینیر نے اپنی کتاب "قانون ملکی" (Statsrecht) کے صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۳ میں اس کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

قدیم طبقہ اعیان سے متعلق تھا۔ وہ تمام لوگوں سے پہلے بلند ترین سرکاری عہدوں پر مقرر کئے جاتے تھے اور فوجی نظام میں انھیں بلند درجہ دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف تمدنی پیشے زیادہ تر ان کے لئے بند کر دیئے گئے تھے عموماً کچھ متوسلین ان کی حفاظت میں ہوتے اور ان کی خدمت کرتے تھے اور شخصی قانون کے دائرے میں بھی مالک اراضی ہونیکے اعتبار سے ان امرا کو خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا وہ قلعوں یا گڑھیوں) میں رہنے کے شائق ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے۔

تمام یورپین اقوام کی تاریخ میں یہ تخصیصی علامتیں خفیف تغیرات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ہم اس نیم سیاسی و نیم مذہبی تنظیم کا جس قدر آگے کو پتہ چلاتے جاتے ہیں اسی قدر ان میں زیادہ مماثلت پاتے ہیں۔

۳۔ آزاد اشخاص۔

یونانیوں رومیوں اور جرمانیوں میں وہ آزاد اشخاص عوام اور قوم کی طاقت کے سنگ بنیاد تھے قومی حقوق سے وہ پورا پورا انتفاع حاصل کرتے تھے اور وہی سلطنت کے ستون ہوتے تھے بیشک طبقۂ امرا ان سے بلند تر ہوتا تھا مگر ہندوستان کی اونچی ذات کی طرح پنچ ذاتوں سے ایک بالکل ہی جداگانہ مخلوق نہیں تھے بلکہ انھیں میں سے ایک مرتفع اور ممتاز گروہ ہوتا تھا اور بہر نوع اُن سے متحد رہتا تھا اور اس کی بنا اصلی بھی انھیں قومی حقوق پر مبنی ہوتی تھی جو آزاد اشخاص کے ہوتے تھے۔

آزاد اشخاص قدیم ترین زمانے میں بالعموم زمین کے مالک اور اُس کے جوتنے بونے والے ہوتے تھے ایتھنز کے ابتدائی نظام سلطنت میں گیومور یہی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی حال اسپارٹا کے عامۃ الناس، روم کے پلیبین (اجلاف) اور تمام جرمانی قبائل کے آزاد اشخاص کا تھا نسل اور ملک کے متعلق اُن کے آزادانہ حقوق کا احترام قانوناً خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ وہ تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے گو کہ ابتداءً وہ اُسے کم پسند کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کے طرز زندگی کو ہم گویا ویشوں کی زندگی کے مماثل قرار دے سکتے ہیں مگر وقعت عامہ میں وہ ویشوں سے فائق تھے کیونکہ وہ ہتھیار اُٹھا سکتے تھے اور زیادہ فوج زیادہ تر انھیں سے مرتّب ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ملت کے اندر وہ سیاسی حقوق بھی عمل میں لاتے تھے جن کی نوعیت نظام سلطنت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔

وہ اگرچہ حکومت کے محکوم ہوتے تھے مگر ایک آزاد شخص کی حیثیت سے وہ کسی خاص آقا کے تابع نہیں ہوتے تھے۔ ابتدا میں غالباً انھیں حق حمایت نہیں حاصل تھا مگر وہ اپنے خاص آدمی رکھ سکتے تھے۔ ان کا طبقہ اصلاً ایک موروثی طبقہ تھا۔ عموماً یہ مانا جاتا تھا کہ ہر آزاد شخص آزاد ہی پیدا ہوتا ہے۔

آخر میں ہمیں ایک ایسے طبقے کے بہت سے نشانات ملتے ہیں جو اسی ابتدائی زمانے میں (جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں) شکست ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس لئے اُس کی خصوصیات ہمارے لئے ایک معما سا رہ گئی ہیں۔ یہ طبقہ متوسلین و خدام کا ہے جو ہندوستان کے شدروں کے مانند زندگی کی ادنیٰ ضروریات میں مشغول رہتا تھا کہیں تو وہ مفتوح باشندوں پر مشتمل ہوتا تھا جو ہمیشہ فاتحین ہی کی نسل کے ہوتے تھے اور کہیں یہ طبقہ ان غریبوں پر مشتمل ہوتا تھا جن کے گلوں میں ظلم و قرض کی وجہ سے مستقل غلامی کا طوق پڑ گیا تھا یونان کے ہیلاٹ اور نفیت روما۔ گال اور برطانیہ کے کلی انٹ اور جرمانیا کے لیٹ سب اس میں داخل ہیں۔

ان کا کوئی نہ کوئی آقا ہوتا ہے جو ان کی حمایت و حفاظت کرتا تھا جسے "حامی" کہتے تھے۔ یونانی اسے پروس تاتیس (Prostates) کہتے تھے اور رومی پاترونس (Patronus) اس طبقے کے افراد قوم کا جزو ہوتے ہیں غلاموں کے درجے میں نہیں ہوتے تھے مگر اُن کی آزادی اُن کے حقوق اور اُن کی وقعت آزاد اشخاص سے کم ہوتی تھی۔ اُن کا کام بالخصوص دستکاری تھی اور آزاد شدہ غلام بالعموم اسی درجے میں داخل ہو جاتے تھے۔

ان طبقات کی تاریخ ہر جداگانہ سلطنت کی تاریخ میں بہت ہی گہرے تعلق کے ساتھ مدغم ہے۔ نظام ہائے سلطنت کے تبدلات و انقلابات اکثر انھیں طبقات کے تعلقات و خیالات کے باطنی و غیر مرئی تغیرات کے ظاہری نتائج و مظاہر ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قانون کا تمام مجسمہ طبقات کے تخیل کے رنگ میں رنگا ہوا اور انہیں کی خصوصیات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جس طرح ہر طبقے کا خاص لباس ہوتا تھا اُسی طرح ہر طبقے کے اپنے خاص قوانین اور معدلت گستری کے طریقے بھی ہوتے تھے۔ پادری مذہبی شریعت کے تابع تھے، حکمران قانون اعیان کے زیر اثر تھے، نائٹ جاگیردارانہ قانون کے پابند تھے، خدام اپنے خاص قانون

کے ماتحت تھے، شہری اپنے شہر کے قانون کے اور کسان اپنے علاقے کے رواج و قانون کے زیر فرمان تھے مگر ازمنۂ وسطیٰ میں ان امتیازی طبقات کی موروثی حیثیت گھٹتی گئی اور اس میں پیشے کی حیثیت بڑھتی گئی۔ زمانۂ مابعد کی صدیوں میں چار خاص طبقات پائے جاتے ہیں۔ (۱) طبقۂ مذہبی (۲) طبقۂ اعیان (۳) طبقۂ شہری یا طبقۂ سوم (۴) طبقۂ مزارعین۔ دو اول الذکر یعنی اعیانی طبقات نے حاکمانہ سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی تیسرے طبقے نے ملکی آزادی کو بچایا یا چوتھا طبقہ بالکل بے بس اور محکوم تھا۔

طبقات اولاً موروثی تھے بوجہ پیشے کی نسبت سے ہو گئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام پر یہ چاروں طبقے زوال پذیر ہو گئے اور بہت کچھ مٹ گئے مگر موجودہ زمانے میں اُن کے دو ایک نشانات اس طرح باقی رہ گئے ہیں جیسے کسی تباہ شدہ عمارت کے کچھ آثار رہ جاتے ہیں۔ جدید سلطنت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں ازمنۂ وسطیٰ کے ان طبقات کے معنی جاننے چاہئیں۔ انھیں سے مقابلہ کرنے سے موجودہ سلطنت کی حالت سمجھ میں آتی ہے۔

اور بالآخر زوال پذیر ہو گئے۔

نواں باب

(الف) قسّیس (طبقۂ مذہبی)

ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات میں مذہبی گروہ کو سب سے مقدم جگہ حاصل تھی۔ کلیسا کے صحیح اعتقاد کے موافق وہ قوم کا کوئی طبقہ نہیں تھا، وہ ایک مذہبی طبقہ تھا نہ کہ ملکی سلطنت محض اہل دنیا کی ایک تنظیم سمجھی جاتی تھی اور مذہبی گروہ اپنے تقدس کی وجہ سے ان سے بالاتر تھا۔ مسیحی قسّیس اپنے حقوق کو برہمنوں کی طرح اپنے مخصوص خدائی رشتے پر قائم نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا سلسلہ ازدواج کے ذریعے سے نہیں چلتا تھا بلکہ وہ اپنے حقوق کی بنا زیادہ تر ایک ربانی تنظیم پر قائم کرتے تھے وہ روح القدس کے اثر سے بھرے ہوئے تھے اور کلیسا کے عہود نے انھیں مقدس بنا دیا تھا۔ پادریوں میں کا کمترین بلکہ بدترین شخص بھی دنیاوی لوگوں کے نہایت ہی بلند مرتبہ اور پاکباز شخص سے ایسا ہی فائق تھا جیسا سونا لوہے سے یا روح جسم سے۔

پادریوں کا مطمح نظر تقریباً وہی تھا جو برہمنوں کا تھا فرق صرف یہ تھا کہ مسیحی پادریوں نے برہمنوں کے مانند دنیاوی حکومت کو ترک نہیں کر دیا تھا اور سلطنت کے قواعد کی پابندی کی جانب ان کا میلان برہمنوں سے کم تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے کلیسا کے منطقی اصول کے موافق سلطنت کے قوانین کی پابندی پادریوں پر عائد نہیں ہوتی تھی ان کا کام یہ تھا کہ وہ خود ان قوانین کے امتحان و اختبار کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ برضائے خود ان کا اتباع کریں گے یا نہیں اور کریں گے تو کس حد تک۔ طبقۂ مذہبی کے حقوق یا کلیسا کے اغراض کو ذرا بھی خطرہ ہوتا تو پادری معاً ہر طرح کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور کتاب مقدس کے ان الفاظ کو سپر بنا لیتے کہ "ہمیں انسان کے بجائے خدا کی اطاعت کرنا چاہیے" اور اپنی روحانی فوقیت پر زور دینے لگتے۔ دوسری جانب وہ دنیاوی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بلا چون و چرا کلیسا کے قوانین کا اتباع کرے اور ان کی تعمیل میں

اپنی قوت سے مدد دے۔ اُنھوں نے دیوانی بلکہ فوجداری مقدمات تک میں خود کو دنیاوی عدالت کے اقتدار سے علیٰحدہ کرلیا تھا۔ ان کے بڑھے ہوئے دعاوی دنیاوی منصفوں کی توقیت کے رواوارانہ تھے کیونکہ "بھیڑوں کا گلہ بانوں پر حکومت کرنا" کیسے ممکن تھا۔ وہ جنگ میں خدمت کرنے کے پابند نہیں تھے کیونکہ ان کا مذہبی شغل آلات آہنی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن یہیں تک نہیں تھا، وہ محصولات کے ادا کرنے کی ذمہ داری سے بھی گریز کرتے اور ہر موقع پر اپنی "براءت خدمات" کو پیش کرتے تھے تاکہ ہر طرح کا بار جو سلطنت کی طرف سے عائد کیا جائے اُسے دفع کردیں۔ روما کے پادری ہونے کے لحاظ سے وہ قومیت کے حدود سے متنفر تھے۔ وہ کسی ایک قوم یا کسی خاص ملک کے متوطن نہیں تھے۔ وہ تمام ممالک عیسوی کے ایک عام تعلق کے قائل تھے جن کا مرکز دنیا کا صدر مقام اور پوپ کا مستقر روما تھا۔ مذہبی قانون ان کی زندگی کا قانون تھا اور سوا کلیسا کی نرم عدالت کے اور کسی کو جوابدہ ہونے سے وہ منکر تھے۔

مگر باوجود اس کے اپنی انتہائی طاقت کے زمانے میں بھی پادریوں نے خود کو سلطنت سے کبھی کلیتہً جدا نہیں کیا اس لئے کہ کچھ تو انکے تاریخی حالات اور کچھ ذاتی اغراض کا خیال علیحدگی کا مانع تھا۔

عیسوی کلیسا اور اس کے پادریوں کے گروہ کا آغاز اور اُن کا عروج قدیم رومی شہنشاہی کے دور میں ہوا جو دنیا پر مسلط اور وسیع اقتدار کی مالک تھی۔ روما کی سیاسی طاقتوں نے اپنے اقتدار کو ترک نہیں کیا تھا، وہ مقدس رومی شہنشاہی کے تمام باشندوں سے قوانین، شہنشاہی حکومت اور شہنشاہی عدالت کی اطاعت کی خواستگار تھی، طبقۂ مذہبی اپنے لئے منفرد امتیازات شہنشاہوں سے حاصل کرسکتا تھا مگر اُس کی محکومیت میں کوئی کلام نہیں تھا۔

ان کی سیاسی طاقت کی ترقی۔

فرانکی شاہی بھی بدستور اسی پر جمی رہی کہ اساقفہ اور قسیس بادشاہ کے اور شہنشاہی قوانین و عدالت کے تابع رہیں گو کہ سلطنت کی طاقت گھٹ گئی تھی اور کلیسا نے زیادہ آزادی حاصل کرلی تھی۔ جرمانی شہزادوں کے تحت میں کلیسا کی براءت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اول اول کسی قسم کے مذہبی قانون کے تسلیم کئے جانے کے بجائے زیادہ تر بادشاہ کے لطف و عنایت سے ان حقوق میں اضافہ ہوا اور اب قانون کلیسا نے

متکبرانہ طور پر خود اپنے اقتدار کا دعویٰ شروع کر دیا تاہم جب کلیسا کے حقوق نے مخالفت ومقاومت کے باوجود بتدریج فتح حاصل کر لی اس وقت بھی ان کا اقتدار ہر جگہ یکساں نہیں تھا۔

ذاتی اغراض نے بھی طبقہ مذہبی کو عوام اور سلطنت سے بہت ہی زیادہ مربوط کر دیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں کلیسا کے سرگروہ یعنی پاپائے روما نے اس حصۂ ملک پر سیاسی اقتدار شاہی بھی حاصل کر لیا تھا جو ورثۂ پیٹر (Petrimonium Petri) کہلاتا تھا، کچھ تو شاہی عطیے سے اور کچھ حکمرانوں کے نذرانوں سے کلیسا کی ایک سلطنت پیدا ہو گئی تھی جس پر قسیس حکمراں تھے۔ روما اور رومی مملکت میں اعلیٰ ترین روحانی اقتدار، دنیاوی اقتدار شاہی کے ساتھ مل گیا، پاپاؤں کا اب یہی کام نہیں رہا تھا کہ وہ بحیثیت اسقف اعلیٰ ہونے کے بوقت ضرورت شہنشاہ اور مختلف سلطنتوں کے سامنے کلیسا کے اغراض کی نیابت کریں بلکہ اطالیہ نے والیان ملک میں سب سے بڑے والی ملک ہونے کے لحاظ سے انھیں اطالوی اغراض سیاسیہ سے بھی بہت گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا یہی امر فی الاصل اطالیہ کی تباہی کا باعث ہوا (ماکیا ویلی مباحث جلد ۱-۱۲) اطالیہ میں تفریقات کے قائم رکھنے کی تو ان میں کافی طاقت تھی مگر اطالیہ کو خود اپنی شاہی کے تحت میں متحد کر لینے کی طاقت ان میں نہیں تھی نہ وہ معاند قوموں کی یورش سے ملک کو محفوظ رکھنے کے قابل تھے۔ یہ البتہ تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے وہ غیر ملکی طاقتوں کے بلا لینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

انھوں نے روما کو دوبارہ ممالک عیسوی کا اول شہر بنا دیا اور گرجاؤں اور صنعتی کاموں سے اسے مزین کر دیا مگر ان کی کلیسائی حکومت وانضباط کے تحت میں ذہین رومی تمدنی اوصاف و کمالات میں اطالوی جمہوریتوں کے باشندوں سے پیچھے رہ گئے اور کلیسائی حکومت بجائے اس کے کہ اعلیٰ سیاسی ترقی کا نمونہ ہوتی اس کے لئے ایک عبرت بھی ہو گئی۔ جدید دنیا نے یہ معلوم کر لیا کہ مذہبی حکمرانی سلطنت کی صحیح حکومت کے لئے موزوں نہیں ہے اور کلیسا کی سلطنتوں کا دنیاوی رنگ میں آجانا رومیوں کے لئے ایک بڑا سیاسی فائدہ ثابت ہوا ہے۔

مذہبی حکمرانوں کی سیاسی طاقت کو بڑھانے میں اطالیا کے بعد جرمانیا نے

سب سے زیادہ فیاضی دکھائی - فرانکی شاہی کے زمانے میں بھی قومی مجالس میں اساقفہ کو ایک بلند درجہ حاصل تھا وہ کبھی تو دنیاوی امرائے عظام خاصکر اضلاع کے کاؤنٹوں کے ساتھ مجلس اکابر میں شامل کر دیئے جاتے تھے کبھی ان کی جداگانہ مذہبی مجالس قائم کر دی جاتی تھیں مگر دنیاوی طاقت وعظمت کے ساتھ ان کا توسل جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں سب سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوا - اس نظام میں ہم دیکھتے ہیں کہ سات انتخاب کنندہ والیان ملک (Electors) میں سے تین مذہبی حکمران یعنی مائنس کولن اور ٹری یر کے اساقفہ اعظم ہیں اور ان میں سے بھی مائنس کا اسقف اعظم جرمانیا کے چانسلر اعظم کی حیثیت سے سب سے اول رائے دیتا ہے، حلقۂ انتخاب میں انھیں اول درجہ حاصل تھا، اور اس کے ساتھ ہی ملکی حکمراں ہونے کے لحاظ سے اُنھوں نے بہت جلد قریب قریب شاہانہ آزادی بھی حاصل کر لی تھی -

۱۱ شہنشاہی نظام حکومت

ان کے علاوہ اساقفہ اعظم تمام اساقفہ اور روسائے خانقاہ کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جنھوں نے خاص خاص اضلاع پر اقتدار شاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے اور وہ شہنشاہی مجالس شوریٰ میں شریک ہوتے اور رائے دیتے تھے - یہ رائیں یا تو شہنشاہی کے معمولی حکمرانوں کی حیثیت سے فرداً فرداً دی جاتی تھیں چنانچہ بریمن ماگدے برگ زالتس برگ کے اساقفہ اعظم اور دیورتس برگ، آؤگس برگ اور بازیل کے اساقفہ فرداً فرداً رائے دیتے تھے یا وہ مجموعی رائے میں حصہ لیتے تھے اور یکجائی مذہبی مجلس منعقد کرتے تھے جو کاؤنٹوں (یا قوامسہ) کی مجلسوں کے ہمپایہ سمجھی جاتی تھیں کتب قانون کی اصلاحی ترتیب میں مذہبی حکمرانوں کا درجہ بادشاہ کے بعد ہوتا تھا دنیاوی والیان ملک اگرچہ نظام شہنشاہی میں ان کے ہمسر تھے مگر تیسرے درجے پر رکھے جاتے تھے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ مذہبی حکمرانوں کے تابع ہو جائیں مگر اس کے برعکس ہونا نازیبا معلوم ہوتا تھا -

پاپایان روما اور سکسونی شہنشاہوں کے مابین عطائے اسناد کے مناقشۂ عظیم میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ کلیسا کے حکمراں دنیاوی حکومت کو ترک کر کے اپنی زندگی کلیسا کے لئے وقف کر دیں مگر یہ کوشش عبث ثابت ہوئی خود پوپ کی طرف سے بھی جب اس کا اشارہ ہوا تو جرمانیا کے حکمرانوں نے غصے کے ساتھ اسے مسترد کر دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانیا میں بھی مذہبی عہدے سیاسی عہدوں اور سیاسی اغراض کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔

شہنشاہی کے صوبوں میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ مقامی مقتدایان مذہبی یعنی اساقفہ رہبانِ خانقاہ پرائیروں اور زاہدوں کے مختلف فرقوں کے پیشواؤں نے اپنا ایک علیحدہ طبقہ بنا لیا اور صوبے کی مجلس میں ایک جداگانہ گروہ کی حیثیت سے یا امرا کے ساتھ شامل ہو کر بیٹھنے کا حق حاصل کر لیا اور اپنی جاگیروں پر کم و بیش وسیع عدالتی اختیارات کام میں لانے لگے۔ صوبہ وار طبقات میں ان کے حقوق کی بنا بالعموم اُن کے ملکی امرا ہونے کے اعتبار سے تھی اس لئے اگرچہ وہ اپنی ذات کے لئے محصولات و فوجی خدمات سے استثناء حاصل کر سکتے تھے مگر وہ اپنے خدام اور زرعی تابعین کیلئے جو ہمیشہ عام دنیا دی لوگ ہوتے تھے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک کو ان کے محصولوں کی ضرورت تھی اور ملک کا حکمران بہ حیثیت جاگیردارانہ آقا کے ان سے مسلح سواروں کے مہیا کرنے کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

ایک فوقیت جو مذہبی طبقۂ امرا کو دنیا دی طبقۂ امرا پر حاصل تھی وہ یہ تھی کہ ان کا طبقہ موروثی نہیں تھا بلکہ شخصی تقلیم و انتخاب پر مبنی تھا۔ ایک دستکار کا لڑکا پوپ اور ایک کسان کا بیٹا اسقف اعظم ہو سکتا تھا[۱]۔

مگر جس قدر وقت گذرتا گیا، مذہبی طبقے کا یہ غلبہ اور مذہبی حکمرانوں اور دینی پیشواؤں کی یہ اعیانی طاقت متزلزل اور تباہ ہوتی گئی۔ سولھویں صدی کی جرمانی اصلاح نے اس دنیا دار کلیسا پر ایک بہت ہی کاری ضرب لگائی۔ پروٹسٹنٹی خیالات کی اشاعت کے ساتھ مذہبی ریاستیں دنیا دی رنگ میں آ گئیں۔ اساقفہ کی جائدادیں منسوخ کر دی گئیں خانقاہیں

---

[۱] پوپ گرگیوری ہفتم جو خود ایک بڑھئی کا بیٹا تھا اس نے صاف الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ روماکو کافروں اور عیسائیوں میں یہ عظمت حاصل ہوئی ہے اور اس لئے نسل کی نجابت یا ملکی عالی خاندانی اتنی زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں جتنی کسی شخص کی جسمانی اور روحانی خوبیاں۔ دیکھو لورین کے "مطالعات تاریخی" (Laurent, Etud. surl' Hist.) حصہ ۷ صفحہ ۳۲۵

توڑدی گئیں اور مذہبی طبقے برطرف کردیے گئے اصلاح کے قبل جرمانی رائشس تاگ میں تین مذہبی حکمراں اور اُن کے سوا تین اساقفہ اعظم اور انتالیس ۲۹ اساقفہ نشست کرتے تھے۔ ویسٹ فالیا کی صلح کے بعد یہ تعداد گھٹکر تین انتخاب کنندہ حکمراں ایک زالتس برگ کا اسقف اعظم اور بیس ۲۰ اساقفہ تک رہ گئی۔ اب صرف سوئیبیا اور رائن کے صوبوں کی مذہبی مجلسیں برقرار رہ گئی تھیں۔ شمال سارے کا سارا اور جنوب کا بڑا حصہ مذہبی فرمانروائی کے اثر سے نکل گیا تھا۔

جو ممالک کیتھولک طریق پر ثابت قدم رہ گئے تھے ان میں بھی یہ تغیر صرف ملتوی ہوگیا تھا۔ جرمانیا کا کوئی حصہ نہیں تھا جہاں انیسویں صدی کے اوائل کی انقلابی تحریک کے بعد مذہبی اقتدار شاہی قائم رہ گیا ہو۔ رائن کے بائیں کنارے کے انتخاب کنندہ حکمراں بھی اس طوفان میں بہہ گئے اور ان کے ممالک فرانس میں شامل کرلئے گئے۔ دوسرے مذہبی حکمرانوں کے ممالک دنیاوی فرمانرواؤں کو بطور معاوضے کے دیدیے گئے۔

شہنشاہی کے خاتمہ کے ساتھ مذہبی اُمرا کے شہنشاہی طبقے کی حیثیت جاتی رہی اور صرف بعض صوبوں کی ڈائٹ (مجالس شوریٰ) میں ایک غیر قابل اطمینان حیثیت قائم رہ گئی۔ کئی صدیوں کے بعد پھر ایک مرتبہ منصب اُسقفی ایک خالص مذہبی عہدہ رہگیا جس میں سیاسی طاقت کا کوئی شائبہ شامل نہیں تھا۔ ان کا عدالتی اختیار بھی ان کے ملکی اقتدار کے ساتھ زائل ہوگیا۔

کیتھولک طبقۂ مذہبی جو اس طرح اپنی دنیاوی حیثیت و طاقت سے محروم ہوچکا تھا، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے مطمح خیال کو اب حاصل نہیں کرسکتا تھا جدید سیاسی احساس اس کا روادار نہیں تھا کہ مذہبی طبقہ عام دنیاداروں پر کسی قسم کا ظلم کرے اس نے سلطنت کے قوانین اور اس کے مشخصہ اقتدارات کے لئے ہمہ گیر اطاعت کا مطالبہ کیا، طبقۂ مذہبی کی برائت و امتیازات کا وقت گذر چکا تھا سب ایک قانون ایک اختیار عدالتی کے تابع تھے۔

انگلستان اور فرانس

انگلستان اور فرانس میں بھی طبقۂ مذہبی کی تاریخ انھیں حالات سے ملتی جلتی سی ہے۔ ان ممالک میں انھیں وہ ملکی اقتدار کبھی حاصل نہوا تھا جو جرمانیا میں حاصل

ہوگیا تھا اور ان دونوں ملکوں میں سلطنت کا دنیاوی پہلو جرمانیا کی نسبت زیادہ قوت کے ساتھ حاوی رہا۔ تاہم پادریوں کا ایک طبقہ ضرور تھا، انگلستان میں امرائے دنیاوی کے ساتھ وہ دارالامرا[1] میں نشست کرتے تھے۔ فرانس میں انھوں نے اپنا ایک جداگانہ طبقہ بنا لیا تھا جو سلطنت میں سب سے اول تھا مگر انگلستان میں اصلاح اور فرانس میں انقلاب نے ان کی حیثیت پر بڑا اثر ڈالا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی برأت، عام و یکساں اطاعت قانون کے اصول کے سامنے غائب ہوگئی۔

جب لوئیس شانزدہم نے اسٹیٹس جنرل کو ۱۷۸۹ء میں طلب کیا تو طبقۂ مذہبی نے برضا خود اپنی جداگانہ حیثیت کو ترک کر دیا، اور قومی مجلس میں (جو ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات کی نہیں بلکہ آزاد اہالیان ملک کی قائم مقام تھیں) شامل ہونے میں امرائے ملک پر سبقت لے گئے۔

اس طرح پادریوں کا ازمنۂ وسطیٰ والا طبقہ ہر جگہ شکست ہوگیا، مذہبی اور غیر مذہبی طبقات میں جو بڑا فرق تھا اس کا اثر عملاً زائل ہوگیا اور اپنے نظم حقوق میں سلطنت نے اسے مسلم سمجھنا ترک کر دیا، پادریوں کا بڑا حصہ طبقۂ متوسط میں مل گیا اور کلیسا کے اعلیٰ عہدہ دار امرا و اعیان میں شامل ہوگئے۔

---

[1] پادریوں نے مجموعۃً پارلیمنٹی طبقہ کی اس حیثیت کے اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا جو اڈورڈ اول نے پیش کی تھی، امرائے روحانی اب بھی اپنے دنیاوی ہمسروں کے ساتھ دارالامرا میں بیٹھتے ہیں مگر اغلب یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں انھیں یہ جگہیں دنیاوی جاگیردار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہ کہ مذہبی اعزاز کے طور پر۔ انگریزی مترجم

دسواں باب

(ب) طبقۂ اعیان و امراء

(۱) فرانسیسی امراء

رومانیہ کے قدیم موروثی طبقہ امراء کی جگہ پر ایک سیاسی طبقہ امراء کا قائم ہونا۔

قدیم روما کے پیٹریسی (اشراف Patrician) موروثی امراء تھے مگر اندرونی فرقہ بندیوں کی کشمکش نے انھیں بہت جلد سیاسی طبقہ اعیان میں مبدل کر دیا جس کی بنا نسب پر نہیں بلکہ عام عہدوں کے لئے قوم کے آزادانہ انتخاب پر تھی سیناتی خاندانوں کا یہ سیاسی طبقۂ اعیان، جمہوریت کے زمانے سے گذر کر شہنشاہی کے زمانے تک برقرار رہا، قدیم پیٹریسی خاندان جو آگسٹس کے زمانے میں گھٹ کر پچاس تک رہ گئے تھے اور جن میں بہت کم اضافہ ہوتا تھا قانوناً نہیں مگر واقعتہً وہی بدستور اس طبقۂ اعیان کی اصل و بنا تھے (شہنشاہوں کے خاندان بھی از روئے قانون ہمیشہ پیٹریسی ہی ہوتے تھے) ان کے نام کی قدیمی عظمت و شوکت، سلطنت کے معاملات کا موروثی تجربہ نیز اکثر اُن کی بڑی بڑی جائدادیں اور ذاتی تعلقات بھی وہ اسباب تھے جنھوں نے ان کے لئے وہ وقعت حاصل کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ سینات میں داخل کر لئے جاتے تھے لیکن ان کے علاوہ اُن ممتاز اشخاص کے اضافے سے جنھوں نے سپہ سالار، مدبر، مقرر، مقنن ہونے کے لحاظ سے شہرت حاصل کی ہوتی، طبقۂ اعیان میں ہمیشہ ہی نئی جان پڑتی رہتی اور نئی قوت آتی رہتی تھی۔ جمہوریت کے دور میں یہ لوگ عام عہدوں پر منتخب ہونے کی وجہ سے سینات میں داخل ہوتے تھے اور شہنشاہی دور میں شہنشاہ کی طلب پر شامل ہوتے تھے۔ اس طرح زمانہ ما بعد کے رومی طبقۂ امرا کی بنا سیاسی قابلیت اور خدمات عامہ کے اعتبار پر قائم ہو گئی تھی اور تنزل و زوال کے زمانے میں بھی اُس کی گذشتہ آزادی اور عظمت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔

"فرائضِ شہنشاہی" (Principate) پر سیناس کا مشہور مقالہ اُن اساسی خیالات کا بہترین اظہار ہے جو ازمنۂ شہنشاہی میں طبقہ اعیان کی بابت ایک رومی مدبر کو ہو سکتے تھے۔ شہنشاہ کا یہ دوست اسے صلاح دیتا ہے کہ سینات کو اُن بہت سے ناقابل ارکان سے پاک کردے جو خانہ جنگیوں کی ابتری کے دوران میں اُس میں داخل ہو گئے تھے اور جو جگہیں اس طرح خالی ہوں اُن کو غور و فکر کے ساتھ نامزدگیوں سے پُر کرے۔ وہ یہ سفارش کرتا ہے کہ غریبی کی پاداش میں کوئی رکن سینات سے خارج نہ کیا جائے، بلکہ غریب قابل اشخاص کے لئے ضروری مالی ذرائع مہیا کر دیے جائیں نئے سیناتیوں کے انتخاب میں وہ صرف اطالیا ہی تک اپنی نظر کو محدود نہ رکھے بلکہ اپنے حلیفوں پر اور صوبجات تک کے لوگوں پر نظر ڈالے اور اس طرح اپنے گرد شہنشاہی کی تمام قوموں کے اُن بہترین اشخاص کو جمع کرلے جو خاندان، اخلاق یا تمول کے لحاظ سے قوم کے سرگروہ مانے جاتے ہوں اور معاملات عامہ اور عالمگیر (رومی) حکومت میں اُنھیں حصہ دے اس طرح جتنے بھی زیادہ تعداد میں ممتاز اشخاص سینات میں شریک ہونے کے لئے روما میں جمع کئے جائینگے اُتنے ہی زیادہ وہ سلطنت کے ضروریات کو پورا کرنے اور صوبوں کی وفاداری کو قائم رکھنے کے ذرائع مہیا ہو جائیں گے۔ "اساورۃ جو زیادہ تر اپنی دولت کے لحاظ سے ممتاز ہیں اُن سے ایک دوسرا طبقۂ اعیان مرتب ہونا چاہیئے اور اُن کے بہترین افراد کو اُس میں شامل کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس خیال سے کہ سیناتیوں کے بیٹے اپنے باپوں کی جانشینی کر سکیں اُن کو علوم و فنون اور سپہگری کی ایسی تعلیم دی جائے[1] جو اُن کے رتبے کے شایاں ہو۔

فرانسیسی طبقۂ اعیان کی تاریخ بہت ہی ناہموار ہے، اس میں ہم ازمنۂ ذیل کو تمیز کر سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دور خاص خصوصیات رکھتا ہے۔

(۱) فرانسیسی طبقۂ اعیان کا آغاز میروونگی[2] دور (۴۸۱ء۔۷۵۲ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ فرانکی اعیان کے ایک قدیم موروثی طبقے کے آثار محض غیر متیقن ہیں

---

[1] Dio Cass. 52

[2] Merovingian

البتہ اُس زمانے میں شخصی وفاداری کی بنا پر ایک طبقۂ اعیان قائم ہوگیا تھا جس کی بنیاد زیادہ تر اُن تعلقات پر تھی جو بادشاہ اور اُس گروہ کے درمیان تھے۔ غالباً یہاں بھی امرار کے قدیم خاندانوں کا خاص لحاظ کیا گیا ہوگا مگر ان کے سوا دوسرے آزاد فرانکوں اور جرمانیوں کو بھی بادشاہ اپنے اعیان میں شامل کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ رومانی بھی بادشاہ کے مہمانوں کی حیثیت سے اس قسم کے اعزازسے مفتخر ہوتے رہتے تھے ایسی مثالیں بھی کچھ بہت کم نہیں ہیں کہ ادنیٰ درجے کے لوگ مثلاً غلام وخادم وغیرہ ترقی کرتے کرتے سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے اور اس طرح امرا میں شامل ہوگئے۔

پس یہ طبقۂ اعیان بہت ہی مخلوط اجزا سے پیدا ہوا تھا اور جیسا کہ شیفنر[1] نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے زیادہ تر یہ طبقہ موروثی امرا کا طبقہ نہیں تھا بلکہ ذاتی امرا کا طبقہ تھا جو بادشاہ کے ساتھ وفاداری کے عہد کے ذریعے وابستہ تھا نیز یادہ گراں دیت کا حق اس امر کا نشان و نتیجہ تھا کہ اس طبقے کے اراکین کی قدر و وقعت زیادہ تھی۔ اس کے سوا شخصی قانون میں اس کے امتیازات بہت ہی کم تھے، مگر سیاسی حیثیت سے اسے متعدد طور پر امتیازات حاصل تھے۔ اعیانی حیثیت کے ساتھ سلطنت کے اعلیٰ عہدے درباری منصب، مذہبی اعزاز بھی شامل ہو جاتے تھے۔ شاہی مجالس شوریٰ میں اس کی شرکت ہوتی تھی اور قومی اور ملکی مجالس میں اُسے بلند جگہ ملتی تھی۔

جس طرح اُن اشخاص میں جو اس نظام کے اعضائے ترکیبی ہیں ہم رومانی اور ٹیوٹنی (جرمانی) اجزا کو مخلوط پاتے ہیں وہی حال خود اس نظام کا بھی ہے مگر ٹیوٹنی خصوصیات غالب تھیں اور وہی عنصر روز بروز زیادہ تسلط حاصل کرتا رہا۔ اس جزو سے (۱) بادشاہ کی ذاتی وفاداری یعنی اعتماد شاہی کا تعلق تھا جو خاندانی روایات اور خاندانی اغراض سے پیدا ہوا تھا اور دوسرے روسا کے تابعین تک کے لئے وسیع ہوگیا تھا (۲)، نیز بڑے بڑے امرا جو شاہی عطیات سے سرفراز ہوتے رہتے تھے جو (زیادہ تر اراضی کی شکل میں ہوتی تھیں) وہ اسی طبقے کے ہوتے تھے زمانہ مابعد

[1] شیفنر کی تصنیف "فرانس کے عدالتی نظام کی تاریخ" ج ۱ ص ۲۱۷ اور اس کے آگے۔
Schaffner, Geschichte der Rechtsver fassung Frankreichs.

کے جاگیرداری طریقے کی بنا زیادہ تر الفیں و تعلقات پر ہے۔

(۲) حکمراں خاندان کے تغیر کا بڑا سبب طبقۂ امرا کا ایک انقلاب تھا۔ محل کے کارونلنگی حاجب بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے طاقتور فوجی اعیان کے سرگروہ بن گئے اور امرا کو ان کی ریاستوں میں استحکام حاصل کرنے میں مدد دی اور پھر انہیں امرا کی مدد سے کمزور بادشاہوں کو نکال باہر کیا۔

جیسا کہ گیزو نے (اپنی تصنیف[1] میں) بتایا ہے اس تحریک کو خاص اور مسلسل مدد شمالی فرانس اور آسٹریشیا سے ملی جہاں جرمانیوں کو غلبہ حاصل تھا اور جو اسی باعث سے جنوب کے رومانی فرانس کے مقابلے میں ٹیوٹنی یا جرمانی فرانس کہلاتا تھا۔ مغربی فرانس نے جہاں کے امرا رومانیوں سے بہت زیادہ مخلوط تھے بالکل علٰحدگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب فرانسیسی طبقۂ امرا میں صاف طور پر ٹیوٹنی رنگ پیدا ہو گیا۔ امرا کا وہ طبقہ جو عہدوں اور خدمتوں کے اصول پر قائم تھا۔ یونانی بیرنوں کا برادر تابعین کا ایک جاگیرداری طبقہ بنتا گیا جن میں سے ہر ایک نے اپنی حد کے اندر اپنی آزادی کا سبق سیکھ لیا تھا اس طرح شاہی عہدہ داروں کی گروہ بندی نایاں شاہی کے آزادانہ اقتدار سے مبدل ہو گئی اور امارت اور امرا کی جاگیریں موروثی ہو گئیں۔

(۳) نئے جاگیردار امرا کو تیسرے دور (یعنی شاہان کا پیٹ ۷۵۲ھ سے سنٹ لوئس ۱۲۷۰ء تک کے عہد) میں انتہائی عروج و طاقت حاصل ہوئی۔ کارل اعظم اس کو سمجھتا تھا کہ سلطنت کا اتحاد کیونکر برقرار رکھا جائے اور شاہی طاقت کو کیونکر استحکام حاصل ہو مگر اس کے جانشینوں کے تحت میں فرانکون کی عالمگیر شہنشاہی متعدد آزاد سلطنتوں میں منقسم ہو گئی اور خود فرانکی بادشاہی کے اندر عہدے اور جاگیریں زیادہ آزاد ہو گئیں، کارل اقرع کو مجبور ہو کر اپنے تابعین کے بلکہ ادنی تابعین کے بیٹوں کے حق میں کاونٹ کے عہدے اور شاہی جاگیر کے موروثی ہونے کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا[2]۔

---

[1] گیزو کے "مقالات فرانس کی تاریخ پر"، صفحہ ۵۲۔
Gnizot, Essais Sur l' histoire de Frauce

[2] جاگیروں کی وراثت فرانس میں بہت بعد کے زمانے تک عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی تھی

اس کے بعد بہت ہی جلد جاگیروں میں قریبی رشتہ داروں کا موروثی حق بھی تسلیم کرلیا گیا۔ صرف کلیسا میں عہدے کے اعتبار سے شخصی امرا کا تخیل باقی رہگیا ورنہ سلطنت میں اس کی صورت موروثی جاگیرداری کی ہو گئی تھی۔ اس طرح موروثی حکم الفوں کی حکومت مختلف درجوں اور مختلف شکلوں میں تمام فرانس پر چھا گئی۔

اعلیٰ طبقہ امرا

ان امرا میں سے بعض کو تمام اہم معاملات میں اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور وہ بادشاہ کے لئے ایک بہت ہی محدود جاگیردارانہ اقتدار سے زیادہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اس اعلیٰ طبقے میں ڈیوک کاؤنٹ وائی کاؤنٹ اور بیرن شامل تھے زیادہ تر ان میں سے خود بادشاہ کے تابعین تھے بعض ان میں سے ڈیوکوں اور کاونٹوں کے بھی تابع تھے اور بہت ہی کم ایسے تھے جو اپنے علاقے میں آزاد مطلق ہوں۔ عدالت کے معاملے میں وہ اعلیٰ اقتدار رکھتے تھے اور فوجی نظام کے وہی سرگروہ تھے کیونکہ فوجی نظام میں اب اس کی پہلی سی قومی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی، اور وہ جاگیرداروں اور نائبوں کی خدمت کا نظام رہ گیا تھا، دوسری طرف بادشاہ کی جو فوجی خدمت ان پر لازم تھی وہ قطعی طور پر معین و مشخص تھی۔ بادشاہ اُن کی رضامندی کے بغیر نہ تو قانون شائع کر سکتا تھا اور نہ محصول لگا سکتا تھا۔ اسی طرح سے وہ بھی اپنے حدود کے اندر اپنے تابعین کی رضامندی سے احکام نافذ کرتے اور محصول عاید کرتے تھے جو شخص بھی ان کے حدود اقتدار کے اندر رہتا تھا اسے اُن کی وفاداری کی قسم کھانا پڑتی تھی اور تابعین کو صداقت اور اطاعت کی قسم کھانا ہوتی تھی خلاصہ یہ کہ وہ اُن کی رعایا تھا۔

اس طرح سیاسی شاہی اقتدار ٹوٹ کر بہت سی ایسی موروثی شاہیوں میں منتشر ہو گیا جن کی بنا شخصی حقوق پر قائم تھی اور جن کے آپس میں ایک نہایت کمزور واسطہ باقی رہ گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ گیارھویں صدی کے نصف ثانی تک بادشاہ اس اصول کی مخالفت کرتے رہے تھے۔

اعلیٰ طبقۂ امرا اب قوم کا ممتاز طبقہ نہیں رہا تھا نہ اس کی ہستی بادشاہ کی اُس وفاداری اور اُن خدمات کی شکل میں رونما تھی جو بادشاہ کے لئے اُس پر لازم تھیں۔ اب تو اُس طبقے کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے ارکان جاگیردار والی اور حکمراں بن گئے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اُس نے خود بادشاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے۔

ادنیٰ طبقۂ امرا

ادنیٰ طبقۂ امرا میں بھی اسی قسم کی صورتیں پیش آئیں۔ دو ذرائع سے یہ طبقہ پیدا ہوا تھا ایک پیشۂ سپہگری۔ دوسرے درباری خدمات۔ ابتداءً پیشۂ سپہگری ہی تھا جس نے ان نائٹوں اور خادموں کی وقعت پیدا کی جو کسی رئیس کی مخصوص وفاداری کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے، لیکن نائٹ عام طور پر آزاد ہوتے تھے اور خدام اکثر بیشتر غلاموں کی اولاد سے ہوتے تھے۔ مگر کچھ زمانہ بعد یہ پیشہ ور طبقۂ امرا بھی موروثی اور جاگیری طبقہ بن گیا۔ نائٹوں نے ریاستیں پیدا کر لیں جو ان کے خاندان میں موروثی ہو گئیں اور عہدہ داروں نے درباری جاگیریں حاصل کر لیں۔ صاحب ثروت ہونے کے لحاظ سے وہ عوام سے الگ ہو گئے اور تابعین کی حیثیت سے وہ اپنے رئیسوں سے قریب تر ہو گئے۔ جس طرح رئیس اپنے بادشاہ کے ساتھ منیز (دسترخوان) پر بیٹھتا تھا اسی طرح نائٹ رئیس کی میز پر بیٹھتا تھا۔ جنگ اور دربار میں ان کی خدمتیں ان کی جائداد سے اُسی طرح وابستہ ہوتی تھیں جس طرح حکمرانوں کے شاہانہ حقوق اُن کی مملکت سے وابستہ تھے۔ وہ بھی ایک طرح کا محدود مملکتی اقتدار شاہی رکھتے تھے۔ اور اپنے جاگیری رئیس کی عام رعایا کے اوپر ایک طرح کا ادنیٰ قسم کا اور درمیانی عدالتی اختیار بھی انھیں حاصل تھا، ان کا طبقہ رفتہ رفتہ زیادہ علیحدہ ہوتا گیا اور نائٹوں کے طبقے کی بنا پہلے تو محض اُن کے پیشے پر تھی لیکن اب نائٹ کی نسل سے ہونا اور اُسی کے مطابق تربیت یافتہ ہونا لازم ہو گیا تھا۔ نیا طبقۂ امرا، اپنے نسب کی بنا پر طبقۂ معززین کہلاتا تھا، یہ ضرور ہے کہ محض نسب سے کوئی شخص "نائٹ" نہیں ہو جاتا تھا مگر یہ بھی تھا کہ جس شخص کا باپ نائٹ نہیں ہوتا تھا (ماں سے بحث نہیں) وہ بالعموم نائٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف بادشاہ کسی شخص کو طبقۂ امرا میں شامل کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اول اول طبقۂ امرا کے ساتھ جاگیر کی ملکیت اس طرح وابستہ تھی کہ عام آزاد اشخاص جو جاگیر خرید لیتے اور وہیں رہتے تھے وہ اپنے اس علاقے کی وجہ سے امرا میں

داخل ہو جاتے ہیں اور جب ان کے پوتے اس جاگیر کے وارث ہو جاتے تھے تو وہ طبقۂ معززین میں شامل ہو جاتے تھے، مگر بغیر جاگیر کے آزاد شرفا جو بیت بورسن نوع ثانی کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی جاتی تھی وہ سب تعلیم اور پیشے کی بنا پر قائم تھی۔

اس ادنی طبقۂ امرا کے تحت میں بھی تابع تابعین (Ranasseue) سے لیکر تابعین (Viques) تک بہت سے درجے تھے۔ آخر الذکر کی تعداد بالخصوص جنوب میں زیادہ تھی اور اکثر انھیں درمیانی درجے کے عدالتی اختیارات حاصل تھے، انھیں میں صاحبان قصر (Chatelains) تھے جن میں بعض اعزاز کے اعتبار سے بیرنوں کے ہم مرتبہ تھے اور انھیں میں وائی کاونٹ (Vicontes) تھے جن میں سے بعض بیرنوں سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے کاؤنٹ جاگیری خدمت میں نیچی حیثیت کے لوگوں میں شامل تھے مگر مدارج و امتیازات کے ان تمام پیچ در پیچ تنوعات میں جاگیردارانہ اصول ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔

سینٹ لوئس سے فرانسیسی انقلاب تک ۱۷۸۹-۱۲۲۶

(۴) چوتھے دور میں طبقہ امرا کا کامل تغیر واقع ہو گیا۔ پہلے تو اقتدار شاہی کے لئے بادشاہ اور امرا میں کشمکش شروع ہوئی۔ بادشاہ قومی اتحاد کے بیدار شدہ جذبات اور سلطنت کے زندہ شدہ احساس کے نمائندے تھے۔ اس کشمکش میں وہ مقنن ان کی تائید پر تھے جو رومی قانون کے اصول پر زور دے رہے تھے اور بالآخر سے عمل آمد میں لے آئے۔ انھیں اپنے مسلمات کے لئے شاہی عدالت میں پارلیمنٹ کی شکل میں ایک قومی ذریعہ اظہار خیال کا ہاتھ آگیا۔ قوم اور بالخصوص شہروں کے باشندے اگرچہ مداخلت بہت کم کرتے تھے مگر بالواسطہ وہ بھی ان کی تائید پر تھے۔

شاہی عہدہ داروں کا ایک نیا نظام جو جاگیردارانہ تعلق سے آزاد تھا بتدریج مروج کیا گیا۔ بادشاہ کی تنخواہ دار فوجیں کسی حصر و تعیین کے بغیر شاہی احکام کی بجاآوری کے لئے حاضر تھیں، ڈیوکوں اور کاونٹوں کی بڑی بڑی جاگیریں یکے بعد دیگرے بادشاہ کے قبضے میں آگئی تھیں، کبھی وراثت کے ذریعے سے کبھی معاہدے کے ذریعے سے اور بیشتر مسلح قوت کے زور سے ان پر تسلط ہو گیا تھا اور علحدہ شدہ شاہی طاقت ایک مرتبہ پھر تاج کے اندر مجتمع ہو گئی تھی اس طرح امرا کا آزادانہ اقتدار شاہی ٹوٹ گیا۔ اکا برملک پر بادشاہ کی فتح کو لوئس یازدہم (۱۴۶۱-۱۴۸۳)

نے مکمل کر دیا۔

امرا کے پاس ان کے قدیمی ملکی اقتدار شاہی کے تھوڑے بہت باقیات رہ گئے تھے۔ بعض صوبوں میں وہ صوبہ دار ہو گئے مگر مملکتی امرا کے طور پر ان کی حیثیت باقی نہیں رہی۔ رعایا میں ان کی حیثیت ایک ذی امتیاز طبقے کی رہ گئی تھی اور نئے خیالات اور اعتقادات ان کے اس اعزاز و امتیازات کے یوماً فیوماً مخالف ہوتے جاتے تھے۔ بادشاہ اور امرا میں بعد کو جو کشمکش ہوئی وہ بالکل ہی دوسری قسم کی تھی[1]۔ درحقیقت وہ سیاسی اور مذہبی فرقوں کی کشمکش تھی اور بعض اوقات محض درباری فرقوں کی کشمکش بن جاتی تھی جن کے سرگروہ علی العموم امرا ہوتے تھے۔

امرا اگر اثر و قوت حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے تھے تو وہ صرف شاہی خدمت ہی کے ذریعے سے اس غرض کو پوری کر سکتے تھے، وہ مجلس ملی (اسٹیٹس جنرل) میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اس نے کوئی معین و منضبط شکل اختیار ہی نہیں کی۔

اس طرح جاگیر دارانہ طبقۂ امرا کے بجائے ایک درباری طبقۂ امرا قائم ہو گیا جس کا انحصار سیاسی حقوق کے بجائے زیادہ تر ظاہری درجہ و اعزاز پر تھا۔ ہنری چہارم نے امرا کو اپنی جاگیروں پر رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ لوئیس چہاردہم نے انھیں دربار میں بلا لیا تاکہ دربار کی شان و شکوہ سے خیرہ ہو کر انہیں کامل انقیاد پیدا ہو جائے اول درجہ فرانس کے ہمسروں کا تھا۔

اولاً ان کی تعداد بارہ تھی جن میں سے چھ مذہبی امرا ہوتے تھے اور چھ تاریخ کے دنیاوی

جاگیردارانہ امرا درباری امرا ہو گیا

[1] دی توک ویل نے اپنی کتاب "سلطنت قدیم" میں ظاہر کیا ہے کہ طبقۂ امرا کے سیاسی حقوق کے برطرف کر دینے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اقتصادی امتیازات کو برقرار رکھنے سے کس طرح ان کے خلاف قومی منافرت کو حرکت ہوئی۔ جبتک وہ عدالتی فرائض انجام دیتے تھے اور بالتخصیص امور عامہ میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اس وقت تک محصولات سے ان کا مستثنیٰ رہنا اور زمین اور اشخاص کے محصولات سے انھیں رقوم کا ملنا قابل فہم معلوم ہوتا تھا مگر جب شاہی عہدہ دار سلطنت کے تمام انتظامی و عدالتی کاموں کو انجام دینے لگے تو پھر یہ اقتصادی امتیازات بالکل ناواجب معلوم ہوتے تھے۔

تابعین ہوتے تھے مگر بعد میں شہزادوں اور دوسرے دنیاوی امرا کے اضافے سے اُن کی تعداد بڑھادی گئی۔ اعزاز ہمسری (Peerage) موروثی تھا، انھیں بادشاہ کے حضور میں اور پیرس کی پارلیمنٹ میں جانے کا حق حاصل تھا اور ان کا مقدمہ صرف پارلیمنٹ ہی میں پیش ہو سکتا تھا۔ تاجپوشی کے موقع پر یہ لوگ ہمیشہ شاہی نشانات لیکر چلتے تھے۔ ہمسروں کے بعد ڈیوک، مارکوئس، کاونٹ، بیرن، وای کاونٹ، شاتیلیں (صاحبان قصر) کے درجے تھے جن کے مدارج ان کے خطابات ونشانات سے ظاہر ہوتے تھے۔

آخر میں اسکوائر اور معمولی جنٹلمین (شرفا) کا طبقہ تھا۔ قدیم طبقۂ امرا کا انحصار زیادہ تر زمین پر تھا مگر ملکی حقوق پر متصرف ہونے کا بھی ایک حد تک اثر پڑتا تھا لیکن اب اس کے پہلو بہ پہلو ایک نیا طبقہ امرا کا پیدا ہو گیا جس کی بنیاد خاصکر شاہی عطیے پر تھی، ان میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو اعلیٰ ملکی اور فوجی عہدوں کے لئے نامزد ہوتے تھے اور سب سے زیادہ شاہی عدالتوں کے قانون داں اشخاص اس میں داخل تھے جو امرا جبہ (Noblesse de robe) کہلاتے تھے، یہ خدمتیں موروثی نہیں تھیں اور نہ زمین سے ان کا تعلق تھا پس اس لئے اس طبقے میں برابر نئے لوگ شامل ہوتے رہتے تھے۔ اسی سے قریب محققین علوم (Doctors of law) کا طبقہ تھا جو اور سب کے برخلاف شاہی عنایت پر نہیں تھا بلکہ علمی فضیلت پر مبنی تھا۔

استادی امرا

طبقۂ امرا میں ایک فروتر جزو اُن بہت سے افراد کا تھا جو اسناد کی بنا پر آبائی امرا کے زمرے میں شامل کئے جاتے تھے۔ یہ اسناد اکثر اُس رقم کے وصول کرنے کی غرض سے دیے جاتے تھے جن کا ادا کرنا ایسے امیروں پر لازم تھا اور کبھی کبھی خدمات کے انعام کے طور پر بھی عطا ہوتے تھے مگر وہ خدمات ہمیشہ عزت و آبرو والی خدمتیں نہیں ہوتی تھیں۔

انقلاب

(۵) فرانسیسی انقلاب کے مختصر مگر ہولناک آشوب نے طبقۂ امرا کا سارا نظام درہم وبرہم کر دیا، اس انقلاب کی ابتدا اس تبدیل سے ہوئی کہ ابتک جو طبقات علٰحدہ علٰحدہ تھے وہ سب ایک عام قومی مجلس میں شامل کر دیے گئے اُس کے بعد طبقۂ امرا کی امتیازی حیثیت مٹادی گئی اس لئے کہ امتیاز عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا اور انجام کار امرا کا قتل عام کر کے کل سطح معاشرت کو ہموار کر دینے کی کوشش کی گئی۔

(۶) جب جوشِ انقلاب ممتاز اشخاص کے خون سے پوری طرح سیراب ہو چکا اور نظریہ مساوات کی سربلند موجیں واقعات کی چٹانوں سے سر ٹکرا کر پست ہو گئیں تو خود فرانس میں کئی بار کوشش کی گئی کہ اگلے وقتوں کے زمین دوز کھنڈروں پر ایک نئے طرز کے طبقۂ امرا کی بنیاد قائم کی جائے مگر ایسی کسی کوشش کو دیرپا کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ دلچسپ کوشش نپولین کی تھی، جس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ طبقۂ اعیان ایک طرف شاہی کو تقویت دینے اور دوسری طرف اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لئے بس ضروری ہے اُس نے "جیشِ اعزاز" کے طبقے کو قائم کر کے ایک طرح کے جدید نائٹ بنائے۔ اس اعزاز کا راستہ ہر اُس شخص کے لئے کھلا ہوا تھا جو سلطنت کی کوئی نمایاں خدمت انجام دے مگر فی الحقیقت یہ ایک محض شخصی اعزاز تھا۔ نپولین یہ بھی چاہتا تھا کہ ایک بلند تر موروثی طبقہ اعیان قائم کرے جس میں قدیمی تاریخی امرا کے خاندانوں کے باقیات کے ساتھ موجودہ فرانسیسی سپہداروں، وزیروں اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کی اولاد بھی شامل کر لی جائے اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کے مرکوزِ خاطر یہ تھا کہ قدیم رومی شہنشاہی کی تنظیمات کو فرانسیسی تاریخ کی روایات سے ملا دے لیکن یکم مارچ ۱۸۰۸ء کے قانونِ موضوعہ کو جاری کر کے اُس نے طبقۂ امرا کی تجدید میں پہلا ہی قدم اُٹھایا تھا کہ خود اس کا زوال ہو گیا۔

لوئس ہژدہم (۱۸۲۴-۱۸۱۴ء) اپنے طبقۂ اعیان میں انگریزی انداز کے قریب تر پہنچ گیا تھا مگر کسی قسم کا سپاہی طبقۂ اعیان قائم کرنے میں اُسے بھی ناکامی ہوئی۔ قدیمی امرا کو انقلاب نے پوری طرح تباہ کر دیا تھا حقوق کی مساوات اور املاک کے آزادانہ نقل و انتقال کا اصول لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسا بس گیا تھا کہ طبقۂ امرا کی تجدید کسی نوع سے بھی ہوتی وہ عام حقوق پر گویا ایک قزاقانہ دست اندازی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم امرا میں سے ایک بڑے حصے نے خود اپنے ملک کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے اور ان کے جدید دعاوی کا انحصار غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے فرانس کے فتح ہونے پر مبنی تھا۔ پرانی نفرت ایسی ہی قوی تھی جیسی پہلے تھی اور طبقۂ اعیان نے کسی قسم کی جدید خدمت ایسی نہیں کی تھی جس سے لوگ آشتی کے ساتھ اس پر مائل ہو جاتے کہ امرا کو پھر نئے سرے سے سیاسی عروج حاصل ہو۔ ۱۸۳۰ء کے جولائی والے انقلاب نے دوبارہ موروثی امرا اور طبقۂ اعظم کو منسوخ کر دیا اور صرف حیاتی امارت جو اس کے بعد قائم ہوئی اسے فروری ۱۸۴۸ء کا طوفان بہا لے گیا۔ طبقۂ امرا کے ہر طرح کے خطابات و امتیازات کے خلاف سلطنت جمہوری نے

نپولین اول

لوئس ہژدہم

دوبارہ اپنے منشا کا اعلان کردیا۔

فرانسیسی طبقۂ امرا اس کے بعد پھر کبھی ترتیب نہیں دیا گیا۔ سینا تی کا منصب جو نپولین سوم نے اپنے نظام سلطنت میں اختیار کیا تھا اس میں طبقۂ امرا کے نمو پانے کے آثار دکھائی دیتے تھے مگر اس دوسری شہنشاہی کے زوال کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی ختم ہوگئی اس کے بعد فرانسیسی طبقۂ امرا صرف اس حد تک از سرِ نو قائم ہوا ہے کہ قدیمی خطابات کا جواز تسلیم کرلیا گیا ہے اور بیجا استعمال کا انسداد کردیا گیا ہے۔

نپولین سوم

قوم میں اب بھی اعیانی عناصر و رجحانات موجود ہیں مگر عوام کی جمہوری طبیعت کے مقابلے میں اُنھیں کامیابی کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اب فرانسیسی امرا صرف خطابی امرا ہیں ان کے کسی طرح کے خاص حقوق نہیں ہیں اور ان کا قیام زیادہ تر خاندانی خودنمائی کی وجہ سے ہے نہ کہ عام تنظیمات کی وجہ سے۔

گیارھواں باب

(ب) انگریزی طبقۂ امرا

اختلاط نسل

جدید یورپ میں بس انگلستان ہی ایک ملک ہے، جہاں ابھی تک طبقۂ امرا ایک مستقل اور رفیع المنزلت قومی تنظیم کی حیثیت سے قائم ہے، یہ نتیجہ مختلف اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوا ہے۔

(۱) فرانس کے طبقۂ امرا کی طرح ازمنۂ وسطیٰ کا انگریزی طبقۂ امرا بھی انگریزی اور نورمانی دو قومیتوں کے عناصر پر مشتمل تھا، فرانسیسی طبقۂ امرا کے بہ نسبت یہاں ان دونوں کے درمیان رابطۂ اتحاد زیادہ قریب تھا۔

اس میں شک نہیں کہ فتح (۱۰۶۶ء) کی ابتدائی صدیوں میں نورمانیوں نے سکسنیوں پر غلبہ قائم کر رکھا تھا مگر فرانس کے رومانیوں اور فرانکیوں کے تعلقات کے بہ نسبت ان کے تعلقات زیادہ گہرے تھے۔

سکسونی ارل (Eorls) کو ایک قومی طبقہ امرا کی حیثیت سے مدت سے عام آزاد گروہ (Ceorls) پر امتیاز حاصل تھا۔ اُن کی تعلیم اُن کی معاشرت، اُن کے خیالات وہی تھے جو نورمانی امرا کے تھے اور اپنے نئے بادشاہوں کے مقابلے میں بھی اُنھوں نے اپنے قدیمی حقوق کو قائم رکھا۔ فتح کا اثر صرف یہ ہوا کہ اُن کی آزادانہ طبیعت میں اور زیادہ تقویت آگئی اور جس مزید جوش و قوت کے ساتھ اُنھوں نے اپنے حقوق کو قائم رکھا، اس سے طبقۂ امرا میں بہ حیثیت مجموعی سیاسی آزادی کی وہ روح پیدا ہو گئی جو انگلستان کی اس عظمت کا باعث ہوئی۔

شاہی طاقت

(۲) دوسری طرف فتح کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ شاہی طاقت جس پر ملک کے اتحاد و امن کا بہت کچھ انحصار تھا، امرا کے مقابل میں برقرار رہی اور فرانس کی طرح اقتدار شاہی چند بڑے بڑے تابعین کے درمیان منتشر نہیں ہو گیا۔

اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی جاگیردارانہ طریق کا دخل ضرور رہا مگر وہاں اُس کی حالت بدل گئی تھی، یہ پرانا خیال کہ انگلستان میں اول اول ایسے نورمانیوں نے رواج دیا حال کی تحقیقات سے باطل قرار پاگیا ہے قدیمی سکسونی "تھقین" (منوسلین شاہی) ایک بڑی حد تک جاگیروں کے مالک تھے اور اس طرح بادشاہ کے ساتھ ایک خاص وفاداری اور فوجی خدمت کے رابطے کے ساتھ مربوط تھے، مگر یہ صحیح ہے کہ نورمانی حکومت نے فی الجملہ سلطنت کو زیادہ نمایاں جاگیردارانہ حیثیت میں تبدیل کردیا، فتح کے وقت جاگیردارانہ طریقہ نورمانڈی میں انگلستان کے بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھا، اور فاتحین اپنے خیالات اپنے ساتھ لائے تھے۔

ولیم اول

(خود ولیم فاتح ہی نے یہ اصول رائج کیا تھا کہ نہ صرف بڑے مستاجرین بلکہ ماتحت مستاجرین اور بڑے بڑے قابضین اراضی براہ راست بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھائیں تاکہ فوجی خدمت کے دائرے میں تمام رعایا براہِ راست بادشاہ کے تابع رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر تمام ارضی جائدادیں جاگیرانہ بندش کے اندر آگئیں اور یہ مقولہ زباں زد ہوگیا کہ "بادشاہ اپنی مملکت کی تمام جائدادوں کا رئیس اعظم اور مالک اول ہے اور کوئی شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ شاہی عطیے کے بغیر اس کے کسی جزو پر قابض نہیں ہوسکتا۔" اس طرح تمام ارضی ملکیت یکساں طور پر سلطنت کے تابع ہوگئی) ولیم جس جاگیری اقتدار شاہی پر عامل تھا وہ اس کے وقت کے فرانسیسی بادشاہ کے اقتدار سے بہت قوی تھا نورمانڈی کا ڈیوک (یعنی خود ولیم) جو جاگیرداری اصول سے شاہ فرانس کا ایک ماتحت رئیس تھا برائے نام اُس کے اثر میں تھا اور یہ بھی حقیقت سے خالی محض ایک ضابطہ پیمائی تھی۔

اس طرح نورمانی اور سکسونی امرا اگرچہ اپنے تابعین پر عدالتی اور حفاظتی اختیارات ازمنۂ وسطیٰ کے طرز پر عمل میں لاتے تھے۔ پھر بھی وہ حقیقتاً شاہی اقتدار کے اندر تھے اور سلطنت کا اتحاد بیرنوں کے اوپر نثار نہیں کیا گیا تھا۔

(۳) لیکن اگر اس اعتبار سے انگریزی طبقۂ امرا کے حقوق ایک طرف تنگ و محدود تھے تو دوسری جانب ان کے سیاسی حقوق بہت ہی اہم تھے یہی حقوق ہیں جو ان کی عظمت اور مستقل اہمیت کا باعث ہوئے۔

پارلیمنٹ میں امرا کی قوت

ان سیاسی اور قومی حقوق کے اظہار کا موقع اُن عظیم الشان مجلسوں میں آتا تھا جو بہت ہی جلد پارلیمنٹ کے زیادہ منکسرانہ نام سے موسوم ہو گئیں۔ پارلیمنٹ کی صورت میں قدیمی انگلو سکسیونی مجلس عقلا ایک نئی شکل میں زندہ کی گئی تھی اور دونوں نسلوں کو عام اغراض وحالات کے سلسلے میں باہمگی متحد کر دینے میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بڑے بڑے تابعین کے اجتماع کی غرض اولاً اس سے زیادہ نہ رہی ہو گی کہ وہ ایسٹر، وٹسین ٹائیڈ اور کرسمس کے تہواروں میں تاج کی شان وشوکت کے بڑھانے کے باعث ہوں مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے بڑی سیاسی اہمیت حاصل کر لی اور سلطنت کے نہایت ہی اہم معاملات پر ان کے درمیان بحث وفیصلہ ہونے لگا، اگرچہ اولاً ان کے حدود واختیار کے لئے قطعی قواعد وضوابط معین نہیں تھے مگر تیرھویں صدی میں اُنھوں نے زیادہ منضبط صورت اختیار کی۔

منشور اعظم

امرا نے جب اپنی حفاظت حقوق کے لئے ہتھیار اُٹھایا اور فتحمندانہ طور پر شاہ جان سے سنہ ۱۲۱۵ع کا منشور اعظم بزور حاصل کیا تو اُس منشور میں یہ مرقوم تھا کہ اساقفۂ اعظم، دیگر اساقفہ، شیوخ الصوامع کاؤنٹ اور بڑے بڑے بیرن بادشاہ کے خطوط کے ذریعے سے پارلیمنٹ میں فرداً فرداً طلب کئے جائیں گے اور بادشاہ کے دوسرے بلا واسطہ تابعین شاہی عہدہ داروں کی وساطت سے عام حکم کے ذریعے سے بلائے جائیں گے اور یہ کہ جدید محصول ان کی رضامندی کے بغیر نہیں عائد کیا جائے گا۔

ان اعلیٰ ان ادنیٰ

مرور ایام سے طبقۂ اول جو بادشاہ کا موروثی مشیر تھا اور دربار وسلطنت کے بلند ترین عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے امور عامہ کے اہم انتظامات پر قابض تھا، ایوان اعلیٰ ہو گیا اور طبقۂ دوم ایوان ادنیٰ کا ایک جزو ہو گیا۔ اولاً دونوں کو کونسل میں نشست کا حقِ ذاتی حاصل تھا مگر پھر طبقۂ دوم کے لئے یہ حق نیابت کی صورت میں بدل گیا اور اس بارے میں یہ لوگ نائٹ تاج کے بڑے تابعین کے فروتر تابعین، شہروں اور قصبوں کے باشندوں کے ساتھ شریک کر دئے گئے۔ اس کے بعد بڑے لارڈ اعلیٰ طبقۂ اعیان بن گئے اور دولتمند اہلِ شہر شرفا کے فروتر طبقۂ اعیان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

طبقۂ امرا کو سلطنت میں اپنی فطری جگہ اس وقت ملی جب تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں نظام پارلیمنٹ مکمل ہو گیا۔ ہنری سوم کے عہد میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیرن ارل لیسٹر کی سرکردگی میں شاہی کی ہستی کو معرض خطر میں ڈال دیں گے اور حکومت

کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے مگر یہ ایک عارضی مداخلت تھی اور بہت جلد یہ اصول دوبارہ قائم ہو گیا کہ طبقہ اعیان امور عامہ میں ایک معین اثر اور توضیح قانون میں مخصوص شرکت کا مستحق ہے مگر حکومت کے شاہی حقوق کے عمل میں لانے کا اُسے کوئی استحقاق نہیں ہے۔

پارلیمنٹ کی وسعت

جب شہروں اور قصبوں کے نائبین کے اضافے سے پارلیمنٹ کو وسعت حاصل ہوئی تو ان امرا کی سیاسی طاقت اور بھی محدود ہو گئی اور ان کی طاقت پر اس کا بھی اثر پڑا کہ براعظم یورپ کی طرح انگلستان میں پارلیمنٹ کے لئے نائٹ خود اپنے طبقے کی طرف سے نامزد نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ آزاد مستاجرین کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔

خاص طبقۂ اعیان خالصتہً "لارڈز" پر مشتمل تھا۔ فرانس اور جرمانیا کی طرح یہ کبھی بھی خاندانی اور مملکتی طبقۂ اعیان نہیں بنا بلکہ ملک کے ایک طبقے کے طور پر باقی رہا۔ جیسے بادشاہ اور قانون کے تحت میں فوجی اور عدالتی نظام کے اندر اور نیز اپنے تابع مستاجرین پر اپنے اختیارات کے عمل میں لانے کے حقوق حاصل تھے۔

نائٹ۔

نائٹ یعنی آزاد اشخاص جو بادشاہ یا امرا کو ایک خاص رقم ادا کرنے سے اس حق پر فائز تھے انھوں نے ایک با اثر حیثیت حاصل کر لی تھی، فوج محافظ میں انھیں اول درجہ حاصل تھا اور ناظمانِ امن کی حیثیت سے اُنھیں پولس و عدالت کے اختیارات تفویض تھے پارلیمنٹ کے لئے صوبوں کے قائم مقام انھیں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ اعلیٰ شہری طبقے میں اُن کے

جنٹلمین (شرفا)

چھوٹے لڑکوں کا شمول اور نائبیان قصبات کے ساتھ اُن کے پارلیمنٹی تعلقات ہی سے فی الواقع طبقۂ شرفا کا موجودہ خیال پیدا ہوا جس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اپنے حسب و نسب، عہدے، تعلیم یا جائداد کی وجہ سے عامتہ الناس سے معزز ہیں۔

۴۔ انگریزی طبقۂ امرا کا جوش عامہ

(۴) انگریزی طبقۂ امرا کی ایک اور خصوصیت ہے جو خاص لحاظ کی مستحق ہے کیونکہ اس سے وہ فرانس کے اور ایک حد تک جرمانیا کے بھی طبقۂ امرا سے قابل اعزاز طور پر ممتاز ہیں۔ اسی زمانے میں جب کہ صرف بیرن ہی سلطنت میں ایک سیاسی طاقت تھے، تو وہ اپنی ذات خاص اور اپنے ذاتی حقوق کے سوا کچھ اور امور کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں بہ حیثیت ایک قومی جماعت کے اپنا یہ کام سمجھ لیا تھا کہ جمہور کے اعزاز عامہ کے لحاظ سے قوم کے حقوق کی مداخلت اور اس کی آزادی کی محافظت کریں۔ انگلستان کی سیاسی آزادی ایک بڑی حد تک اُنھیں کی حاصل کردہ ہے۔ جب یہ آزادی

ایکبار مضبوط بنیاد پر قائم ہوگئی تو اعلیٰ طبقۂ اعیان جمہوریت کی موجوں کے مقابلے میں ایک
مستحکم پشتہ بن گیا، اُنھوں نے اپنی قومی آزادی کی محافظت کی حیثیت کو بدل دیا اور تخت اور
مروجہ تنظیمات کی حفاظت کا کام اختیار کیا، جو اس درجہ ہر دلعزیز تو نہیں تھا، مگر نہایت ہی مفید
تھا وہ بادشاہ اور عامۂ قوم کے درمیان میں تھے۔ وہ خود بذات خاص حکمراں ہونے کی
قوت نہیں رکھتے تھے مگر ان کی آزادی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ عوام کی ہر ایک پرجوش
تحریک یا بادشاہ کے ہر ایک مذاق طبعی کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
اُنھوں نے دونوں کی آزادی وحقوق کو ایک دوسرے کی زد اور برہمزدگی سے
محفوظ رکھا۔

انگریزی طبقہ امرا نے فرائض عامہ میں ہمیشہ مستقلانہ و رہبرانہ حصہ لیا ہے، اُن کی تعلیم تک
سیاسی آزادی اور شخصی حریت کے اثر سے مملو ہے، فریقانہ سیاسیات، ناظمان امن کی حیثیت
سے ان کے کائم انتخابات، انتظام ضلع اور مشاغل جوری میں ان کی شرکت، ان کی رضاکارانہ
انجمن، اور اغراض عامہ میں ان کی امداد، غرضکہ مستعد کار زندگی کی یہ تمام شکلیں انھیں قوم کی
زندگی سے باخبر رکھتی اور حکومت خود اختیاری کے فرائض اور خدمت حب وطن کی تعلیم
دیتی ہیں۔

طبقہ امرا
جانشینی
ف ایک
نے کے لئے
و دھونا

(۵) انگریزی امرا کے مقابلہ میں موروثی اصول قانون عامہ کا ایک قاعدہ بن گیا اگرچہ
اس نے ایسی قطعی اور وسیع الاثر شکل نہیں اختیار کی جیسی براعظم میں ہے۔ اول اول حق وراثت
نیز امتیاز امارت زمین یا عہدے کے قبضے سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، امارت کی کیفیت
قطعی طور پر ملکیتی تھی مگر بعد میں یہ تعلق توڑ دیا گیا اور امارت بہ حیثیت ایک ذاتی اعزاز کے وارثاً منتقل
ہونے لگی۔

مگر کسی مخصوص جائداد، قصر یا عہدے سے امارت کے اس ابتدائی تعلق کی وجہ سے یہ اہم
اصول پیدا ہوا کہ متوفی امیر کا صرف ایک ہی بیٹا یا ایک ہی رشتہ دار اس کے بجائے پارلیمنٹ
میں شریک ہوسکتا ہے، جانشینی خلف اکبر کے اصول کے موافق صرف ایک بیٹا "لارڈ" ہوتا تھا
باقیوں کو چھوٹے درجے ملتے تھے، اور اعلیٰ طبقۂ امرا سے وہ خارج رہتے تھے۔ نہ صرف لارڈ
کے چھوٹے بیٹے قانوناً اسکوائر ہیں بلکہ باپ کی زندگی میں بڑے لڑکے کو بھی "لارڈ" محض اخلاقاً
کہتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو بڑے خاندانوں کا اعزاز وتمول ایک شخص کے اندر

مجتمع رہا اور دوسری طرف ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آسانی کے ساتھ منتقل ہوجانے سے امتیازات نسب کی وقعت گھٹ گئی۔

(۶) عقد

(۶) کسی امیر کے لئے یہ لازمی نہیں تھا کہ وہ کسی امیر ہی گھرانے میں شادی کرے۔ "لارڈ" کی بیوی "لیڈی" کہلاتی ہے خواہ وہ عام باشندگان ملک کے طبقے میں سے کیوں نہ ہو۔ اس اصول سے طبقۂ امراء کے اعزاز میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور بہت سے وہ اعتراضات رفع ہوگئے جو برابری نسب کے اصول سے پیدا ہوتے تھے جس سے طبقے کے بجائے ذات کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس پر جرمانی طبقۂ امراء بہت سختی کے ساتھ جما ہوا ہے۔

(۷) جدید اضافہ

(۷) آخر میں یہ کہنا ہے کہ طبقۂ امراء میں وقتاً فوقتاً نئے امراء کے اضافے سے وسعت و زندگی پیدا ہوتی رہی ہے نئے امیر بنانے کا حق بادشاہ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ وہی تمام سیاسی عزتوں کا سرچشمہ ہے۔ بادشاہ ہی طبقۂ امراء میں نئے اراکین کا اضافہ کرسکتا ہے اور ڈیوک، مارکوئس، ارل، وائکاونٹ یا بیرن کے خطابات کے ساتھ امارت کے حقوق عطا کرسکتا ہے مگر دستور یہ رہا ہے کہ یہ سیاسی اعزاز صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو بہ حیثیت سپہ سالار یا مدبّر کے اپنے خدمات عامہ سے امتیاز حاصل کریں اور جن کے پاس اتنی جائداد موجود ہو یا اب مل جائے جو ان کی حیثیت کی ضرورتوں کی کفیل ہو سکے اس طرح ان سچی اعیانی قوتوں کے مسلسل اضافوں نے انگریزی طبقۂ اعیان کو جمود اور نا قابلیت کے خطرے سے بچا لیا۔ اس طریقے کی وجہ سے قوم کے قابل ترین اور ذہین ترین افراد یہ توقع کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے کو اور اپنے خاندان کو سیاسی زندگی کی درخشاں بلندیوں پر پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۷۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک میں چونتیس ڈیوک [۳۴]، انتیس [۲۹] مارکوئس، ایک سو نو [۱۰۹] ارل پچاس [۵۰] وائکاونٹ اور دو سو اڑتالیس [۲۴۸] بیرن نئے بنائے گئے۔ اس اثناء میں پانچ سو سے زائد شخصوں کو بیرونٹ کا خطاب عطا ہوا۔ زمانۂ موجودہ میں وہ دولتمند اہل شہر جو قصبات میں بڑی بڑی جائدادیں خرید لیتے ہیں اگرچہ امارت کا خطاب نہیں رکھتے مگر قصباتی امراء میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔

اب اگر ہم انگریزی طبقۂ اعیان کے ان خصوصیات پر مجموعتہً نظر کریں تو پھر کوئی وجہ استعجاب کی نہیں رہتی کہ کیوں تمام یورپ کے طبقۂ اعیان میں صرف انگلستان

ہی کے طبقۂ اعیان کا وجود بخیل طور پر باقی رہا اور نظام حکومت میں کیوں اُسے ایک کار آمد اور نمایاں جگہ دی گئی اور اس کے برخلاف براعظم کے ہر ملک میں طبقۂ اعیان یا تو بالکل ہی ناپید ہو گیا ہے، یا اگر باقی ہے تو کشاکشی اور پستی کی حالت میں ہے۔

بارھواں باب

(ج) جرمانی طبقۂ امرا (۱) پرنس

اگر ہم جرمانیا کے طبقۂ امرا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر جگہ ایک تعداد ایسے ممتاز خاندانوں کی ملے گی، جو فوجی شہرت، ہتول یا قوم کے رہنما ہونے کی وجہ سے تمام دوسرے آزاد شخصوں سے بلند تر ہوتے ہیں اور فی الاصل انھیں ایک طرح پر شہزادوں کی سی منزلت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قدیم نسلی طبقۂ امرا جو اکثر صرف چند خاندانوں تک محدود رہا کیا ہے وہی ازمنۂ وسطیٰ کے خاندانی یا فرمانروا امرا کی بنا تھا۔

نائٹ کا فروتر طبقہ ازمنۂ وسطیٰ کی پیداوار تھا۔

دنیاوی مدارج میں سب سے اعلیٰ درجہ پرنس کا تھا، اُس کی حیثیت کو شہنشاہی نظام حکومت سے بہت گہرا تعلق تھا۔ جن خاندانوں کے بزرگ آزادی و اقتدار شاہی کے بلند ترین حد پر پہنچ گئے تھے وہ نہایت آزاد معززین یعنی احرار کامل[۱] میں شمار ہوتے تھے۔ (بارھویں صدی کے آخر سے صرف وہی دنیاوی اُمرا شہنشاہی کے پرنسوں میں سمجھے جاتے تھے جو بادشاہ کی جانب سے کم سے کم کاؤنٹی کی جاگیر رکھتے ہوں، اور کسی دوسرے دنیاوی امیر کے تابع نہ ہوں) مگر ان پرنسی خاندانوں کے افسر ہی صحیح معنوں میں امیر (یا لارڈ) خیال کئے جاتے تھے۔ خاندان کے دوسرے اراکین اس درجے سے محروم تھے وہ اُن پرنسوں اور امیروں کے محض ہم جنس (یا رفیق) تھے۔

دنیاوی اور مذہبی پرنس۔

شہنشاہی میں اس بلند درجے کا حصول صور ہائے ذیل پر منحصر تھا۔ (الف) پرنس کے منصب (یعنی ابتداً، ڈیوک کی فوجی قوت) پر فائز ہونا جس کے ساتھ نشان و علم بھی

---

[۱] جرمانی اصطلاح میں: "ہوخ فرائی" (Hochfrei) "زیندبار فرائی" (Sendbarfrei) "زیمپر فرائی" (Semperfrei)۔

عطا ہوتا تھا۔ دنیاوی پرنسوں کے زمرے میں ڈیوک، مارکوئس، کاونٹ پلیٹا ون شامل تھے انھیں کے پہلو بہ پہلو اور بعض وقت اُن سے بھی مقدم شہنشاہی کے دینی پرنس تھے جن کے ہاتھوں میں صرف عصا ہوتا تھا۔ اول الذکر عہدہ موروثی ہوگیا تھا اور حسب دستور صرف اعلیٰ طبقہ امرا کی اولاد کو عطا ہوتا تھا۔ ثانی الذکر کلیتہً پرنسی خاندانوں تک محدود نہیں تھا۔ اکثر وہ پادری جو کسی نائٹ کی اولاد سے ہوتے تھے بلکہ ذی علم شہری بھی اس عہدے پر منتخب ہو جاتے تھے اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوا کہ کسانوں کی اولاد کلیسائی مسند پر پہنچ گئی۔

کاونٹ

(ب) کاونٹ کا عہدہ وہ بھی ایک موروثی و مملکتی حکومت بن گیا تھا۔ طاقتور قبائلی ڈیوکوں کے زوال اور اُن کی مملکت کے مختلف حکمرانوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد کاونٹ کے یہ خاندان اعزاز میں بڑھ گئے تھے اولاً ان کی حیثیت بادشاہ کی جانب سے شاہی نیابت پر منحصر تھی۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک خاندانی مملکتی امارت تھی۔

بیرن۔

(ج) علاوہ ان کے ایک تعداد بڑے بڑے اراضی دار امرا کی تھی ان امرا نے معافیات اور اختیارات حکمرانی کے عطیے کی وجہ سے کاونٹوں کے مانند اقتدار شاہی و اختیار عدالتی حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ بیرن کہلاتے تھے۔

قدیم قبائلی امرا کے وہ خاندان جنھیں شہنشاہی میں کوئی خاص جگہ حاصل نہیں تھی وہ زیادہ مدت تک شہنشاہی امرا کے اراکین میں شامل نہیں رہ سکے، اور دوسرے طبقات خاصکر نائٹ کے طبقات میں منقسم ہو گئے۔

ان کے سیاسی حقوق۔

شہنشاہی کا یہ طبقہ امرا، اپنے دو سیاسی حقوق کی وجہ سے بالتخصیص ممتاز ہے۔

(۱) مملکتی اقتدار شاہی۔

(۲) شہنشاہی درجات میں نشست۔

پس صحیح معنی میں یہ ایک پورا حکمراں طبقہ تھا، اپنے حدود میں وہ تنہا حکمراں، اور شہنشاہی میں مشترک حکمراں تھا، اقتدار شاہی کا یہ میلان طبیعتوں میں راسخ ہو گیا تھا اور شہنشاہی پر اُس کا بہت تباہ کن اثر پڑا اُسی کی وجہ سے نہایت ممتاز خاندانوں نے شہنشاہی کی عظمت کو پوپ کے دعاوی پر قربان، جرمانی شاہی کو کمزور و شل، اور جرمانی ممالک کو غیروں کے تابع کر دیا، ساری دنیا اور اپنے ملک کے خلاف اُن کے اس جرم کا معاوضہ

نہ تو اُن کے درباروں میں اور محلوں کی شان و شوکت سے اور نہ ان صنعتی کاموں کی عظمت سے ہو سکتا تھا جنھوں نے ان کے زیر سایہ نشو و نما حاصل کی۔

مملکتی امارت نے کچھ دنوں بعد بادشاہی کی سی صورت اختیار کرلی مگر اُس میں نہ تو اصلی طاقت تھی اور نہ آئندہ کے لئے کوئی طمانیت تھی۔

ان کی خود غرضانہ اور منفردانہ طبیعت۔

بڑے بڑے مملکتی پرنسوں میں صرف چند ہی ایسے تھے جن میں کسی حد تک اپنی جداگانہ سیاسی ہستی کے قائم رکھنے کی قابلیت تھی ورنہ زیادہ تر اُن میں ایسے تھے جن کے وسائل اور جن کی قابلیت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ شہنشاہی طبقے کی حیثیت سے اُنھوں نے شاذ و نادر ہی اپنی طاقت جرمانی اغراض کے بڑھانے، عوام کے حقوق کے ترقی دینے اور عام آزادی کی تائید کرنے میں صرف کی ہو گی اُن کی قوت بالعموم قومی خدمات سے بچنے اور خاص اراکین شہنشاہی کی طاقت کے بڑھانے میں صرف ہوتی تھی۔

ان میں خاندانی انفرادیت کا میلان خصوصیت کے ساتھ قوی تھا مساوات نسب کی سخت شرط غیر کفو میں عقد کی ممانعت اور تمام لڑکوں کے لئے یکساں حقوق کی وسعت سے اس میلان کا اظہار ہوتا ہے۔ عقد کی ایک ہی صورت تھی کہ دونوں فریق اعلیٰ خاندان سے ہوں اور اس میں تقریباً کسی طرح کا استثنا نہیں تھا۔ ایک اعلیٰ طبقے کے فرد کا ایک متوسط طبقے کی عورت سے بھی عقد کرنا بہت سے خاندانوں میں کفویت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اولاد کے حسب و نسب کے مساوات کو گھٹا دیتا تھا اور بیٹوں کے پرنسی حقوق پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ البتہ بادشاہ یہ کر سکتا تھا کہ بیوی کا درجہ بلند کرکے اس کے نقص کو رفع کر دے یا کوئی خاندان اپنے تفرد پسندی کی وجہ سے زیادہ بلند اصول اختیار کر لے یا کسی غیر مساوی عقد کی صورت خاص کو منظور کر لے۔

مساوات نسب کے سخت ترین اصول کے موافق ایک جرمانی خاندان بھی بالکل خالص نہ رہ سکا، لیکن بہت سی صورتوں میں غیر مساوی عقد اس علانیہ شرط کے ساتھ ہوتے تھے کہ اولاد اپنے باپ کے منصب کی وارث نہیں ہو گی۔ بیوی کے پست درجہ ہونے کی غیر مشتبہ صورتوں میں بھی یہی نتیجہ ہوا کرتا تھا، خاصکر جبکہ بیوی شہریا دہاتی کے فروتر طبقے یا غیر آزاد طبقے کی ہوتا آنکہ بعد کے انتخابی قواعد کے موافق بادشاہ بھی اُس دھبے کو مٹا نہیں سکتا تھا۔

کثرت خطابات

"دو آئینہ قوانین"[۱] کے زمانے میں پرنس، کاونٹ اور بیرن کا خطاب صرف انھیں لوگوں کو دیا جاتا تھا جو واقعتاً پرنس یا کاونٹ کے فرائض انجام دیتے یا کسی بیرنی پر قابض ہوتے تھے مگر کچھ زمانہ گذرنے پر پرنسوں اور کاونٹوں کے سب بیٹے اپنے باپوں کے خطابات اختیار کرنے اور انھیں اپنی اولاد میں منتقل کرنے لگے۔ یہ خالی خطابات بظاہر خاندانوں کی عزت بڑھانے کی غرض سے ہوتے تھے، مگر اُن کی کثرت کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عوام میں ان کا اعزاز گھٹ گیا اور مملکتی رئیسوں کے مقابل میں وہ کمزور ہو گئے۔ اسی طرح عقد کے اصول مساوات کی سخت پابندی نے اس سرچشمے کو خشک کر دیا جس سے امرا میں تازگی پیدا ہوتی اور اسی کی وجہ سے قوم کو ان سے بے واسطگی ہو گئی۔

زوال

جنگ سی سالہ کے وقت سے خاندانی طبقۂ امرا برابر تنزل کی طرف مائل ہوتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں وہ بالکل ہی شکستہ ہو گیا۔

اس کی تاریخ میں فیصلہ کن امور حسب ذیل تھے :۔

(الف) مذہبی امارت کا دنیاوی حیثیت اختیار کر لینا (۱۷۹۷-۱۸۰۳)

اس کے لئے ان معاہدات امن سے راستہ صاف ہوا جو ۱۷۹۷ء میں بمقام کامپو فورمیو اور (۱۸۰۱ء میں) بمقام لیونویل فرانسیسی جمہوریہ اور جرمانی شہنشاہی کے درمیان طے ہوئے اور ایک فیدی ڈایٹ کے ایک غیر معمولی فیصلے سے ۲۵ فروری ۱۸۰۳ء کو ان کی توثیق و تکمیل ہوئی۔

رائن کے بائیں کنارے پر دنیاوی امرا کو جو نقصان اپنی اراضیات کو فرانس کو دے دینے سے پہنچا تھا اُس کی تلافی کے لئے مذہبی امرا کی جرمانی جائدادیں کام میں لائی گئیں اور اطالیا کے امرا جو وہاں سے نکال دیے گئے تھے انھیں مذہبی جاگیروں سے ان کے لئے جرمانیا میں جاگیریں مہیا کی گئیں۔ تین مذہبی انتخاب کنندوں (الکٹروں) میں سے صرف مائنس کا انتخاب کنندہ پرنس اپنی حالت پر باقی رہا اور بعد کو وہ مذہبی رئیس اعظم کی حیثیت

[۱] تیرھویں صدی کے اوائل میں ایکگے (ساکن ریپگو) نے اُن قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو سکسونیا میں رائج تھے اور اُس کا نام سکسونی آئینہ رکھا۔ کچھ زمانے بعد "سوابی آئینہ" شایع ہوا۔ (انگریزی مترجم۔)

سے ریگنس برگ (Regensburg) کو اور کچھ دنوں بعد وہاں سے اشفین برگ (Aschaffenburg) کو تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی اپنی رائن کے بائیں کنارے والی ارضیات کھو چکا تھا۔ سیکسنی کے گرینڈ ڈیوک کو زالس برگ کی اسقف عظمیٰ اور برشٹیسگاڈین کے صومعے کی جائدادیں عطا کی گئیں۔ بوبیریا کے پلیٹیٹ کو ڈیورتس برگ، بام برگ فرائیزنگ، آؤگس برگ، پسباؤ وغیرہ کی اسقفی جائدادیں مل گئیں۔ پروسیا کو ہلڈیس ہائیم اور پاڈربورن کی جائدادوں پر قبضہ حاصل ہو گیا۔ بیڈن کو کونسٹانتس اسٹراس برگ اسپائیر، بازل وغیرہ کے حصے مل گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ان جائدادوں کا دنیاوی مصرف میں لانا شہنشاہی کے تاریخی حقوق کا توڑنا تھا، لیکن اس رائے عامہ کے تغیر اور آبادی کی ضروریات عامہ نے اس طریق عمل کو حق بجانب کر دیا کیونکہ رائے عامہ اب پادریوں کے اقتدار سیاسی کا تحمل نہیں کر سکتی تھی اور ضروریات عامہ کو دنیاوی حکومت کی حاجت تھی۔

(ب) ۱۲ جولائی ۱۸۰۶ء کے اتحاد رائن کی رو سے بہت سے دنیاوی رؤسا اور امرا کا حالت محکومیت میں آجانا۔

جاگیروں کے دنیاوی حیثیت میں تبدیل کرنے کے قانون کی طرح یہ محکومیت بھی بادی النظر نپولین اور فرانسیسی انقلاب کے خیالات کے سبب سے عمل میں آئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے جرمانیا کے سیاسی ارتقا کا ایک قدم آگے بڑھا دیا، جس میں چھوٹے چھوٹے امرا حارج تھے۔ بہتر محکوم شدہ رؤسا اور امرا اپنے ذاتی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہو کر بڑے حکمرانوں کے تابع ہو گئے۔ تاہم انھیں زیر دست، عدالتی اختیارات اور بہت سے امتیازات اب بھی حاصل رہے۔ ان کی ریاستوں میں سے تیرہ ریاستیں بوبیریا کو چھبیس ڈیورٹیم بیرگ کو نو بیڈن کو سات ہیسے کو سات نساؤ کو اور بارہ بیرگ کی گرینڈ ڈچی کو ملیں۔

کچھ زمانہ بعد باقی ماندہ رؤسا میں سے بھی بعض مثلاً ناکم اور ایرن برگ کے پرنس اور آریم بیرگ کا ڈیوک وغیرہ محکوم بنا لئے گئے یعنی دوسرے جرمانی رئیسوں کے تابع کر دئے گئے۔ بعض ریاستیں رعیت شاہی کے زمانے تک قائم رہیں۔ اور نپولین کے محکوموں کی حیثیت میں آگئیں۔

۱۸۰۶ء

۶ - اگست ۱۸۰۶ء کو جرمانی شہنشاہی کے انتزاع نے شہنشاہی طبقے کی حیثیت سے ان امرا کے حقوق کا خاتمہ کر دیا ۔

(ج) ۸ - جون ۱۸۱۵ء کے جرمانی اتحاد نے ان خاندانوں کے شہنشاہی امتیازات کی یاد کو اس طرح تازہ کر دیا کہ اُنھیں حسب و نسب کے اعتبار سے اُن جرمانی حکمران خاندانوں کے برابر قرار دیا جنھوں نے شاہی اقتدار حاصل کر لیا تھا، اور اُن کے لئے چند اعزازات و امتیازات کا ذمہ لیا جن میں سے ایک یہ تھا کہ انھیں اپنے ملک کے ایوان اعلیٰ میں نشست کا حق دیا گیا۔ جرمانی اتحاد کے اراکین میں سے اولاً اڑتالیس پرنسی اور پچاس کاونٹی خاندان بحیثیت حکمران خاندانوں کے تسلیم کئے گئے تھے۔[۱] اس وقت کے بعد سے اُن میں سے بعض خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے، اور بہت سے خاندانوں کی جائدادیں جاتی رہی ہیں ۔

اکثر سلطنتوں میں آئینی قانون کی جدید رفتار ان امرا کے موروثی حقوق کے لئے مضر تھی ۔ ان قوانین کے مقابلے میں جو قانونی مساوات اور مرکزی انتظام پر زور دیتے تھے وہ اپنے مخصوص عدالتی اختیارات اور کوتوالی کی قوت کو زیادہ مدت تک برقرار نہیں رکھ سکتے تھے ۔ اور ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد تو یہ بالکل ہی ناممکن ہو گیا ۔ امرا خود اپنے جداگانہ اختیارات امارت سے دست بردار ہو گئے ۔

۱۸۱۵ء اور ۱۸۶۶ء

(د) ۱۸۱۵ء کے متفق قانون کے بموجب چونتیس با اختیار جرمانی ریاستیں تسلیم کی گئی تھیں مگر اس کے بعد سے موت، دست برداری اور ضبطی کے ذریعے اُن میں بہت کمی آگئی ۔

۷ - دسمبر ۱۸۴۹ء کو ہوہینت سولرن ہیشنگن اور ہوہینت سولرن زگمارنگن خاندانوں کے پرنسوں نے برضائے خود اپنے شاہی حقوق سے شاہ پروشیا کے حق میں دست برداری کر دی ۔ شمالی جرمانی متفقیت کے قیام اور جنگ ۱۸۶۶ء کی وجہ سے ہنوور کے شاہی خاندان ہسّے کے انتخابی خاندان اور نساؤ کے ڈیوکی خاندانوں کو اپنے حقوق شاہی کو پروشیا کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ جرمانی شہنشاہی میں اقتدار شاہی رکھنے والے مملکتی روسا کی موجودہ تعداد بائیس ہے ۔

---

[۱] انگریزی ترجمہ میں اڑتالیس پرنس، اڑتیس کاونٹ اور ایک بیرن درج ہے ۔

جدید طبقہ اعیان

لیکن اگرچہ قدیم مفہوم میں جرمانیا کے اندر شہنشاہی طبقۂ امرا کا خاتمہ ہوگیا ہے پھر بھی ممتاز خاندانوں کا ایک اعلیٰ طبقۂ اعیان اب بھی موجود ہے۔ اس میں کچھ تو پرانے شہنشاہی خاندان شامل ہیں اور کچھ ایسے نئے خاندان ہیں جو پرنس بسمارک کاونٹ مولٹکے وغیرہ کے مانند عالی مرتبت اشخاص کے خدمات عامہ کی وجہ سے عام طبقۂ اشراف سے سربلند ہو گئے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس اعلیٰ طبقۂ اعیان کا انداز حریت پسندی کے بجائے قدامت پسندی کی طرف مائل ہے مگر ان کے خیالات میں خاص وسیع النظری موجود ہے اور اس لئے شخصیت کی تنگ خیالی و ذلت پسندی کے بجائے اُنھوں نے جرمانی شہنشاہی کے قومی ارتقا و عظمت کے متعلق کامل ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

تیرھواں باب

(ج) جرمانی طبقۂ امرا (۲) نائٹ

قدیم خاندانی امرا اور عام آزاد اشخاص کے مابین وہ لوگ تھے جو "شوابی ایپنے" اصطلاح میں "مِنِسٹل فرائی" یعنی متوسط آزاد" طبقے کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں جرمانیا کے جنوب میں فرانکی شاہی کے زمانے تک اُن کا نشان ملتا ہے مگر چودھویں صدی کے قبل تک وہ امرا میں شامل نہیں سمجھے جاتے تھے اور نہ عام اشخاص سے بالاتر اُنھوں نے فرودتر طبقۂ امرا کی حیثیت پیدا کی تھی۔ اِس طبقے کے خاص عناصر حسب ذیل تھے:۔

(الف) آزاد اشخاص جو اسیسر کے عہدے کی قابلیت رکھتے تھے ابتداءً یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے یعنی جن کے پاس تین سو ایکڑ یا اُس سے زیادہ زمین ہوتی تھی اور آزاد اشخاص میں زیادہ دولتمند اور زیادہ اہم ہونے کے سبب سے وہ اسیسر منتخب ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ عہدہ بھی مثل اور عہدوں کے موروثی ہو گیا اور عام آزاد کسانوں کے بہ نسبت یہ لوگ زیادہ مدت تک اپنی جائدادوں کو محصولات سے آزاد اور بیلفت (گماشتۂ شاہی) کے تحت اختیار میں آنے کے بجائے کاونٹ کے تحت اختیار میں رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کو وہ نائٹ یا اراضی دار امرا کے طبقے میں جذب ہو گئے۔

فرودتر طبقۂ امرا

(ب) امرا کے تابعین اور طبقۂ نائٹ کے امرا کے بعد وہ نائٹ جو اُس منصب کا نذرانہ ادا کر کے نائٹ بن جاتے تھے۔

(ج) بعد کو بہت سے نائٹ بغیر نذرانہ ادا کئے بھی اُس میں داخل ہو گئے ان میں سے زیادہ تر امرا کے تابعین کی اولاد میں سے تھے اور اُنھوں نے نائٹ کے مانند تعلیم پائی تھی لیکن بمرور ایام وہ سپاہی بھی اس میں شامل ہو گئے جنھیں شہنشاہ یا اُس کے

قائم مقاموں نے نائٹ کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

(۵) امرا کے کثیر التعداد حشم و خدم جو اکثر غلامانہ یا نیم آزادانہ طبقے سے نکلے تھے اور تیرھویں صدی تک میں یہ لوگ نسبتاً نائٹ سے بالکل علیحدہ تھے۔ یہ گروہ درباری خدمتوں اور عہدوں سے اور نیز اپنی بڑی بڑی جائدادوں اور شاندار طریق ماندو بود کی وجہ سے اس درجے تک پہنچا تھا، اولاً انھیں جاگیرانہ حقوق حاصل نہیں تھے مگر بتدریج وہ نائٹ کی سطح پر پہنچ گئے اور اسی فرقے میں جذب ہو گئے۔

(۶) شہنشاہی کے بیشتر مگر صوبوں کے کمتر شہروں کے وہ شریف خاندان جو اصلاً اسیسروں کے طبقے سے یا نائٹ کے اخلاف اور شہری حکومت میں اپنے کاموں کی وجہ سے ممتاز تھے وہ بھی اس زمرے میں داخل ہو گئے۔

جس طرح بلند تر طبقے میں ہوا اُسی طرح اُس فروتر طبقے میں بھی جائداد، سپاہیانہ زندگی، اور درباری خدمات سب امتیازات اصولِ وراثت کے سامنے دب گئے اور اس طرح امرا کی ایک کثیر تعداد ایسی پیدا ہو گئی جس کے پاس امارت کا کوئی حق ایک پرانے خاندانی شجرے کے سوا اور کچھ نہ تھا اسی کے ساتھ ہی عام آزاد اشخاص اور کسانوں کے طبقے کے ساتھ ان کی روش میں خاص اسی وقت اور زیادہ تفرد پسندی آ گئی جبکہ اُن کا فرق و امتیاز حقیقی معنی میں ناپید ہوتا جا رہا تھا، اس طرح شاندار خطابات کا شوق اچھی طرح پورا ہو گیا اس فرقے سے بیرنوں بلکہ کاونٹوں اور پرنسوں تک کی ایک کثیر جماعت پیدا ہوئی جنھوں نے اپنے خطابات باقاعدہ عطیے سے یا غصب سے حاصل کر لئے تھے مگر فی الواقع اُن میں ان خطابات کی اہلیت مطلق نہ تھی۔

جرمانیا میں ملکی اور قومی عہدوں کے ذریعے سے طبقۂ امرا کو کبھی وہ عروج نہیں حاصل ہوا جو اُسے فرانس میں حاصل ہو گیا تھا۔ موروثی اصول کا صرف ایک استثناء علمائے قانون کے علمی طبقۂ امرا کا تھا لیکن سندات کے ذریعے سے امرا کے قیام کی فرانسیسی شکل کو قبول کرنے میں جرمانیا نے بہت آمادگی دکھائی۔

شہنشاہی کے نائٹوں نے جابجا اپنی جاگیروں میں ایک معقول حد تک آزادی حاصل کر لی تھی، مگر مجموعۃً امرا کے اس فروتر طبقے کو کسی قسم کا ملکی اقتدار شاہی یا شہنشاہی طبقات میں انھیں کوئی جگہ حاصل نہیں تھی البتہ جاگیردارانہ قانون میں انھیں دخل حاصل تھا

اور اماکن مذہبی اور اوقاف میں اُن کے بعض خاص امتیازات تھے اُن میں سے بعضوں کو پلیٹ (گماشتۂ شاہی) اور مملکتی امرا کے عدالتی حقوق حاصل تھے جو اُنھیں اُن کی مخصوص جائدادوں کے ساتھ وراثتاً ملتے تھے ۔

آخری امر یہ ہے کہ وہ اپنے ملک (کی مجلس) کے طبقات کے ساتھ نشست کا حق رکھتے تھے اور دربار کے طبقۂ امرا میں داخل تھے ۔

سولھویں صدی میں اس کا زوال۔

اس فرقے کی طاقت تیرھویں صدی کے بعد اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی اور سولھویں صدی کے وسط تک اس کی یہ حالت برقرار رہی مگر اُس کے بعد سے اقتصادی، فوجی، معاشرتی، اور سرکاری تعلقات کے ناقابل مقاومت انقلابات کے سبب سے وہ زوال پذیر ہونے لگی اور جنگ سی سالہ نے اُس کی تباہی کو مکمل کردینے میں مدد دی ۔

جرمانیا میں آج امرا کا فروتر طبقہ ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے شہنشاہی تنظیم کے اعلیٰ طبقۂ امرا کی بہ نسبت بہت زیادہ ابتر ہو گیا ہے اُس کو متزلزل کرنے والے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے جاگیردارانہ بندش کمزور ہو گئی اور سلطنتوں کا جاگیردارانہ رنگ اور جاگیری نظام حکومت جاتا رہا فوجوں کی حالتوں میں انقلاب ہو گیا سرکاری عہدے موروثی نہیں رہے، شہری خاندان اعلیٰ مدارج پر ترقی کر گئے قدیم جرمانی شہنشاہی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ نیابتی تنظیمات میں ترقی ہو گئی نیز زیادہ قریبی زمانے کے کثیر التعداد تغیرات نے نیچے اور اوپر دونوں طرف سے عمل کرکے بہت سے امتیازات کو یکے بعد دیگرے اور کبھی مجموعۃً منسوخ کر دیا جس طرح پہلے فرانس میں ہو چکا تھا اب جرمانیا میں بھی طبقۂ سوم (یعنی عوام کا طبقہ) امیروں کے امتیازی حقوق کا روادار نہیں رہا بلکہ سرے سے اسی بات سے منکر ہو گیا کہ طبقۂ امرا کے قیام کی ضرورت بھی ہے ۔ امیروں کی ساری اولاد اور نسل کے لئے امتیازات کو غیر محدود وسعت دے دینے سے امارت کے دعاوی اور اُن کے واقعی حالات کے مابین جن کی بنا پر وہ قائم تھے نمایاں تفاوت واقع ہو گیا اور شہریوں کے اعلیٰ طبقے سے اُن کا مقابلہ کرنے کے سبب سے ان میں ابتری اور بھی بڑھ گئی اور مخالفین اور زیادتی ہو گئی مشترکیت رائن کے حکمرانوں کی جوع الارض کا مقابلہ جب شہنشاہی کے نیچے درجے کے حکمران نہ کر سکے تو شہنشاہی کے نائٹ کس شمار میں تھے ۔ اُن کی جائدادیں اُن حکمرانوں کی مملکتوں میں شامل کر لی گئیں سنہ ۱۸۱۵ء کے عہد نامۂ مشترکیت کا میلان اس جانب تھا کہ اُن کے خاندانوں کی

ایک ممتاز حیثیت قائم ہے نیز حکومت کا استقلال، صوبوں کے طبقات میں نشست، اعلی عدالتی اختیارات اور سرپرستی کے حقوق، جنگلوں پر اقتدار اور دربار وں میں ایک ممتاز حیثیت یہ سب باتیں انھیں حاصل رہیں، مگر یہ ساری پیوندکاری بیکار تھی قانون عامہ کے جدید تخیل کے لئے موروثی اختیار عدالت ایسا ہی ناقابل برداشت تھا جیسے ادائی محاصل سے بری رہنا۔

عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جرمانیا کے امرا کا یہ فرو تر طبقہ اب قانوناً کسی قسم کے خاص حقوق نہیں رکھتا، سیاسی شہنشاہی تنظیم کی حیثیت سے اس کی ہستی فنا ہو گئی ہے۔ اپنے نام اور نشانات کے سوا، قدیمی عظمت کی جو یادگار ان کے پاس رہ گئی ہے اور جو کبھی کبھی عمل میں آجاتی ہے، اس میں اب محض قدامت پسندی کی شان باقی رہ گئی ہے مگر اب بھی ملکتی امرا اور ان سے کمتر درجے میں دربار کے وہ امرا جو صاحب جائداد نہیں ہوتے دونوں سوسائٹی میں ایک خاص منزلت رکھتے ہیں اور بالواسطہ حکومت کے طرز عمل اور سرکاری تقررات پر معقول اثر ڈالتے ہیں۔ اعلی فوجی عہدے درباری مناصب اور سفارت کی خدمات پر لازماً نہیں بلکہ بیشتر اسی طبقے کے لوگ مقرر ہوتے ہیں۔

محض خطابی امرا ازدواج اور مشاغل کی وجہ سے معاشری و سیاسی دونوں اعتبار سے اعلی شہری طبقے میں جذب ہو گئے ہیں۔ جرمانیا کے طبقۂ نائٹ کے حب قوم اور وطن پرستی کی تاریخ انگریزی طبقۂ اعیان کی تاریخ کی مثل نہیں ہے۔ صاحب ریاست امرا کے ایک بڑے حصے نے زمانۂ جدید کے خیالات اور اصلاحات کا ایک مدت تک سخت مقابلہ کیا۔ اس میں بعض امرا جن کو ازمنۂ وسطیٰ کی کیفیات کے ساتھ ایک افسانہ وار الفت تھی وہ قوم کی آزادی کی بہ نسبت مطلق العنان شاہی کی خدمت کے لئے زیادہ آمادہ تھے یہی وجہ ہے کہ جرمانی طبقۂ امرا اس قدر ہر دلعزیز نہیں ہے جس قدر انگریزی طبقۂ امرا ہر دلعزیز ہے۔ فرانس کے اُن امرا کی طرح جو خاندان بار بن کے مؤید ہیں جرمانیا کے امرا کو بھی عوام اکثر شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم انھوں نے بہت سے روشن خیال افراد اور ممتاز محبان وطن پیدا کئے ہیں، فوج کے بہترین رہبر انھیں میں سے نکلے ہیں اور قومی ترقی کے خطرۂ عظیم کے وقت اصلاح کے لئے جد وجہد کرنیوالوں کے بیشتر اسی طبقۂ امرا میں سے ہوئے ہیں ایک تنظیم کی حیثیت سے جرمانی طبقے کی اصلاح

کے متعلق حال میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے مگر اس کے بہترین موقع یعنی ۱۸۵۲ء و ۱۸۶۰ء کے درمیانی زمانے میں اس امر پر خیال نہیں کیا گیا۔ اصلاح کی کوشش سے صرف اتنا ظاہر ہوا کہ اس طبقے کے اراکین پر محبان اصلاح کا کس قدر کم اثر ہے اور ان کا گروہ ہر طرح کے کامل اور موثر تغیر کے کس قدر مخالف ہے۔

جرمانی شہنشاہی کے قیام سے اب امکان پیدا ہوتا ہے کہ ایک نئی ترتیب پائی ہوئی قومی جماعت اعیان پیدا ہو جائے اور اس جماعت سے قدیمی طبقۂ امرا کے بے جان و بے مصرف اعضا کو بلا رو و رعایت خارج کر کے صرف اُن کے مفید اجزا باقی رکھے جائیں اور ان میں دوسرے ایسے اجزا شامل کئے جائیں جن میں جدید خیالات موجود ہوں۔ ایک قوی آزاد اور تعلیم یافتہ طبقۂ اعیان کا ہونا جرمانیوں کی عظیم الشان قوم کی ضروریات زندگی میں داخل ہے اور جس حالت میں کہ عمومی گروہوں کا پلہ اس قدر بھاری ہوتا جا رہا ہے ایسا ضروری ہے کہ امرا کے اوصاف پر اُن کی تعداد سے زیادہ لحاظ کیا جائے اس طرح کا صاف شدہ طبقۂ اعیان ایک درمیانی درجہ پیدا کرے گا اور وہ از سر تا پا موروثی اصول میں غرق اور اس اصول کے غیر محدود غلبے کا تابع نہ رہے گا شخصی امارت کی عزت افزائی کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی نسلی امارت کی عزت افزائی کی ضرورت ہے۔ ایک امیرانہ نسل جو اپنی سوسائٹی کی بنیادوں سے جدا ہو جائے وہ ایک وقت میں شرافت کو بھی کھو بیٹھے گی۔

تعلیق ۱۔ ریل (Riehl) نے اپنی کتاب "شہریوں کی معاشرت" (Burgerliche Gesellschaft) مطبوعہ ۱۸۵۱ء میں جرمانی طبقۂ اعیان کی معاشرتی اہمیت کی خوب ہی تصویر کھینچی ہے۔ طبقۂ اعیان کو معاشرتی حیثیت اس وقت تک حاصل ہے اور اس کی بجائے خود ایک قدر و قیمت ہے مگر سیاسی عضو بندی کے بغیر نہ وہ مستقل ہو سکتی ہے اور نہ پوری طرح موثر ہو سکتی ہے معاشرتی گروہوں کی حیثیت سے یہ طبقات اولاً عضوی اور پھر حقیقۃً سیاسی طبقات کی محض بنیاد ہیں۔

تعلیق ۲۔ جرمانی صفات سلطنت (جلد صفحہ ۲۰ وغیرہ از صفحہ ۸۵ وغیرہ) میں میں نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنا ساکت اور عامل طبقۂ امرا کے فرق پر قائم کی ہے اول الذکر نسب سے حاصل ہوتا ہے اور وہ محض بے جان ہے۔ ثانی الذکر شخصی تفوق سے رونما ہوتا ہے

اور اس میں نام کے بجائے واقعیت سے کام پڑتا ہے اس کے بعد مجھے افسوس کے ساتھ یہ پتا چلا کہ اب سے تین پشت قبل جسٹس موسٹر (Justus Moser) اپنی کتاب خیالستان وطن پرستی (Patriotische Phantasien) (ج ۴ ص ۴۸ ۲) میں اس خیال کو بیان کر چکا ہے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ دیکھو میری "تاریخ علم السیاست" (Geschichte de Staatswissenschaft) صفحہ ۴۲۳

چودھواں باب

(ج) شہریوں کا طبقہ

یورپ کا شہری طبقہ اگرچہ امرا کے فروتر طبقے کے بعد ظہور میں آیا مگر ازمنۂ وسطیٰ ہی میں وہ اپنے ذاتی سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایک قومی طبقہ بن گیا تھا اس کی اصل بنیاد ان آزاد اشخاص کا قدیمی طبقہ موروثی ہے جو اولاً مختلف جرمانی قبائل و اقوام میں اصلی قبیلے کی حیثیت رکھتے تھے مگر آزاد نشو و نما انھیں شہروں ہی کے حدود کے اندر اور شہروں ہی کے قانون و نظام حکومت کے تحت میں حاصل ہوئی۔

دیہات میں زرعی غلامی کا میلان

ازمنۂ وسطیٰ کا دور عمومی آزادی کے لیے مطلقاً ناموافق تھا۔ مذہبی خاندانی اور اعیانی طبقات کو تسلط حاصل تھا، اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ آزاد مالکان اراضی جاگیری امیروں اور شاہی ناظموں کے پنجے میں گرفتار تھے۔

کارل اعظم کے پرزور قوانین نے بدترین مظالم کو تو روکا مگر خرابی کی ترقی کو بند نہ کرسکا فرانکی شاہی میں زراعت پیشہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو اپنی نسلی آزادی کی بنا پر کھرے جرمانی قبیلوں میں شامل تھا، شاہی یا کلیسائی جاگیروں پر یا ملکتی امرا کی زمینوں پر اس طرح آباد ہوگیا کہ وہ اپنی خاص مملوکہ زمین کی کاشت نہیں کرتا تھا یا مذہبی جذبات یا کسی خاص ضرورت کے باعث اپنی جائداد گرجاؤں اور خانقاہوں کو ہدیتہً دیدیتا اور پھر مستاجرانہ انھیں واپس لے لیتا تھا اس طرح یہ لوگ جاگیرداروں کے متوسلوں میں داخل ہوگئے پس ان کی حیثیت زرعی غلاموں کی سی ہوگئی اور وہ اپنے بہت سے آزادانہ سیاسی حقوق سے محروم ہوگئے۔ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد چھوٹی چھوٹی جاگیریں جو آزاد مزارعین کی ملکیت رہ گئی تھیں وہ بھی شاہی ناظموں کے عدالتی اقتدار اور حکمران طبقۂ اعیان کے عاید کیے ہوئے بار سے نہ بچ سکیں۔ فوجی نظام میں جب قدیم اصول کے بجائے جس کے بموجب نائٹ اور جاگیردار فوجی خدمات انجام دیتے تھے اجیر سپاہیوں کا طریقہ رائج ہوا تو آزاد کسان اپنی جنگی قابلیت اور سپاہیانہ

اعزاز سے محروم ہوگئے اُن پر ہر صورت اور ہر حیلے سے محصولات عائد کئے جاتے تھے اور اکثر ان محصولات کی کوئی وجہ موجبہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ عدالتوں میں اور اُس سے بھی زیادہ ملک کی سیاسی جماعتوں میں اُن کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو قدیم جرمانی آئین حکومت نے اُن کے لئے محفوظ کردی تھی۔ آزاد مالکان اراضی بھی محصلین کے حلقۂ اثر کے اندر داخل ہوجانے کے سبب سے بتدریج غلام کاشتکاروں کے درجے پر اُتر آئے اور دونوں پر کسان کے عام لفظ کا اطلاق یکساں طور پر ہونے لگا۔

اس طرح جو طبقہ پہلے موروثی تھا وہ اب ایک پیشہ ور طبقہ بن گیا اور کسانوں کے سیاسی حقوق بہت بڑی حد تک گھٹا دیے گئے۔ صرف معدودے چند آزاد کسان جن میں زیادہ تر بڑے بڑے مالکان اراضی تھے ترقی کرکے نائٹ کے نئے طبقے میں شامل ہوگئے تھے صرف مستثنیات کے طور پر، موافق حالات میں آزاد اشخاص کی بعض منفرد جماعتوں کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ وہ اپنی مالکانہ آزادی اور اپنے سیاسی امتیازات کو ازمنۂ وسطیٰ کے آنے والے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کی ایک بہت ہی نمایاں مثال اشوالتس کی دیہاتی جماعت ہے جس سے سوئیٹزرلینڈ کی آزادی میں ایک حرکت پیدا ہوگئی اور اسی لئے وہ اشوالتسی آزادی کے نام سے موسوم ہوئی۔

شہروں کے اندر آزادی

اس طرح دیہاتوں میں تو قدیمی آزادی دبادی گئی مگر اس اثنا میں شہر ایک نئی بلدی آزادی کا مسکن بن گئے تھے۔ آزادی و شہریت کے موجودہ خیال کے نشو و نما پر شہروں کی تاریخ نے ایک قطعی اثر ڈالا ہے۔ قومی حیثیت حاصل کرنے کے قبل یہ دونوں خیال بلدی ہی حیثیت رکھتے تھے شہر کے اندر شہریت کا خیال پیدا کرنے کے لئے صدیاں صرف ہوگئیں اور اس کے بعد کئی صدیاں درکار تھیں کہ یہ خیال سلطنت کی وسیع شہریت کی شکل اختیار کرے۔

اپنے تنوع اور تفرق کی وجہ سے (جو رومانی اور اُس سے بھی زیادہ ٹیوٹنی کے اجزاء امتزاج کا نتیجہ تھا) اولاً صاحب امتیاز طبقات شہروں کی زندگی پر اثر انداز ہوئے جہاں ایک تنگ جا کے اندر زیادہ آبادی واقع ہوئی تھی وہاں پر یہ تنوع زیادہ نمایاں تھا۔

شہروں کی آبادی

اکثر شہر پناہ کی دیواروں کے حلقے کے اندر ذیل کی مختلف الکیفیت آبادیاں پائی جاتی تھیں۔

(۱) مذہبی پرنس اپنی درباری شان اور اپنے خاص شاہی حقوق کے ساتھ اور انھیں کے ساتھ اساقفہ اور خانقاہوں کے روسا۔

(۲) ہر حالت اور ہر درجے کے ادنی طبقے والے اہل کلیسا۔

(۳) اعلی طبقے کے دنیاوی امرا مثلاً شاہی کاونٹ یا اعلی بیرن۔ اطالیا کے سردار جو زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے تھے اور اگر ان کے خاص محل شہروں میں نہیں ہوتے تھے تو محض عارضی طور پر وہاں قیام کرتے تھے۔

(۴) نائٹوں کے خاندان جن کی جاگیریں اکثر دیہاتوں میں ہوتی تھیں۔

(۵) مذہبی اور دنیاوی امرا کے حشم و خدم۔

(۶) آزاد متوسطین۔

(۲ الف) اطالیا اور فرانس کے رومی شہروں میں زیادہ تر یہ لوگ ان رومی سپاہیوں کی اولاد سے تھے جو دس شخصوں پر سردار ہوتے تھے اور شہر کے اندر جائداد رکھتے تھے۔

یا (ب) جرمانی آزاد اشخاص جو شہر کے اندر خود اپنی زمین پر آباد اور اپنی جائداد اور سیاسی وقعت کے اعتبار سے ذی امتیاز تھے۔

(۷) معمولی آزاد اشخاص جو ہنوز شہر کے اندر زمین پر قابض تھے۔

(۸) وہ اشخاص جو شخصی حیثیت سے تو آزاد تھے مگر شہر کے اندر امرا کی زمینوں پر رہتے تھے اور اس لئے جاگیرداری قوانین مثلاً قواعد خانقاہ وغیرہ کے تابع تھے۔

(۹) مختلف امرا کے ادنی خدام کا جم غفیر۔ ان کی حالتیں نہایت مختلف تھیں (الف) بعض بہ حیثیت اہل حرفہ کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔
(ب) بعض خدمتگاروں ملازموں وغیرہ کی حیثیت سے کسی خاندان کے تابع ہوتے تھے۔

شہری طبقے کی ترقی۔

نظام از منۂ وسطی کے ان عناصر کے ایک شہر کے اندر مجتمع ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی ایک دوسرے سے علحدگی رفع ہو گئی اور ایک نیا اجتماع پیدا ہو گیا معاشرتی اغراض اور حوادث زمانہ نیز فریقانہ جد و جہد کے اتحاد نے ان میں زیادہ قریبی ربط پیدا کر دیا اور ایسے نئے اختلافات برپا کر دئے جو پیدائشی

اصول سے متعین نہیں ہوتے تھے۔
شہریت کے آئینی نظام کے ساتھ ساتھ نئی انجمنوں اور مجلسوں کا ظہور ہوا جن میں مختلف طبقات ایک نئے اتحاد کے دائرے میں داخل ہو گئے مختلف مقامات و اوقات کے حالات سے طریق عمل میں اختلاف پیدا ہوا مگر اصلاً وہ طریق عمل ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ہی رہا۔ اس ارتقا میں زیادہ اہم مدارج حسب ذیل تھے۔

لمبارڈی وغیرہ میں کونسلوں (مجالس) کا عروج۔

(۱) کسی شہر میں مدنیت کے حقوق رکھنے والے شہریوں کی آبادی کا بڑا اور اہم حصہ نائٹوں اور کارکنوں اور آزاد متوسطین کے وہ ممتاز خاندان تھے جنھوں نے مجالس (کونسلوں) کے مشیروں (یا کارکنوں) کی حیثیت سے یہ کوشش کی کہ خود اُن کی آزادانہ حالت برقرار رہے شہر کے قدیم امرا کے حقوق امارت کو انھوں نے محدود کر دیا۔ پھر عام آزاد اشخاص کے شمول سے یہ جتھا اور بھی وسیع ہو گیا، اور قدیم اعیانی خاندانوں اور آزاد شہریوں کے نوخیز اور سبقت جو طبقات میں نئی مخالفتیں پیدا ہو گئیں چنانچہ گیارھویں صدی کے وسط کے قریب مِلان میں قانوندانوں، طبیبوں، ساہوکاروں، تاجروں کا ایک سیاسی گروہ "موٹا" (Motta) کے نام سے پیدا ہو گیا۔ اس میں نائٹ خاندانوں کے وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جن کی معاشرت نائٹوں کے مانند نہیں رہی تھی، لہذا ان لوگوں نے عوام کے نام سے امرا کی مخالفت کی اور بارھویں صدی میں اُن کے پہلو بہ پہلو مجلس عظمیٰ[1] میں جگہ حاصل کر لی اور اس طرح شہر کی مجلس عام کی بنا پڑ گئی۔
قنصلوں کی صورت میں شہری حکام کا ظہور میں آنا شہر کے اعلیٰ طبقات کے باہم مخلوط ہونے کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد مجالس عظمیٰ کا صورت پذیر ہونا اور کمیونوں کے نام کا نکلنا ایک لازمی امر تھا سب سے آخر میں گلڈ (مجلس امداد باہمی) رونما ہوئی اور اس طرح بتدریج قدیمی و محدود والاثر سوسائٹیاں (جماعتیں) شہریت کے زیادہ وسیع حلقے میں داخل کر لی گئیں۔

---

[1] دیکھو سوینی کی کتاب "رومی قانون کی تاریخ از منۂ وسطیٰ میں" جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ وغیرہ؛ لیئو کی "تاریخ اینالیا"، جلد ۱ صفحہ ۳۹۹؛ ہے گل کی کتاب "شہروں کا آئین اینالیا میں" جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ وغیرہ۔

یہ ترقی سب سے پہلے لوم بارڈی میں نظر آئی جہاں معاشرت اور آزادی کے متحد کرنے کا ٹیوٹنی میلان روما کی قدیم یادوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہاں سے بارھویں اور تیرھویں صدی میں یہ تحریک جنوبی فرانس کے شہروں میں پہنچی۔ یہاں اسے قدیمی آزاد و بلدی شہریت سے جس کی نمائندگی منتخب نائبین کرتے تھے (اور جو لوم بارڈی کے بہ نسبت فرانس میں زیادہ پست حالت میں آگئی تھی) خاص تائید حاصل ہوگئی۔

فرانس کے کمیون۔

(۲) اس سے زیادہ قطعی جمہوری خصوصیت اور مجتمعہ شکل ان کمیونوں کے اندر شہریوں کے ان مشترکیات میں پائی جاتی ہے جو اُس زمانے میں شمالی فرانس میں شہروں کے امرا کے ساتھ خونریز جنگ میں مشغول تھیں۔

گلڈ یا مجلس اہل دستکاری۔

یہاں حقوق شہریت کے نئے عناصر بالتخصیص گلڈ کی صورت میں نظر آتے ہیں کیونکہ حقوق شہریت کا راستہ اسی گلڈ میں داخل ہونے سے مل سکتا تھا جس کے ساتھ قواعد کی اطاعت کا حلف بھی اُٹھانا پڑتا تھا۔ اس طرح مدنی آزادی اور مدنی حقوق محض پیدائش یا ملکیت اراضی سے علٰحدہ ہوگئے تھے اور اس کے بجائے ایک مجمع اتحاد پر زور دیا جاتا تھا۔ جاگیردارانہ اصول اور قدیمی ٹیوٹنی امتیازنے ایک جدید اور شخصی اصول کے لئے جگہ خالی کردی تھی۔

مزید برآں مجالس شہری کا نظام شہر کی آبادی کے طبقۂ اسفل میں آزادی و حقوق شہریت کو وسعت دینے کے لئے زیادہ مفید تھا۔ اہل حرفہ کا گروہ عظیم جو حالت غلامی سے آزاد ہوگیا تھا اس سوسائٹی میں داخل ہوگیا اور یہ اصول قائم ہوگیا کہ جو سرف (زرعی غلام) شہر میں ایک برس اور ایک دن رہ جائے اور اُس کا مالک اس کا دعویدار نہ ہو نہ اُس کی جستجو کی جائے وہ آزاد ہوجائے گا۔ تمام یورپ میں شہری قانون اس اہم اصول کا شاہد ہے کہ شہر کی ہوا انسان کو آزاد کر دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے اندر عمومیت کے مبالغے اور حد سے تجاوز کرجانے کے باعث سے اکثر رجعت قہقری پیدا ہوگئی۔ جن بادشاہوں نے اپنے امرا کی ملکیت سے شہروں کے آزاد کرنے میں مدد دی تھی انھوں نے اب شہروں کی حکومت اپنے عمال کے توسط سے خود اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع نکالا اور اُسے اور سخت کردیا۔ اس طرح چودھویں صدی کے اوائل میں لوم بارڈی کے بہت سے شہروں کی حکومت خود اختیاری جاتی رہی اور

وہ خاص خاص حکمرانوں کے قبضے میں آ گئے۔ تیرھویں صدی میں عوام کے نئے شہری گروہ نے (جس میں زیادہ تر شہری آبادی کے ادنیٰ افراد شامل تھے) اپنے جمہوری سرداروں کے تحت میں حصول تفوق کے لئے شہری امرا سے جنگ شروع کر دی تھی اور اکثر انھیں بے بس کر کے شہر سے خارج کر دیا تھا۔

فرانس میں اُن شہروں کے پہلو بہ پہلو جن میں قصبلی اور رکمیونی نظام حکومت رائج تھا بہت سے شہر ایسے تھے جو امرا کے تحت میں رہ گئے تھے اور ان پر انھیں امرا کے عامل حکمراں تھے اور اکثر بہت ہی خودرائی سے حکومت کرتے تھے تاہم ان شہروں میں بھی غلامی کے بوجھ برطرف یا بہت ہلکے کر دیئے گئے تھے اور اہل شہر کی ایک آزاد جماعت ہونے کا خیال ترقی کر گیا تھا اور ہر شخص شہر میں سکونت اختیار کرنے اور شاید شہری حقوق کے شاہی عطیے کے ذریعے سے بھی اس جماعت میں داخل ہو سکتا تھا۔

جرمانیا میں حق شہریت

(۳) جرمانیا میں بھی لفظ بیوگر (شہری) کے مختلف معنی اس خیال کے مختلف مدارج ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ اطالیا اور فرانس میں قبل ازیں ہو چکا تھا، جرمانیا میں بھی تیرھویں صدی تک یہ دستور تھا کہ نائٹ اور شہری میں فرق کیا جاتا تھا۔ آخرالذکر سے وہ آزاد اشخاص مراد ہوتے تھے جو شہری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کی مجلس کے لئے منتخب ہو سکتے تھے مگر وہ نائٹوں کی سی زندگی نہیں بسر کرتے تھے اس جماعت شہری کی بنا شہر کے وہ آزاد مکاندار تھے جو شہر کے اسیسر اور رکن مجلس ہونے میں بالعموم اُن خاندانوں کے شریک تھے جن کا نسب نائٹوں سے ملتا تھا یہ دو جماعتیں یعنے نائٹ اور شہری مجموعۃً کامل الحقوق شہری یا مثل "اہل خاندان" کے سمجھے جاتے تھے اور اہل حرفہ اور شہر کے دوسرے باشندوں سے مغائر تھے۔

آزاد مکاندار

تجار

تیرھویں صدی حفاظت تجارت کے لئے بڑے بڑے "شہری تنفقات" کے قیام کا زمانہ تھا معلوم ہوتا ہے کہ اسی صدی کے وسط کے بعد بہت سے جرمانی شہروں میں تجار ملکیت اراضی سے قطع نظر اپنی ذاتی آزادی کی بنا پر شہری تسلیم کرلئے گئے تھے اور شہر کی مجلس میں انھیں حق نیابت حاصل ہو گیا تھا۔

اس طرح ایک حد تک شہریت کا خیال اراضی کے تعلق سے علٰحدہ ہو گیا تھا اور

پیشے اور ذاتی اتحاد روابط کو زیادہ نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ جب چودھویں صدی کے اوائل میں اہل حرفہ کی جماعتوں کا بہ حیثیت مجموعی ایک جدید رکن کے طور پر شہری گروہ میں شامل کرنا عام ہو گیا، تو اس میلان کو نئی قوت حاصل ہو گئی۔ اس طرح لفظ "شہری" (Burger) کے معنی زیادہ وسیع ہو گئے۔ اس زمانے کے بعد سے یہ لفظ یا قاعدہ ان تمام افراد پر عائد ہونے لگا جو شہر اور اس کی جماعتوں کی زندگی میں شریک تھے۔ شہریت کے معاملے میں غلامی کا جہاں تک تعلق تھا وہ شہریت سے منسوخ کر دی گئی۔ نسب کے امتیازات میں بہت بڑی ترمیم و تخفیف ہو گئی جاگیردارانہ قانون کی جگہ شہری قانون نے لے لی، یہ قانون عام اور شخصی تھا اور اس طرح تمام ساکنین شہر کا اپنے شہر کے ساتھ بلا واسطہ تعلق پیدا ہو گیا۔

اہلِ حرفہ

ذاتی آزادی کی شہریت

ذاتی آزادی کی یہ شہریت جسے کبھی کم کبھی زیادہ حکومت خود اختیاری کی طاقت حاصل ہو جاتی تھی وہ شہری اغراض کے اندر ہی محدود تھی مختلف نظامہائے حکومت کے جزئیات شہر کی تاریخ اور اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف تھے۔

صوبجاتی شہنشاہی شہر

بعض شہر رئیسوں کے مملکتی اقتدار شاہی کے تحت میں تھے اور اس وجہ سے صوبجاتی شہر کہلاتے تھے۔ بعض نے اپنی مجالس کے لئے شاہی حقوق حاصل کر لئے تھے اور اس طرح وہ شہر خود ہی اپنی حاصل کی ہوئی امارت کے اور قرب و جوار کے دیہاتوں کے گویا مملکتی رئیس بن گئے۔ چونکہ شہنشاہ اور شہنشاہی سے اُن کا بلا واسطہ تعلق تھا اس لئے وہ شہنشاہی شہر کہلاتے تھے۔

شہروں کا زوال

سولھویں صدی تک جرمانی شہروں میں بدستور تمول، تہذیب اور خوشحالی کا دور دورہ تھا، اس عہد کی عمارتوں کی وہی شہرت اب تک قائم ہے جو ماکیاویلی کے زمانے میں تھی مگر جنگ سی سالہ نے شہروں کی طاقت خوشحالی کو تباہ کر دیا اور وہ مبتذل اور پست حالت میں گر گئے جس سے نکلنے کے لئے انھیں ایک صدی تک مصیبتیں اٹھانا اور جد و جہد کرنا پڑی۔ صوبجاتی شہروں کی حیثیت صوبجاتی طبقات میں فنا ہو گئی اور شہنشاہی شہروں میں بھی کچھ یوں ہی سا آزادی کا پرتو باقی رہ گیا۔ شہروں نے مضطربانہ طور پر خود کو دیہات سے منقطع کر لیا، وہ مفلس و مفلوک ہو گئے اور تنگ دل و ذلیل علیحدگی کے خیال کے شکار ہو کر رہ گئے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے شہری طبقے کی خصوصیات

(۴) ازمنۂ وسطیٰ کے شہری طبقے کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(الف) پادریوں اور امیروں کے مانند یہ کوئی امتیازی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک قومی طبقہ ہے۔ اپنے شہری تعلق اپنی تعلیم و تربیت اپنی آزادی اور اپنے قانون کے سبب سے یہ طبقہ کسانوں سے ممتاز ہے۔

(ب) باوجود خاندانوں کی تاریخی مخالفتوں کے اور نسل و پیشہ کے اختلافات کے شہری جماعت اپنے تئیں ایک متحد و یکرنگ طبقہ سمجھتی ہے۔ یہ طبقہ شہری آزادی کا اور قانون کی نظر میں سب کی مساوات کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ وہ شہر کے ایک ہی شہری قانون کے تحت میں زندگی بسر کرتا ہے اور نظام حکومت کے لیے آزادانہ نظام کو مرتب رکھتا ہے اہل شہر اپنے شہر کے فرزند اور اس کی عام زندگی کے شریک کار ہیں۔ شہر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

طبقۂ سوم

(ج) لیکن اس سے زیادہ یہ کہ ازمنۂ وسطیٰ میں شہری طبقے نے ایک ایسی سیاسی وقعت اور اہمیت حاصل کر لی تھی جو کسی ایک منفرد شہر کے حدود سے متجاوز تھی اور جس نے متعدد شہروں کے باشندوں کو ایک مشخصہ طبقے میں گھیر لیا تھا اس نئی ترقی کا اظہار ازمنۂ وسطیٰ کے صوبجاتی اور شہنشاہی طبقات کی نظم و ترتیب سے ہوتا ہے تیرھویں صدی کے وسط سے انگریزی شہروں کے باشندوں نے اولاً نائٹوں سے الگ اور بعد کو ان کے ساتھ شریک ہو کر قومی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل کر لیا تھا فرانس میں اہل شہر ہی کے قائم مقاموں سے طبقۂ سوم بنتا تھا۔ اولاً وہ وقتاً فوقتاً علیحدہ طلب کیا جاتا تھا مگر چودھویں صدی کے آغاز سے طبقات عامہ میں وہ بھی شامل کر دیا گیا۔

جرمانیا میں شہنشاہی ڈائٹ کے اندر شہروں کی نجیں (نشستیں) خاندان ہاپسبرگ کے شہنشاہ روڈولف تخت نشین ہونے کے بعد سے ایک حد تک شہری طبقے کی قائم مقام ہو گئی تھیں اور صوبے کی ڈائٹوں (کونسلوں) میں امیروں اور پادریوں کے پہلو بہ پہلو طبقۂ سوم کی حیثیت سے شہروں کو نشست و رائے دہی کا حق حاصل ہو گیا تھا۔

سلطنت کی شہریت

(۵) انجام کار شہروں کے اس طبقے میں شہریت کے نئے خیالات قائم ہو گئے وہ تمام قوم کے وسیع حدود میں پھیل گئے اور شہر کی شہریت سے سلطنت کی شہریت کا جدید خیال پیدا ہوا۔

پندرھواں باب

(د) کسانوں کا طبقہ

طبقۂ سرف (غلامان زرعی) کی ترقی

اگر از منۂ وسطیٰ میں آزاد اشخاص کا قدیمی طبقہ نقصان میں رہا تو غلامانہ طبقہ فائدے میں رہا آزاد اشخاص کی پستی اور غلامان زرعی کی بلندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقے باہم غلط ملط ہونے لگے۔ زرعی غلاموں کے طبقے کا ایک چھوٹا حصہ شاہی خدمات کی انجام دہی کی وجہ سے آزاد شخصوں سے بلند ہوگیا، اور فروتر طبقہ امرا کا جزو بن گیا، درباری خدمت کی وجہ سے انھیں رؤسا سے زیادہ قریبی تعلق پیدا ہوگیا، اور درباری تربیت و آداب کے حاصل کرنیکا موقع ملا۔ اس قابلیت کے ساتھ ان کی زرخیز جائدادوں نے ملکر انھیں ایک وقت میں طبقۂ نائٹ کے امرا کا ہمپایہ بنا دیا۔

آزادی

ان کا ایک دوسرا اور بڑا حصہ شہروں میں آباد ہوگیا جہاں تجارت کے ذریعے سے متمول ہوکر انھوں نے شخصی اور شہری آزادی حاصل کرلی اٹالیا کے شہروں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں نے سب سے پہلے اپنے سرف غلاموں کو آزاد کیا۔ شہر بولون جو ہمیشہ سے آزادی کا مقدمۃ الجیش رہا ہے اس نے اپنے ناظم اعلیٰ (Podesta) آکرسیس دے سورچینا (Accursius de Sorrecina) کی تجویز کے موافق یہ فیاضی دکھائی کہ اپنے حدود کے کل سرف غلاموں کی آزادی خریدلی اور آئندہ کے لئے اس طریق غلامی کے خاتمے کا اعلان کردیا۔

فرانس اور جرمنیا میں انگلڈ (تعلیمی) اہل حرفہ کی (انجمنیں)

شہری زندگی کی ترقی سے دستکاروں کے طبقے نے بھی عروج حاصل کرلیا، ابتک یہ لوگ تمام یورپ اور بالخصوص اس کے ٹیوٹنی حصص میں ادنیٰ درجے پر تھے اور اس طبقے میں زیادہ تر زرعی غلام داخل تھے۔ آزاد شہریت نے اول اول اٹالیا میں بروبار پیدا کئے اور یہیں سے اہل حرفہ کی تعلیمی انجمنیں اسکولے[1] کے نام سے فرانس پہنچیں جہاں ٹیوٹنی اثر کے تحت ہیں

[1] واحد: اُسکولا (Schola)۔

اُنھوں نے منسٹیریا (Meniteria) اور گلڈ کی مشخصہ شکل اختیار کی اور بالآخر جیرمانیا میں بھی رائج ہوگئیں ان کا اثر یہ ہوا کہ اُن کے اراکین کے حقوق قوی ہو گئے اور ان کے مالکوں کا اعزاز بڑھ گیا۔ دستکار طبقے کی منتظم تعلیم اور اُن کا تدریجی ارتقا۔ فنی مہارت، اور دولت میں اُن کی ترقی، اپنی مجلس یا جماعت کے علم کے نیچے ہتھیار لگانے کا نیا استحقاق۔ شہر کے مفاد اور اس کی مرفہ الحالی سے ان کا مستقل تعلق، ان تمام امور نے دستکاروں میں اپنی اہمیت اور اپنے حقوق کا احساس پیدا کر دیا، ان میں بہت سے صرف غلام تھے مگر مکاتبت یا غداری سے اُنھوں نے آزادی حاصل کر لی تھی اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اپنے شہریت کے حقوق سے وہ محروم رکھے جا سکتے۔

دیہات میں زرعی غلامی

دیہات میں آزادی کا راستہ زیادہ دشوار گزار تھا، بہت سی جگھوں میں یہ اصول تھا کہ "ہوا غلام بنا دیتی ہے"، زرعی غلاموں کا بالکل آزاد ہو جانا مستثنیات سے تھا، مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے عام طور پر ایک طرح کی شخصی آزادی حاصل کر لی، یہ آزادی بھی اگرچہ بہت گرانبار اور سیاسی حیثیت سے بے اثر تھی مگر حفاظت قانونی سے مصئون اور برابر وسعت کی طرف مائل تھی۔ اُنھوں نے آزاد کسانوں سے ملکر مساویانہ حقوق کا ایک پیشہ ور طبقہ بنا لیا۔

آزادی

زرعی غلامی اور آزادی کے تفصیلی تعلقات، اور ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے حالات بہت ہی مختلف تھے۔ غلامی کی منسوخی کے مانند، زرعی غلاموں کا ترقی کرنا بھی بہت کچھ کلیسا کے اثر کا زیر بار احسان ہے۔ جہاں گرجے یا خانقاہی جماعتیں کسی علاقے کی مالک تھیں وہاں اُنھوں نے اپنے زرعی غلاموں کو معین حقوق اور مستثنیات دیکر بالعموم ایک راستہ کھول دیا، اور اس طرح اماکن مذہبی کے توابع آزاد کسانوں کے درجے پر پہنچنے میں سب سے مقدم تھے۔ اس کے بعد بادشاہوں نے اس مثال کی تقلید کی۔ شارلیمن کے سلسلے کے بادشاہوں نے فسکیلینون کو آزادی عطا کی، اور لوئس دہم نے ۱۳۱۵ء میں شاہی علاقوں کے زرعی غلاموں کو آزادی عطا کر کے یہ اعلان کیا کہ اُس نے شاہ فرانس کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔

کسانوں نے حقوق ذاتی حاصل کر لئے۔

جس میلان زمانہ نے بڑے بڑے بیرنوں کے حقوق شاہانہ کو موروثی جاگیر میں تبدیل کر کے انھیں اراضی سے متعلق کر دیا تھا۔ اور جس نے ماتحت زمینداروں کو اپنے آقاؤں کے

مقابلے میں محفوظ و مستقل حقوق عطا کئے تھے، اُسی میلان زمانہ نے علاقوں کے غلامان زرعی کے لئے ان کی مقبوضہ اراضی کے حقوق تسلیم کرا دیئے اور علاقہ جاتی قانون کے ماتحت ان میں توریث کا طریقہ جاری کر دیا اور خاص قسم کا موروثی آئین و انصاف کا رواج قائم کیا جس میں کسان اپنے سرگروہوں (Meyer) کی سرکردگی میں شریک ہوتے تھے۔

فرانس

فرانسیسی سرف (غلامان زرعی) اور ویلین (وابستہ اراضی کسان) کی حالت جیسا کہ خود ان کے نام سے ظاہر ہے جرمانی ہوف لوئتے (Hofleute) اور گرنڈ ہولڈن کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی مگر موخر الذکر کو ترقی بعد میں حاصل ہوئی اور فرانس کے صاحب حقوق کسانوں کے اعلیٰ طبقے یعنی (Coutumiers) اور (Roturiers) اور (Hospites) Ostes آزاد اشخاص کی حیثیت کے زیادہ قریب پہنچ گئے۔

انگلستان

برخلاف اس کے انگلستان میں کالی وباد (۱۳۴۸ء) کے بعد زرعی غلاموں کی آبادی کو شخصی آزادی حاصل ہوگئی مگر زمین اُن کے پاس نہیں تھی اور اس طرح آزاد کسانوں کے بجائے آزاد مزدوروں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا۔

جرمانیا کے کسانوں کی جنگ

کسانوں کی یہ تبدیلی آزادی بالعموم شخصی قانون اجتماعی و عدالتی نظام تک محدود تھی۔ آزاد کسان جو بیلٹ (مخلصین) موروثی اقتدار کے تابع ہو گئے تھے اور جن کی اراضیاں ان کے آقا کے نفع کے لئے بہت سے مستقل محصولوں سے زیر بار تھیں انھیں کے ساتھ ملکر ان سب لوگوں سے نام نہاد طبقہ کسان بنتا تھا چند ملکوں کے سوا کسی جگہ بھی کسانوں کا گروہ پورے معنی میں سیاسی طبقہ نہیں بنا تھا، یہ مستثنیٰ ممالک اسکینڈینویا، ٹرون، سویزرلینڈ وغیرہ تھے۔ اسکینڈینویا میں خوش قسمتی سے ان کی قدیم عام آزادی اور قدیم نظام حکومت قائم رہ گیا تھا، ٹرون میں والیان ملک انھیں صوبجاتی مجلس شوریٰ میں طلب کرتے تھے، سویزرلینڈ میں اُنھوں نے آزاد حرائی جمہوریتیں قائم کرلی تھیں۔

اپنے آقاؤں کے بھاری جوئے کو اُتار پھینکنے کے لئے سولھویں صدی والی کسانوں کی عظیم جنگ جرمانی کاشتکاروں کی سخت مگر بیکار کوشش تھی۔ جب ہم اس زمانے میں اُن بارہ دفعات کو پڑھتے ہیں جن میں کاشتکاروں نے اپنے مطالبات کا خلاصہ درج کیا تھا اور اُس نہایت شدید غصے کا خیال کرتے ہیں جو اس مطالبے سے اُس وقت کے

تعلیم یافتہ گروہوں اور حکمراں اعیان میں پیدا ہو گیا تھا، تو ہمیں یہ دیکھکر گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری اس صدی میں بلا کسی طرح کی کشمکش کے کاشتکاروں کو انسانی اور شہری حقوق کی حیثیت سے اس سے زیادہ حاصل ہو گیا ہے جس کے طلب کرنے کی اُس زمانے میں اُنھوں نے جرأت بھی نہیں کی تھی۔

مگر آہستہ ہی آہستہ لوگ اس خیال کے عادی ہوئے کہ کسان محض ایک ایسا محکوم گروہ نہیں ہے جو صرف فوج کی بھرتی ہی کے لائق سمجھا جائے اور دوسروں کی مرضی سے اُس پر محصول عائد کر دیا جائے۔ انگریزی آئین حکومت نے اُن عوام (Yeomen) کو جو اپنی اراضی سے معمولی آمدنی رکھتے ہیں، دارالعوام کے لئے صوبے کے انتخاب میں حصہ دیکر ایکبار پھر اپنی عام آزادی کی قدر شناسی کو ظاہر کر دیا۔

سیاسی حقوق

مگر بہت ہی قریبی زمانے تک یہ نہ ہوسکا کہ پوری شخصی آزادی اور سیاسی حقوق بالعموم تمام طبقات کے لئے وسیع کر دیے جاتے۔ اٹھارھویں صدی کے فلسفے نے انسان کے فطری حقوق کے خیال کو تسلیم کر کے اس ترقی عظیم میں ذہنی اُمنگ پیدا کر دی جرمانیا میں پروشیا کے شاہ فریڈرک اول نے ۱۷۱۸ء میں شاہی جائدادوں میں زرعی غلامی کے طریقے کو برطرف کر کے اس معاملہ میں تقدم حاصل کیا، فریڈرک ثانی کے فرامین نے دوسرے زرعی غلاموں کی خلاصی کی بھی تائید کی اور اُسے اور وسیع کیا اور شہنشاہ جوزف ثانی نے ۱۷۸۲ء میں جرمانیا اور آسٹریا کے لئے اور ۱۷۸۳ء میں کارل فریڈرس نے بادن (Baden) کے لئے اس مثال کی تقلید کی، لیکن اس دوران میں بیشتر جرمانی سلطنتیں اس کے اجرا سے رکی رہیں یہانتک کہ ۴ر اگست ۱۷۸۹ء کے پرجوش اعلان اور فرانسیسی قومی مجلس کے اعلان «حقوق انسان» نے تمام مہذب یورپ کو چونکا دیا۔ زرعی غلامان توابع کی آزادی نئے زمانے کے فرض عام اور غیر قابل ردمطالبے کے طور پر تسلیم کی گئی اور مغربی یورپ میں اُنیسویں صدی کے نصف اول میں اور مشرقی یورپ میں اُس کے بعد سے اس پر عملی کارروائی ہوئی اسی زمانے میں بلکہ اُس کے بعد بھی سیاسی شہری حقوق شہروں کے باشندوں کے مانند کسانوں کے لئے بھی وسیع کئے گئے۔

سولھواں باب

(۵) غلامی اور اُس کی منسوخی

غلام جس قوم یا خاندان کا تابع ہوتا ہے اُس میں وہ ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے زمانۂ قدیم میں غلامی کو جیسی کچھ وسعت حاصل تھی وہ ظاہر ہے مگر مجھے کسی ایسی قوم کا علم نہیں ہے جس نے غلامی کو ایک قومی طبقہ کی حیثیت دی ہو اور یہی ایک بات اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہے کہ یہ انسانی فطرت کے لوازم میں سے نہیں ہے۔

غلامی کی نسبت ارسطو کی رائے۔

ارسطو نے پالیٹکس (سیاسیات کتاب اول باب ۴-۶) میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بعض انسان فطرتاً آقا اور بعض فطرتاً غلام ہیں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ مگر اس کے استدلال جہاں تک صحیح ہیں اُن سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایک خادم طبقے کی ضرورت ہے یعنی ایک ایسے مملوک طبقے کی جو حقوق سے معرا ہو اس میں شک نہیں کہ کوئی اعلےٰ قابلیت کا شخص اگر اپنا کام پورا کرنا چاہتا ہے تو بالفاظ ارسطو اسے "جاندار اوزار" کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فطرتاً جسمانی محنت کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہیں اور اُن کے فرائض کی انجام دہی کے لئے حکیمانہ رہبری کی ضرورت ہے۔ اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرح کی باہمی احتیاج ہے جو آقا و خادم، کارخانہ دار و کاریگر، کاشتکار و مزدور، اہل صنعت و دستکار کو باہم متحد کرتی ہے، مگر یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ مستخدم کا تعلق خادم سے وہ ہو جو پالو جانوروں کا اُن کے مالکوں سے ہوتا ہے، نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے والے اپنی ذاتی آزادی اور انسانی شخصیت سے دست بردار ہو جائیں اور کسی خاص آقا کے لئے اشیا کے محض اور اوزار محض ہو جائیں یعنی اس کے غلام بن جائیں، انسان فطرتاً شخص ہے وہ شے نہیں ہو سکتا

یعنی غلام نہیں بن سکتا، رومی مقننین نے اپنے نظریۂ قانون میں غلاموں کو شے مملوکہ قرار دینے کا خیال اس سختی سے قائم کیا ہے کہ زمانۂ قدیم تک میں وہ انگشت نما ہو گیا تھا، انھوں نے غلاموں کو حقوق سے معرّا ہستیاں یا محض اشیا قرار دیا ہے، مگر انھوں نے بھی اس امر کو محسوس کیا تھا کہ غلامی فطرت کے خلاف ہے اور محض قوموں کے عام رواج سے پیدا ہوگئی ہے اس لئے انھوں نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ غلام کو آزاد کرنا اس کے فطری حق کا اُسے واپس دینا ہے۔ مگر باوجود اس علم کے رومی قوانین ہزار برس سے زائد تک سخت تسلسل کے ساتھ غلاموں پر اشیائے مملوکہ کا اصول عائد کرتے رہے۔ غلاموں پر مالکوں کے حد سے بڑھے ہوئے یا بےوجہ تشدد کے خلاف جو شہنشاہی احکام صادر ہوتے تھے وہ بدترین ستمگاریوں کے روکنے میں اُتنا ہی اثر رکھتے تھے جتنا اس زمانے میں جانوروں پر ظلم کرنے کے خلاف قوانین کا اثر ہے مگر اس سے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، اور غلام مثل سابق کے نہ صرف کسی قسم کی ملکیت نہیں رکھتے تھے بلکہ مناکحت اور رشتہ داری کے حق سے بھی محروم تھے۔

جرمانی قانون

جرمانی قانون نے بھی اسے پوری صفائی کے ساتھ تسلیم کیا تھا جیسا کہ "آئینہ سکسونی" کے مصنف کے پرزور الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہر طرح کی غلامی جبر، اسیری اور ناواجب سختی سے پیدا ہوئی ہے اور اب جس شے کو حق کہتے ہیں وہ محض رواج ہے! یہ رواج اگرچہ قدیمی ہے مگر نامنصفانہ ہے۔

ٹیوٹنی قوموں نے ہمیشہ اپنے زرعی غلاموں کے کچھ نہ کچھ حقوق تسلیم کئے ہیں، ان کے ملکیتی اور خاندانی حقوق نامکمل تھے اور ان کی ناکافی حفاظت ہوتی تھی بلکہ درحقیقت وہ ان کے آقا کی شفقت پر منحصر تھی، مگر ان کی آزادی مابعد کا تخم رومی قانون سے زیادہ قوی تھا۔ جرمانی غلاموں کی شخصیت کہیں ضائع نہیں ہوئی تھی اور اس لئے ان کی حالت کو ترقی دینا ممکن تھا۔

رقیت زرعی غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ عیسائیت اور ٹیوٹنی جذبہ

ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں مغربی یورپ میں رقیت (یعنی مطلق غلامی) زرعی غلامی کی زیادہ نرم صورت میں بدل کر ایک بڑی حد تک ناپید ہوگئی۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور اُنیسویں صدی کے اوائل میں زرعی غلامی کی حتمی تنسیخ سے اُس کے آخری آثار ناپید ہوئے۔

اس کوشش میں ابتدائی اور تدریجی کارروائی اور حال کے زمانے کی زیادہ کامل آزادی، ایک حد تک عیسائیت کی ممنونِ احسان سمجھی جا سکتی ہے، عیسائیت نے

اگرچہ غلامی کے ظاہری قوانین پر سخت اعتراض نہیں کیا مگر اُس کی باطنی بنیاد کو ہلا دیا۔ انسان پر حق ملکیت پیدا کرنا اس اعتقاد کے منافی تھا کہ تمام انسان خدا کے عیال اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں اِس تغیر کا باعث عیسائیت سے زیادہ قوم ٹیوٹن کا پاس قانون و آزادی اور انسانیت کی ترقی کن روح ہے۔

روس

روس میں غلامی کی تاریخ مخصوص نوعیت کی ہے، ابتدائی زمانے میں ایک طرح کی شخصی بندش موجود تھی مگر سولھویں صدی میں کسان زیادہ تر آزاد تھے وسیع جائدادوں کے لئے مزدوروں کی تعداد کثیر کی حاجت تھی اور اراضی دار امرا کے حق میں یہی مفید تھا کہ کسانوں کو مختلف مراعات کے ذریعے سے اپنی جائدادوں سے وابستہ کریں اور اس طرح ان کی مزدورانہ نقل و حرکت اور مسلسل تغیر مکان کی عادت کو (جو قدیمی خانہ بدوشی کے شوق کی وجہ سے اب بھی جاری تھی) بند کردیں مگر کسان اُس وقت تک زرعی غلام نہیں بنے تھے جبتک کہ سلطنت کی مالی اور فوجی ضرورتوں نے ان کو زمین سے اور زیادہ وابستہ کرکے انھیں ان کے مالکوں کے رحم پر نہ چھوڑ دیا۔ سترھویں صدی میں کسانوں کی آزادی کو کسی جگہ ایسا شدید نقصان نہیں پہنچا جیسا روس میں پہنچا یا زرعی غلام اور کسان ایک ہی غلامانہ حالت میں ڈھکیل دیے گئے جس سے اُن کی ذات اور جائداد بالکل ان کے مالک کی مرضی پر منحصر ہوگئی مگر روس میں بھی نئے زمانے نے بہتری کی طرف قدم بڑھائے اور ہمارے وقت میں پہنچکر غلاموں کو آزادی بھی حاصل ہوگئی۔ غلاموں کے آزاد کرنے کا کام جسے باوجود کثیر التعداد امرا کی مخالفت کے زار الگزنڈر ثانی نے ۱۹ر فروری سنہ ۱۸۶۱ء کے قانون سے پورا کردیا، اُسی سے روس میں شخصی آزادی کے نئے دور کی ابتدا ہوئی۔

امریکی غلامی

اس طرح بتدریج یورپ ازمنۂ وسطیٰ کی غلامی کی لعنت سے پاک ہوگیا، مگر نئی دنیا میں اُسے نہ صرف ایک نئی زمین ملگئی بلکہ بعض اعتبارات سے وہاں اس کا شر بھی زیادہ بڑھ گیا سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۸۶۵ء تک کی امریکی خانہ جنگی جذبۂ انسانیت کی اُسی ہتک کی سزائے اعمال تھی۔

حبشیوں کا غلام بنانا اس اعتبار سے کم قابل اعتراض تھا، کہ یونان اور روما کے غلاموں کے مانند یہ غلام اُسی گوری نسل سے نہیں تھے، جس نسل سے خود اُن کے مالک تھے، بلکہ وہ سیاہ فام اور فطرتاً پست نسل سے تھے مگر دوسری جانب اس فرق سے سفید رنگ مالکوں کی نفرت

اور نخوت کو اور ترقی ہوگئی تھی کیونکہ اُن حبشیوں کے متعلق وہ مشترک انسانی فطرت کے قبول کرنے پر نہ مائل تھے نہ مجبور کئے جاتے تھے اور اس لئے اُن کی جفا کاریاں زمانۂ قدامت کے بہ نسبت بہت بڑھی ہوئی اور زیادہ سخت تھیں۔

مونٹسکیو

ان گورے مالکوں کی اپنے حبشی غلاموں کی طرف متکبرانہ نفرت کو مونٹسکیو نے اپنی کتاب (Montesquicu Exprit des Lois XV) کے صفحہ پر جس تلخ و تند طنز سے ظاہر کیا ہے اس کا قوی اثر دل پر پڑتا ہے: "یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے جو حکیم مطلق ہے ایک روح اور پھر ایک نیک روح کو ایک کالے جسم میں ڈال دیا ہے۔"

پس امریکی غلامی یوربی غلامی سے بہت ہی زیادہ سخت تھی مالک اگر غلاموں کی کچھ غور و پرداخت کرتے تھے تو وہ ایسی غور و پرداخت تھی جیسے ایک کسان اپنے مویشی کی کرتا ہے۔ اُن کی انسانی عزت کا انکار، ان کے ازدواج اور خانہ، ان کا عدم لحاظ مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا فقدان، ان کی بے روک ٹوک تجارت (جو اکثر دل ہلا دینے والے مظالم کے ساتھ ہوتی تھی) ان تمام امور نے ملکر انھیں اخلاقاً و قانوناً خانگی جانوروں کی حالت میں ڈھکیل دیا تھا، یہ تمام آسمانی و دنیاوی نظم کے خلاف ایک سخت گناہ تھا۔

جیفرسن

امریکہ کی بد قسمتی تھی کہ جیفرسن نے ۴ جولائی سنہ ۱۷۷۶ء کے اعلان آزادی میں (جس نے آزادی کو انسان کا ناقابل انفکاک حق قرار دیا ہے) اپنی اس تجویز کو اتمام کو نہ پہنچا سکا کہ شاہی حکومت کی وجہ سے حبشی غلامی کا جو رواج ہوا اور اُس کی جو ہمت افزائی ہوئی اس پر اعتراض کیا جائے۔ غلامی کی تدریجی برطرفی کے ابتدائی خیال کی ایسی کمزور تائید ہوئی کہ اپنی ملکیت کی حفاظت و ترقی کے بابت غلام رکھنے والوں کی کوشش پر غالب نہ آسکی۔

آزاد ریاستیں غلام رکھنے والی ریاستوں کے مقابلے میں مستقل حکومت کے اندر اپنے توازن کو مشکل سے قائم رکھ سکتی تھیں، ایک صدی کے اندر اندر لاکھوں کی اکائی سے گزر کر دہائی میں پہنچ گئی تھیں یہ روئی اور گنے کی زراعت کی عاجلانہ ترقی کا اثر اس معاملہ میں تباہ کن پڑا تھا۔

امریکی خانہ جنگی

جنوب کی غلام رکھنے والی مشترکیت پر سلطنتہائے متحدہ کی فتح نے شمالی امریکہ سے حبشی غلامی کی یک قلم منسوخی کو حتمی و قطعی بنا دیا، اب سلطنتہائے متحدہ اپنے حدود و اختیار

کے اندر غلامی کو جائز نہیں رکھتیں (ترمیم نظام سلطنت مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء بالواسطہ یہ قانون تمام براعظم (امریکہ) کے مسئلۂ غلامی کیلیے فیصلہ کن ہے، کیونکہ جنوبی امریکہ زیادہ زمانے تک اس اصول کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ فی الحقیقت برازیل میں ۲۸ ستمبر ۱۸۷۱ء کے قانون کی رو سے غلامی منسوخ ہو چکی ہے۔

حبشیوں کے حقوق۔

اس وقت تک رنگدار قوموں کی محض ذاتی آزادی اور ان کے شخصی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں، حبشیوں کی حیثیت اور ان کے سیاسی حقوق کے مشکل سوال کا حل کرنا ابھی باقی ہے، اس وقت شمالی امریکہ حبشیوں کو پورے سیاسی حقوق دینے پر مائل ہے مگر یہ مشکوک ہے کہ یہ حالت کبتک قائم رہے گی۔ سیاسی حقوق کے لئے مقدم شرط سیاسی قابلیت کا ہونا ہے۔

آیا بناءً عمومیت جسے ابتک صرف سیاسی حیثیت سے ترقی یافتہ قوموں ہی میں کامیابی ہوئی ہے، حبشی گروہوں کے لئے حکومت کی ایک فطرتی صورت ہو سکتی ہے، آیا ایک عمومی نظام حکومت کو جس میں بڑے ہی تحمل اور مردانہ مستعدی کی ضرورت ہے یہ حبشی اُسے قابلیت کے ساتھ قائم رکھنے اور جوانمردی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ انسانی فطرت اور سیاسی تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں وہ شاید ہی اس کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت کر سکیں۔

سلطنت اور غلامی۔

بہرحال انسانیت کی بنا پر سلطنت کے اصول سے ذیل کے عمومی کلیات تسلیم کئے جا سکتے ہیں :۔

(۱) ہر سلطنت کا حق و فرض ہے کہ اگر شخصی غلامی کے کچھ بھی اثرات اُس کی مملکت میں باقی رہ گئے ہوں تو اُنھیں صاف کر دے۔ ایسا کرنا بے انصافی کا رفع کرنا ہے۔

(۲) سلطنت غلامی کے کسی نئے رواج کی روادار نہیں ہو سکتی خواہ کوئی انسان خود ہی غلام بننے کا خواہاں کیوں نہو۔

(۳) کوئی غیر ملکی اگر سلطنت کے حدود کے اندر اپنے غلام پر ملکیت قائم رکھنا چاہے تو سلطنت کو اُس کی قانونی حفاظت سے انکار کرنے کا حق ہے[۱]۔

---

[۱] انگلستان کے لئے بلیک اسٹون کی شرح دیکھنا چاہیے (کتاب اول باب ۱۴) ۔ ۲۸ اگست ۱۸۳۸ء

(۴) غلام جو آنا د زمین پر قدم رکھے وہ حقیقتاً آزاد ہے۔ اور اس آزادی کے لئے وہ عدالت سے محافظت کا استحقاق رکھتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے انگریزی قانون نے انگریزی نوآبادیوں میں آزادی کے قاعدے معین کئے ہیں اور یہ اعلان کردیا ہے کہ کوئی غلام جو اپنے مالک کی مرضی سے برطانیہ عظمیٰ یا آئرلینڈ میں آئے وہ آزاد ہے۔

سترھواں باب

جدید زمانے کے درجات کا اصول

ذی امتیاز طبقات کی معدومی۔

ازمنۂ وسطیٰ کے ذی امتیاز طبقات ہر جگہ شکست ہو گئے ہیں، پادریوں کو کسی وقت میں مذہبی عظمت کی وجہ سے جو برتری حاصل تھی وہ زائل ہو گئی ہے اب ان کی حیثیت بالعموم جداگانہ سیاسی طبقے کی نہیں رہی ہے مقتدایانِ دین طبقۂ اعیان میں شامل ہو گئے ہیں اور باقی پادری عوام میں بالائی طبقے کا جزو بن گئے ہیں۔ زمانۂ حال کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقۂ امرا کا شیرازہ بالکل بکھر گیا ہے اور وہ ایک ذی امتیاز طبقے کے طور پر اپنی آزادانہ حیثیت قائم کرنے کے لئے بالکل ہی ناموزوں ہو گیا ہے۔ شہری طبقے کے ایک منضبط فرقے کی قدیمی حیثیت زائل ہو گئی ہے تعلیم یافتہ طبقوں کو جدید بیاتی سلطنتوں میں سابق کے بہ نسبت بہت ہی مختلف حیثیت حاصل ہے کسانوں تک کا طبقہ جو روایتی خیالات و رواج کے مضبوط و خاموش تعلق سے وابستہ تھا زمانے کی تحریک میں کھنچ آیا ہے اور اس کی ترقی سے موثر ہو رہا ہے۔ حرفت نے بھی ملک میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے اور کسانوں کی سادگی آمیز زندگی میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات کی اصلاح کرنے اور سلطنت کو ان کی بنیاد پر قائم کرنے کی تمام کوششیں اس وقت تک کلیتہً ناکام ہو چکی ہیں قوم کا ادراک و شعور ان پر اعتبار نہیں کرتا بلکہ قومیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم سے آگے بڑھ گئی ہیں اور تجدید شدہ شکل میں بھی ان کی دوبارہ بحالی کی روادار نہیں ہیں۔

تاہم یہ عیاں ہے کہ جماعتہائے قوم میں جو ناقابل انکار تفاوت موجود ہیں وہ حقیقی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں اور یہ کہ محض تمام درجات کا ایک میں خلط ملط کر دینا ناقابل اطمینان ہے۔ اگر کسی نظام حکومت میں اس تفاوت کو ہم کوئی جگہ دینا چاہتے ہیں

توہمکو طبقات کے بجائے درجات قائم کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی جن مراتب کو ہم طبقات کہتے ہیں وہ اکثر فی الواقع طبقات نہیں بلکہ درجات ہیں[۵]۔

درجات و طبقات

درجوں اور طبقوں میں فرق یہ ہے کہ درجات سلطنت سے شروع ہوتے اور سلطنت ہی کے ساتھ ختم ہوجاتے ہیں لیکن طبقات کی بنیاد سلطنت کے حدود سے خارج ہوتی ہے۔ درجات اتحاد قوم کو پہلے ہی سے تسلیم کرلیتے ہیں، طبقات اُس کی پروا نہیں کرتے۔ درجات ایک سیاسی نظم ہیں جو اتحاد قومی اور قانون عامہ پر مبنی ہوتے ہیں طبقات وہ گروہ ہیں جو انفرادی اور شخصی حقوق کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں اور اُن کا مقصد کلیتہً یا اصلاً سیاسی نہیں ہے۔ پادری کلیسا کو سلطنت سے مقدم رکھتے ہیں امرا اولاً اپنا اور اپنے خاص تمدنی اغراض کا خیال کرتے ہیں، شہری اپنے کاروبار کو اور کشتکار اپنی زراعت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں پس طبقات میں ہمیشہ مشترک تعلیم اور مشترک طریق زندگی کا تعلق نظر آتا ہے۔ ان گروہوں کی تقسیم فرق لوازم پر ہے اور اس میں سلطنت کا خیال محض بالواسطہ کیا جاتا ہے۔

طبقات کی نشوونما فطری ہے، درجات مہذب تمدن کے کرشمے اور فراست سیاسیہ کی قوت منضبط کے قومی نتیجے ہیں۔ اس لئے ہم ان متمدن اقوام میں جن میں سیاسی احساس ترقی پاجاتا ہے صرف درجات ہی درجات دیکھتے ہیں۔ یونانیوں بالخصوص اتھنز میں سولن کے نظام سلطنت کے بعد اور رومامیں سروئیس کے نظام سلطنت کے بعد یہی صورت نظر آتی ہے اسی قانون سے ابتداءً درجے (class) کا لفظ نکلا۔ یہی حال موجودہ یورپی سلطنتوں کا ہے۔

اس کی کوئی وجہ نہیں کہ درجات کے قائم کرنے میں موجودالوقت طبقات کا لحاظ کیوں نہ کیا جائے مگر درجات اور طبقات کا تطابق نہ ضروری ہے نہ مفید۔ اگر ایسا ہو تو طبقات ہی سلطنت کی تنظیم کا تعین کریں گے جیسا کہ کسی حد تک ازمنۂ وسطیٰ میں ہوتا تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبقات متحد ہوجائیں اور سلطنت منقسم ہوجائے۔ مخصوص طبقات کے اغراض ومیلان کو جب سیاسی مساعدت حاصل ہوجائے گی تو وہ

[۵] دیکھو اسی مقالہ کا ساتواں باب۔ انگریزی مترجم۔

قوم کے عام اغراض اور اُس کے بہترین خیال پر آسانی سے غالب آجائیں گے برخلاف اس کے تقسیم شمولی سے جس میں ہر درجے میں مختلف طبقات کے ارکان شامل ہوتے ہوں، قومی زندگی میں زیادہ استیناس پیدا ہوجاتا ہے اور سیاسیات میں انواع واقسام کی تحریک پیدا ہوجاتی ہے اور اُسے بلند تر رتبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

املاکی درجات — درجات بیشتر ملکیت کی بنا پر قائم ہوتے ہیں، اس قسم کے نظامات میں ازروئے شمار ملکیت ہی پر سیاسی قوت کا تعین ہوجاتا ہے اور اہل ملک کی قدر کا اندازہ ان کی آمدنی کی مقدار سے ہوتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ انتظام واقعات سے موافق ہو اور اس کا اصول قانون عامہ اور سیاسیات کے بجائے اقتصادیات اور شخصی قانون سے زیادہ قرب رکھتا ہے۔ اس قسم کے خالص حسابی اصول کا مقابلہ کسی ذی حیات تقسیم کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا جس کی نگاہ سب سے پہلے سیاسی اہلیت وقابلیت کے اختلافات پر (جہاں تک ان کا جانچنا اور اندازہ کرنا ممکن ہے) پڑتی ہو۔ سلطنتہائے جدیدہ میں بالعموم چار خاص درجات ممیز ہوسکتے ہیں۔

(۱) درجۂ حکمراں۔ سلطنت کے سب سے اعلیٰ مدارج پر بادشاہ اور وہ عمال ہوتے ہیں جنھیں اقتدار عام حاصل ہو جس سے انھیں تمام دیگر درجات پر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔

(۲) درجۂ اعیان۔ جسے اس قسم کی حکومت تو نہیں حاصل ہوتی مگر جماعت حکمراں اور عام قوم کے درمیان ایک آزادانہ ممیز حیثیت ضرور حاصل ہوتی ہے۔

(۳) نام نہاد "طبقۂ سوم" یعنی امصار و دیار کے تعلیم یافتہ اور آزاد اہل ملک کی جماعت صحیح معنوں میں بھی "درجۂ متوسط" ہے۔

(۴) عوام یا "طبقۂ چہارم" اس میں شہروں کے ادنیٰ درجے کے باشندے اور نیز کسان شامل ہیں۔ یہی کارکن جماعات یعنی مزدوروں کا گروہ عظیم ہے۔

درجۂ حکمراں سلطنت کا کنگرہ اور عوام اس کی بنیاد ہیں، ہر قوم کی قوت اور حقیقی طاقت زیادہ تر انھیں دو درجات کے صحت بخش تعلقات پر منحصر ہوتی ہے۔ درمیان کے درجے اس طرح اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ وہ درجۂ اول کے افعال کی روک تھام کرتے یعنی طبقۂ اعیان اور نیابتی عمومیت کے اثرات سے اس میں اعتدال

پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ ممتاز معاشرتی حیثیت سے انھیں موقع ملتا ہے
کہ جس طرح پر قانون اور آزادی کا اعلیٰ احساس انھیں آمادہ کرتا ہے وہ عام قومی بہبود
کے حالات کی نگہداشت کریں۔ وہ فرد ترین اور کثیر ترین درجے کے فطرتی محافظ،
رہبر اور قائم مقام ہیں۔

اٹھارھواں باب

جدید زمانے کے درجات کا تبصرہ

حکمراں درجہ (جماعت)

اس وقت کا حکمراں درجہ (جماعت) اپنے سرگروہوں یعنی رئیسوں کے توسط سے قدیمی طبقۂ امرا کے ساتھ مربوط ہے۔ اگرچہ اب اس نے سلطنت میں خود امرا پر اقتدار شاہانہ حاصل کرلیا ہے۔ اس درجے کے فروتر ارکان، عہدہ داران و عمال اور جمہوریتوں میں تمام اعلیٰ ترین عہدہ دار بھی زیادہ تر دو درمیانی درجات کے لوگوں میں سے ہوتے ہیں اور معاشرتی طور پر انھیں سے تعلق رکھتے ہیں یا اگر ان کے والدین ادنیٰ طبقے کے وسیع تر گروہ سے ہوتے ہیں تو خود ان کی اعلیٰ تعلیم اور ان کے کام انھیں معاشرتی حیثیت سے طبقۂ اعیان یا جماعت متوسط کے اعلیٰ گروہ کی بلند سطح پر پہنچا دیتے ہیں، اور ان کی یہ حیثیت اُس وقت بھی قائم رہتی ہے جب وہ اپنے عہدے سے مستعفی یا کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ ان کے عہدے کا اقتدار انھیں ان کے ہمسایوں سے بالاتر بنا دیتا ہے۔ ادنیٰ ترین جگہیں اور خدمتیں سب سے فروتر درجہ یعنی غیر تعلیم یافتہ عوام کو حاصل ہوتی ہیں۔

طبقۂ اعیان اب مخصوص الحقوق متحدہ طبقہ نہیں رہا ہے قانون عام و خاص دونوں کے لحاظ سے امرا معاشرۃً اور قانوناً شہریت کے مشترک حقوق اور حقیقی مساوات کی بنا پر دوسرے درجات کے ساتھ مربوط ہیں، ادنیٰ درجات کے ممتاز اشخاص وقتاً فوقتاً خود اپنے کو اور اپنے خاندانوں کو طبقۂ اعیان کی معاشرتی حد پر پہنچا دیتے ہیں اور بتدریج اُس سے متعلق سمجھے جانے لگتے ہیں اس سے بھی زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ طبقۂ اعیان کے ارکان یا اُن کے اخلاف اُس حالت میں آجاتے ہیں جس سے انھیں اپنی حیثیت کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا اور مجبور ہو کر انھیں امیرانہ زندگی کی تابناک بلندیوں سے سوسائٹی کی پست تر سطح پر گرنا پڑتا ہے، یہ غیر ممکن ہے کہ طبقۂ اعیان کی ظاہری حالت یا اس کے لوازم بلا جائداد یا آزادانہ پیشہ یا اعلیٰ تعلیم کے حاصل ہوسکیں اس لئے یہ درجہ فی الحقیقت

تغیر پذیر اور اپنے ارکان کے مسلسل مد و جزر کے لئے وقف ہے۔ اسی مسلسل تحرک سے اس کا نہایت ہی قریبی تعلق شہری طبقے کے اعلیٰ و تعلیم یافتہ جماعت سے قائم رہتا اور اپنے سے نیچے طبقے کے ساتھ منافات باہمی میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے طبقۂ امرا کا موجودہ طبقۂ اعیان کی صورت میں بدل جانا، اولاً انگلستان میں ایک اعیان پسند قوم کے درمیان بتدریج مکمل ہوا، برخلاف اس کے براعظم یورپ میں جاگیردارانہ امرا کے ذریات باقیات کبھی کبھی عام زندگی کے راستہ میں رکاوٹ اور خرابی پیدا کردیتے ہیں اور نئے طبقۂ اعیان ہنوز محض غیر واضح تعلقات زندگی اور متنازع فیہ حیثیت رکھتا ہے۔ طبقۂ اعیان کا اثر نظم معاشرت، آداب دربار اور اعلیٰ عہدوں کی تقررات میں نمایاں نظر آتا ہے مگر یورپی اقوام کے ذہن و احساس میں قانونی اور سیاسی حیثیت سے اُسے ابھی تک کوئی مسلمہ جگہ نہیں ملی ہے۔

جرمانی شہنشاہی کو بروقت اصلاح سے اس کمی کو پورا کرنا چاہئے اور یہ اصلاح اصولاً اسی روش پر ہونا چاہئے جس کا راستہ تاریخ عالم کے تجربے نے دکھایا ہے، طبقۂ اعیان اب ایک منفرد یا شاہی طبقہ نہیں رہ سکتا ہے، اُس کی حیثیت اب اُس درمیانی شخص کی ہونا چاہئے جو حکام کی سختیوں کو نرم کرے، عوام کے جذبات کو قابو میں رکھے اور عام زندگی میں بلند انداز پیدا کرے۔

تعلیم یافتہ شہری طبقہ یا "طبقۂ سوم"

۳۔ شہری طبقہ

فرانسیسی انقلاب کی تاریخ اس طبقے کے خصوصیات کو بہت واضح طور پر نمایاں کرتی ہے، فرانس میں طبقۂ سوم کی اصطلاح جاگیردارانہ سلطنت کے نظم سے لی گئی تھی، اس جاگیردارانہ سلطنت میں اس لفظ سے وہ شہری مراد تھے جو اسٹیٹس جنرل (مجلس شوریٰ رائے عام) میں طلب کئے جاتے تھے اور وہاں انھیں فرقۂ مذہبی اور امرا کے اعیانی طبقات کے تحت میں ایک طرح کی مودبانہ پست حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

۱۷۸۹ء سے فرانس میں طبقۂ سوم کی حالت

پادری سیئیے (Abbe Sieyes) جس کے مشہور رسالہ "دربارۂ طبقۂ سوم" نے فرانسیسی انقلاب کی آگ بھڑکائی، اس نے دو سوال کئے اور خود ہی ان کے جواب دیئے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ طبقۂ سوم کیا ہے، جواب یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہے۔ دوسرا سوال

یہ ہے کہ سیاسی عضویت طبقۂ سوم کی اب تک کیا حیثیت ہے؟ جواب یہ کہ لاشے محض۔ دونوں جواب مبالغہ آمیز ہیں۔ مگر پہلے جواب میں طبقۂ سوم کے دعاوی میں مبالغہ کرنے سے اُس کا تصور ہی قائم کرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر فی الحقیقت یہی سب کچھ ہے تو پھر اول یا دوم یا چہارم طبقے کا کوئی وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ کوئی طبقہ یا جداگانہ درجہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام قوم کے مرادف ہو جاتا ہے۔

پہلے فرانسیسی انقلاب کے دوران میں طبقۂ سوم نے واقعتاً یہ مطالبہ کیا کہ فرانس کے دونوں پہلے طبقات یعنی پادری اور امراء اُس کے ساتھ متحد ہو کر ایک قومی جماعت قائم کریں۔ جب اس کی تکمیل ہو گئی تو طبقۂ سوم نے سب کو اپنے میں جذب کر لیا اور ایک متحد القوۃ اور متساوی الحقوق قوم کی حیثیت سے سلطنت کے تمام قدیمی نظم و نسق کو جو اُس وقت تک قائم تھا توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر اُن سب کو برابر حقوق دینے کے نظریے کے باوجود قوم کے آپس کے فطری اختلافات اپنا اثر دکھا کر رہے۔ پادری اور امراء طبقۂ سوم میں غرق ہو گئے مگر پادری اور امیر ہونے کی جہت سے ان پر ظلم ہونے لگے اور وہ انقلاب کی خونی قربانی کے نذر ہو گئے مگر حکومت اُس وقت تک بھی ایک ہیولائے محض تھی جس میں نئے مناقشات جوش زن تھے۔ اُسی زمانے میں طبقۂ چہارم نے قوت حاصل کر لی اور اُسی میں سے مجلس عارضی کے سرگروہ پیدا ہوئے جن کی خونی حکومت کے سامنے "جیرونڈ" اور طبقۂ سوم کی قوت بھی شرما گئی۔ پس جس انقلاب سے سییئے کے الفاظ کو صحیح ثابت کرنا چاہا تھا اُس سے صرف یہ ظاہر ہوا کہ یہ الفاظ باطل اور غیر منتفی ہیں۔ طبقۂ سوم نے اپنے کو قوم کا مرادف قرار دیا تھا اور اُس کا قائم مقام بن بیٹھا تھا لیکن اسے یہ سبق لینا باقی تھا کہ اُس سے خارج اور بھی بہت سے بڑے بڑے گروہ تھے جو اس کی رہبری میں ایک عام جماعت میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

تعلیم یافتہ شہری جماعت اور عوام کی ادنیٰ جماعتوں کے درمیان وہی مخالفت ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی انقلاب اور سنہ ۱۸۵۲ء کے نپولینی رجعت میں بہت ہی بیّن طور پر ظاہر ہوئی اور پھر ۱۸۷۱ء کے کمیون میں اس نے دوبارہ زیادہ شدید صورت اختیار کی۔ نپولین سوم نے طبقۂ چہارم کی تائید پر بھروسہ کر کے طبقۂ سوم کو جسے مجلس قومی میں بہت بڑی کثرت حاصل

تھی بزور دبا دیا، اس کے بعد سیڈان میں اس کے شکست کھانے کے بعد عوام الناس کے تیسرے اور چوتھے طبقوں نے اپنے جوش و خروش کی حالت میں اسے تخت سے اتار دیا (۴ ستمبر ۱۸۷۰ء) لیکن طبقۂ چہارم نے بہت جلد پاریس (پیرس) کے تیسرے طبقے کے ہاتھ سے اختیارات چھین لئے اور کمیون قائم کر دئے۔

جرمانیا

کسانوں کی جنگ کے وقت ہی مخالفت جرمانیا میں بھی نمودار ہو گئی مگر جرمانیا کی خوش قسمتی تھی کہ اس مخاصمت نے پیرس میں جس تندی و عناد کا اظہار کیا تھا وہ اس زمانے میں وہاں نہیں پیش آئی تاہم شہری اور دیہاتی کسی آبادی میں بھی یہ تحریک بالکل بے اثر نہیں ہو گئی ہے، آخر الذکر میں یہ مخالفت زیادہ تر مذہبی معاملات اور غیر تعلیم یافتہ عوام اور حکام کلیسا کے باہمی تعلقات میں ہوتی ہے اور سابق الذکر میں اقتصادی اور معاشرتی معاملات کے اندر اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

شہری درجہ (جماعت) کوئی طبقہ نہیں ہے۔

یہ شہری جماعت اگرچہ تاریخی طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے طبقۂ سوم سے تعلق رکھتی ہے مگر صحیح طور پر وہ اس نام کو نہیں اختیار کر سکتی۔ اب یہ مخصوص حقوق کا منفرد طبقہ نہیں یا طبقۂ اعیان کے مانند یہ بھی ایک رواں شے ہے جس کے اجزا برابر آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر زیادہ تعلیم یافتہ شہری یعنی تعلیم یافتہ درجات، اب بھی حقیقتاً طبقۂ اعیان اور عوام دونوں سے ممیز ہیں اور اس امتیاز کا اثر انتظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نظام سلطنت سے بھی زیادہ سلطنت کا طرز عمل اور اس کا انتظام متاثر ہوتا ہے۔ وہ طبقۂ اعیان سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ کسی اقتداری حیثیت کے لئے کوئی خاص دعوی نہیں کرتے اور اسلئے نہ وہ خطاب و منصب کے خاص امتیازات کے طالب ہیں اور نہ ایوان اعلیٰ میں نمائندگی کے خواہاں۔ انکی تعلیم و تربیت میں مدنیت کا عنصر غالب ہے، ان کا معاشری اور سیاسی درجہ عام قومیت اور عام حقوق کی بنیاد پر قائم ہے لہذا وہ بالطبع عام نیابت میں شریک ہیں رعایا کے عام حجم عنصر پر انھیں اپنی علمی یا ترقی قابلیت، تمدنی آداب اور آزادانہ پیشوں کی وجہ سے برتری حاصل ہے اس لئے کہ وہ ہاتھ کے بجائے دماغ سے کام کرتے ہیں اور اعلیٰ ذہنی کوششوں کے بہ نسبت زندگی کی مادی ضروریات کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔

بلکہ ایک عام درمیانی درجہ ہے۔

وہ بھی عوام ہی کی ایک جماعت ہیں مگر عام انبوہ سے بلند تر طبقۂ اعیان کے مانند

وہ ایک درمیانی طبقہ ہیں مگر وہ چوتھے درجے سے زیادہ قریب ہیں اور اُسی سے برابر اضافہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ انگلستان میں شرفا (جنٹلمین) اسی عنوان کے تحت میں آتے ہیں مگر جرمانیا، فرانس اور اطالیا کی اعلیٰ شہری جماعت کے بہ نسبت وہ زیادہ محدود و منتخب جماعت ہیں۔ اس عنوان کے تحت میں آبادی کے درجات ذیل آجاتے ہیں:۔

اس کی ترکیبی ہیئت

۱۔ ایسے سرکاری عہدہ دار جن کو اعلیٰ اقتدار حکومت حاصل نہیں اور جو بالکل ادنیٰ درجے کے ملازم یعنی اہل عملہ بھی نہیں ہیں۔

۲۔ عموماً پادری اور معلمین،۔

۳۔ ڈاکٹر یعنی یونیورسٹی کے سند یافتہ) قانون پیشہ، طبابت پیشہ، دواساز، غیر پیشہ ور اہل علم اور مصنفین،

۴۔ فنون لطیفہ کے ماہر، انجینیر اور اعلیٰ صنعتی پیشوں کے ارکان،

۵۔ بڑے تاجر اور کارخانہ دار،

۶۔ ہنرور دستکاروں کی اعلیٰ جماعت،

۷۔ سرمایہ دار۔

۸۔ بڑے بڑے زمیندار جو طبقۂ اعیان میں شامل نہیں ہیں۔

اس جماعت کا حقیقی وصف اعلیٰ تعلیم ہے اگرچہ یہ لازمی نہیں۔ کہ یہ تعلیم کسی جامعہ یا اعلیٰ صنعتی تعلیم گاہ ہی میں حاصل کی گئی ہو اور اس میں بالعموم یہ بھی مرعی رہتا ہے کہ ذرائع آمدنی ایسے ہوں کہ عام کاموں کے لئے وقت مل سکے۔ سرکاری عہدوں کے انتخاب کے لئے جامعہ کی تعلیم لازماً فرض کرلی جاتی ہے اور ریاستی جماعتوں کے کام میں حصہ لینے کی اعلیٰ مناسبت کے باعث اگر کوئی خاص قانون اس کے خلاف نہ ہو تو انھیں لوگوں کو قومی مجلسوں اور قانونی ایوانوں میں غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

اس کی سیاسی قوت۔

موجودہ زمانے کی سلطنت کی زندگی میں عموماً یہ درجہ سب سے زیادہ با اثر ہوتا ہے، معاملات عامہ میں اسے پیشروی حاصل ہوجاتی ہے اور وہی عام رائے کو متعین کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شمولیت کا انحصار تعلیم، جائداد اور پیشے پر ہوتا اور نسب کا کچھ ایسا لحاظ نہیں کیا جاتا، تاہم ایسے قدیمی اشخاص آزاد کے درجے کو ازمنۂ وسطیٰ

کے درجۂ متوسط کے مقابل قرار دینا مناسب ہوگا انھیں کے مانند یہ بھی سیاسی حقوق رکھنے والوں کی خاص الخاص جماعت ہوتی اور سرکاری عہدوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ درجۂ ادنیٰ۔ عوام

قوم کے وسیع درجات، نام نہاد "طبقۂ چہارم" اور غیر ملکیوں کی جماعت[1] اس چوتھے درجے میں ہم عوام کے اس جم غفیر کو شامل کرتے ہیں، جو اوپر کے تین درجوں میں داخل نہیں ہیں، انھیں کو ہم بسا اوقات "عوام" کہتے ہیں اس میں بہت ہی مختلف پیشوں اور بہت ہی متباین زندگی کے لوگ شامل ہیں مگر سب کے سب ایک عام ملک و قومیت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ مشترک حقوق شہریت کے تعلق سے باہم وابستہ ہیں۔ اس میں ذیل کے گروہ شامل ہیں اور سلطنت کے اقتصادیات میں ان کی مختلف جگہیں ہیں۔

(الف) کسانوں کا گروہ کثیر جو بطور خود اپنے نوکروں کی مدد سے کام کرتا ہے جو ہل چلاتے، میدانوں کی گھانس کاٹتے غلہ جمع کرتے انگور کی بیلوں کو چھانٹتے، کھلیان جمع کرتے اور پالو جانوروں کی سیوا کرتے ہیں، یہی لوگ اس درجے کے سب سے کثیر اور سب سے قوی جزو ہیں اور یہی اس رئیس قومی قوت کا منبع ہیں جس سے دوسرے درجات نئی زندگی اور نئی طاقت حاصل کرتے ہیں۔

(ب) گلہ بان، ماہی گیر، شکاری ملاح، کان کن اور بالعموم وہ تمام مزدور جنھیں پیشے کے تعلق سے براہ راست فطرتی اشیاء (یعنی زمین)، پانی، جانوروں اور زمین سے اُگنے والے پھل پھول) سے ہر وقت کام پڑتا ہے۔

(ج) شہر اور قصبے دونوں کی فروتر شہری جماعت۔ اس میں اولاً کارخانہ دار، کاریگر مع اپنے آدمیوں کے اور چھوٹے چھوٹے تجارت پیشہ لوگ شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی نیچے درجے کی حرفتی جماعت بھی خواہ خود اپنے گھروں کے اندر کرگھے وغیرہ پر

---

[1] قدیم روما میں سب سے فروتر طبقہ پرولیٹاریس (Proletarius) کہلاتا تھا وہ سلطنت کی خدمت دولت سے نہیں بلکہ اپنی اولاد سے کرتا تھا۔ پرولیس ( ) کے معنی اولاد کے ہیں مگر اب ان سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جن کے پاس کوئی ملک نہ ہو، صحیح ترجمہ اس کا "غیر ملکی" ہے۔ مترجم۔

کام کرتی ہوں، خواہ کارخانوں میں کام کرتی ہوں، دونوں اس میں داخل ہیں ۔

(د) سلطنت کے اور پیشہ ور اشخاص کے ادنیٰ ملازمین یا فوج کے معمولی سپاہی دفتروں کے محرر نقل نویس وغیرہ ؛

(ہ) غیر ملکی یا عامی جن میں ادنیٰ ترین درجے کے ملازمین اور مزدوری پیشہ لوگ داخل ہیں۔ ان سب گروہوں میں مابہ الاشتراک یہ ہے کہ وہ جسمانی محنت اور مادی ضروریات کے پیدا کرنے میں مشغول ہیں، فی الحقیقت یہ غیر ممکن ہے کہ دماغی اور جسمانی کام کے درمیان کوئی قطعی حد فاصل قائم کی جاسکے کیونکہ یہ لازمی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر کمزور پڑ جاتا ہے مگر ان کا فرق ایک صحیح اور قابل تسلیم فرق ہے ۔ دماغی کام میں نسبتاً اعلیٰ ذہنی تربیت اور اعلیٰ معاشری حیثیت کی ضرورت ہے، ہاتھ کا کام بہت ہی کم تعلیم اور سادے اور معمولی طرز زندگی کے ساتھ ممکن ہے، اس لئے یہ دونوں کام بالطبع دو مختلف طبقوں میں منقسم ہو جاتے ہیں ۔

درجۂ چہارم کی ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام سلطنتوں اور عام قومی زندگی کی لابدی بنیاد ہوتے ہیں مگر ان میں حکمرانی کی قابلیت نہیں ہے، اس لئے انھیں رہبروں اور قائم مقاموں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ معاشری جماعت میں وہ بالعموم ساکت و تابع جزو کو ظاہر کرتے ہیں، مگر جب ان کے جذبات انقلاب کے لئے بھڑک اُٹھتے ہیں تو پھر موجودہ انتظام کے اُلٹ دینے اور اپنی مرضی کو قانون بنا دینے کی جو طاقت ان میں ہوتی ہے اسے کوئی شے روک نہیں سکتی۔ کسی حکومت کے بدل دینے یا کسی قسم کے نظام سلطنت کے بزور حاصل کر لینے کی ان میں پوری قوت ہے وہ تخت شاہی کو اُلٹ سکتے اور نئے لوگوں یا نئے خاندانوں کو اختیار تفویض کر سکتے ہیں مگر خود حکمرانی کرنے کی قابلیت ان میں نہیں ہے جہاں کہیں اُن کو اس کوشش کا موقع ملا کہ خود حکومت کریں وہاں سلطنت کی حالت اُس آدمی کی سی ہوگئی جو سر کے بل کھڑا ہوا اور ٹانگیں اوپر کو ہوں ۔

اس طبقہ کی موجودہ اہمیت

سیاسی زندگی میں اس طبقے کو ابتک کبھی ایسی اہمیت نہیں حاصل ہوئی تھی جیسی اس وقت اسے یورپی سلطنتوں میں حاصل ہے۔ خدمتگار جماعت کے تنگ و محدود مفہوم میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ آزاد ہوگئی ہیں، فروترین جماعت تک یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ سلطنت کی

بہبودی میں اُن کا بھی حصہ ہے اور سیاسی حقوق پر انھیں بھی استحقاق ہے۔ حالات کے اعتبار سے اب سلطنت کے ارباب حل وعقد مجبور ہیں کہ اس طبقۂ چہارم کی حالت پر خاص توجہ کریں اب صرف اس قدر کافی نہیں ہے کہ صرف تعلیم یافتہ جماعت کی رائے سن لی جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ اب عوام سے کے اپنے احساس وجذبات کا اثر اگلے زمانے کے بہ نسبت بہت زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی موجودہ زمانے کی سلطنت میں (جس سے سب سے پہلے یورپی یعنی آریائی نسل کی قوموں کی سلطنت مراد ہے) زیادہ انسانی خصائل وشمائل پیدا ہو گئے ہیں۔

لیکن طبقۂ چہارم اس قدر وسیع ہے کہ مختلف پیشوں اور مختلف مدارج زندگی کے بڑے بڑے گروہ سب اس میں شامل ہیں، سیاسی جماعت کے (جسم کے) قوی ترین وصعب ترین اجزا اسکے اندر رہتے ہیں، سلطنت کے حفظ وبقا کے لئے اُس کی ہستی لازمی ہے مگر اُس نے خود سلطنت ہی کی ہستی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے اُس کا صحیح ترین حصہ کسانوں کی جماعت میں پایا جاتا ہے لیکن اگر انتظام عام کو تباہی سے بچانا ہے تو ان کسانوں کے واسطے بھی ضرورت ہے کہ کسی مذہبی یا ذہنی تحریک سے ان میں زندگی پیدا کی جائے ان کے بعد ادنیٰ شہری جماعت کا درجہ ہے دونوں میں ایک مختص المقام تنظیم قائم ہے مگر شہروں کے انبوہ در انبوہ عوام الناس کی ضروریات کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ درانحالیکہ اور دوسرے معاشری تعلقات ٹوٹ چکے ہیں، وہ قدیم انتظام جس سے بڑے بڑے اہل حرفہ خود آپس میں اور اپنے کاریگروں کے ساتھ متحد رہتے تھے تباہ ہو چکا ہے یہ قدیم نظم زائل ہو چکا ہے اور یہ تمام جماعتیں خاصکر کارخانوں کے کام کرنے والے ابتری میں پڑ گئے ہیں کام کرنے والوں کی خود ساختہ انجمنیں اور مزدوروں کے جتھے تنظیم جدید کے تخم اولین ہیں اس فساد تنظیم سے سوسائٹی (نظم معاشرت) کو نقصان پہنچ رہا ہے، مختلف مزدوری پیشہ طبقات میں تعلیم کی یکرنگی اور اغراض اور طبائع کی یکجہتی اگر بالکل معدوم نہیں ہو گئی ہے تو اس میں ابتری ضرور آگئی ہے اور اس ہیجان عام کا رخ اس طرف ہے کہ ہر شخص اپنے ہمسایہ سے بے ضرورت برسر پرخاش ہے۔ پولیس کی کارروائیاں لاحاصل رہتی ہیں کیونکہ وہ مختص حالات میں خرابی کو روک سکتی یا اسے دبا سکتی ہیں۔ مگر جہاں معالجانہ اصلاحی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ اپنے پریشان کن طریق عمل سے اکثر اس خرابی میں

اُس کی تنظیمی کمی

اور اضافہ کر دیتی ہیں یہ امر تعجب انگیز نہیں ہے کہ دہریت اور اشتراکیت کو طبقۂ چہارم کے زرین سطحوں میں بار آور زمین مل گئی ہے اور اکثر بڑے بڑے شہروں میں بلکہ دیہات کے بھی بعض حصص میں یہ اندیشہ دامنگیر ہو گیا ہے کہ یہ خس و خاشاک قدیم زمانے کی شریف تر پودوں کو بالکل دبا نہ دیں۔

غیر ملکی

"غیر ملکی" حلقۂ چہارم کے فروترین درجے میں سا ہیں۔ اسے طبقۂ چہارم کے مرادف نہیں سمجھنا چاہیئے نہ اسے ایک درجے یا فرقے کے طور پر ترتیب دینا چاہیئے بلکہ ملکی مدبر کا کام یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اُسے دوسرے طبقات میں جذب کر دے اور اس طرح ایک جداگانہ جماعت کی حیثیت سے اس کی ترقی کو روک دے۔ یہ زیادہ تر دوسرے درجات کا "جزو فضول" ہے یا آبادی کے وہ اجزا ہیں جنھیں اُن کی کس مپرسی اور غربت کی وجہ سے سوسائٹی (معاشرت) کی معینہ تنظیم میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی یہ امر فی نفسہٖ غلط اور سیاسی نظر سے خطرناک ہے کہ سلطنت کے باشندوں کے درمیان "ذی املاک" اور "غیر ذی املاک" کی ایک معینہ تفریق قائم کی جائے اور آخر الذکر کے مجموعے کو "غیر ملکی" قرار دیکر اُن میں اور "ملکیوں" میں مخاصمت پیدا کر دی جائے اگر عدم ارتباط کا یہ خیال جس کی زائد از ضرورت ہمت افزائی کی گئی ہے اسی طرح پھیلتا رہا اور اُسے غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ بربریت کے ایک نئے طوفان سے مہذب سوسائٹی کو غرقاب کر دے گا۔ خوش قسمتی سے غیر ذی املاک اشخاص کا بڑا حصہ ہنوز دوسرے درجوں سے جسمانی ربط و تعلق رکھتا اور اُس پر مطمئن ہے۔ بے ملک لڑکے "غیر ملکیوں" کے زمرے میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت و ترتیب میں ہیں اور ماں باپ والدین کی حیثیت میں شریک ہیں مذہبی حلقوں کی تنظیم میں یتیموں تک کو خاندانی زندگی حاصل ہے۔ نیز کھیتوں میں کام کرنے والے مرد و عورت جن کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ بھی "غیر ملکیوں" کے تحت میں شامل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہیں بلکہ زراعت گاہ یا کسان کے خاندان میں انھیں جگہ ملتی ہے اور کسانوں کے طبقے کی زندگی میں وہ شریک ہیں دستکاروں کا انتظام جب بہتر تھا تو امیدوار کام کرنے والا اپنے استاد کے خاندان کا ایک رکن ہوتا تھا اور اب اس تعلق کے ٹوٹ جانے پر بھی دستکار جماعت سے متعلق ہونے کا خیال اُسے "غیر ملکیوں" سے بلند رکھتا ہے، خانگی ملازم بھی کسی قدر آرام کی حالت میں رہتے ہیں

اور اپنے آقاؤں کی معاشرت میں اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے سپاہی کو تنخواہ ملتی اور سپہگری کا کام اُس کی عزت کا موجب ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک صورت عام مزدوروں کی غیر منتظم حالت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی جماعت ہے جس میں "غیر ملکیوں" کا اجتماع نہایت درجہ وسیع اور خطرناک حد کو پہنچ گیا ہے۔ مدبر سلطنت کا اصلی تدبیر یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف وہ کوشش کرے کہ مزدوروں کی منتظم جماعت کے ارکین کو غیر منتظم "غیر ملکیوں" میں شامل ہو جانے سے روکے اور دوسری طرف تاحد امکان "غیر ملکیوں" کو اس منتظم جماعت تک ترقی کرنے میں مدد دے جہاں وہ نسبتاً زیادہ قابل اطمینان ذریعۂ معاش حاصل کر سکیں "غیر ملکی اس طرح محدود ہو کر جدا گانہ تنظیم کی ضرورت نہ سمجھیں گے جس کے لئے وہ ناموزوں ہیں بلکہ انھیں صرف ایسے سرپرستوں کی ضرورت ہو گی جو اُن کے اغراض کی حفاظت اور اُن کی نیابت کا حق ادا کریں۔

طبقۂ چہارم کے سیاسی دعاوی

طبقۂ چہارم سلطنت کے عہدوں کے کام انجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتا مگر اُس کے بہتر افراد بلدی عہدوں کی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور وہ ان سے محروم نہیں کیے جاسکتے۔ قوم کی نیابت میں اُنھیں حصہ ملنا چاہیے اور سلطنت کو اس امر پر نظر رکھنا چاہیے کہ طبقۂ سوم اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ فرصت کی وجہ سے اس طبقۂ چہارم کو کلیتہً محروم نہ کر دے جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے لیکن چونکہ اس درجے کے ارکین کو بذات خود اپنے اغراض کی نیابت کی نہ فرصت ہے نہ قابلیت اسلئے انھیں موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی جماعت سے باہر کے لوگوں کو اپنا قائم مقام منتخب کر سکیں آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس درجے کی اہمیت اُسے اظہار رائے کا مستحق قرار دیتی ہے مگر جہاں افراد مشترکہ کی معاشری اہمیت اور قابلیت اس درجہ مختلف ہو وہاں یہ ناانصافی ہے کہ سب کو برابر کا اختیار دیا جائے۔

حقیقی "غیر ملکیوں" کے حقیقی اغراض کا تقاضا قائم مقاموں سے زیادہ سرپرستوں کے لئے ہے کیونکہ وہ خود اپنے اندر قائم مقامی کے لائق افراد نہیں پا سکتے اور سرپرست کی حیثیت اور اس کا اثر جس قدر بلند ہو گا اسی قدر "غیر ملکیوں" کے حقوق کی حفاظت زیادہ موثر طور پر ہو گی۔

انیسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(ا) - قبائلی سلطنت - پدرسری حکومت - ازدواج

متقدمین ومتاخرین سب نے خاندان کو سلطنت کا نمونہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سلطنت ایک طرح پر خاندان کی توسیع ہے۔ سرسلطنت باپ کے بجائے ہے اور رعایا اُس کے بچے ہیں۔

سلطنت اور خاندان کے درمیان فرق

یہ مقابلہ صرف ایک محدود مفہوم میں صحیح ہے۔ یہ صرف ایک پدرسری سلطنت پر صادق آسکتا ہے۔ سلطنت کی اعلیٰ صورتوں پر جن کی بنا قومیت اور انسانیت پر ہے یہ خیال منطبق نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ اُن اصولی فرقوں کی تشریح کردی جائے جن سے سلطنت اور خاندان میں تمیز ہوتی ہے۔

ا۔ خاندان کی بنا ازدواج پر ہے اُس کے اراکین ازدواج کے رشتے یا خون کے تعلق سے متحد ہوتے ہیں مگر یہ خیالات جو خاندان کے لازمی ہیں سلطنت کیلئے کسی اعتبار سے لازمی نہیں ہیں ایک ہی سلطنت کے رکن ہونے کی حیثیت سے لوگوں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ازدواج اور خون کے وسیلے سے نہیں ہوتا انھیں ہمیشہ ازدواج باہمی کا حق حاصل نہیں ہوتا چہ جائے کہ وہ سب کے سب ایک ہی نسل سے ہوں پس خاندان کے بنیادی حقوق سلطنت سے بالکل آزاد ہیں۔

۲۔ سلطنت کی بنا قوم کی تنظیم اور اُس کے ارضی تعلق پر ہے مگر خاندان میں ان خیالات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سلطنت خاندانوں کے بجائے زیادہ تر افراد طبقات یا جماعات پر مشتمل ہے اور صرف مستثنیٰ حالتوں میں خاندانی واسطے سے اپنے

اراکین تک پہنچتی ہے خاندانی زندگی میں وہ صرف اسی وقت دخل دیتی ہے جب کوئی خاص ضرورت داعی ہوتی ہے یا تولیت کی صورت پیش آتی ہے۔ آخراً یہ کہ خاندان کا کوئی واسطہ زمین سے نہیں ہوتا۔

۳۔ دونوں عضویے (یعنی سلطنت اور خاندان) اپنی کیفیت میں مختلف ہیں۔ خاندان کا بزرگ باپ ہوتا ہے جس کا اقتدار یہ ہے کہ ایک بالغ شخص خود اپنے دم و لحم کی حفاظت کی فکر کرتا ہے فی الاصل یہ ایک طرح کی تولیت ہے۔ سلطنت میں مختلف جماعت کے اغراض اپنے سردار یعنی بادشاہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے خاندانوں کا تعلق بادشاہ کے خاندان سے نہیں ہوتا، نہ سلطنت کے افراد اس کے بچے یا اس کے زیر تولیت ہوتے ہیں، سلطنت کی حکومت ایک سیاسی حکومت ہے پس خاندان عام سلطنت کا نہیں بلکہ اس کی صرف ایک صورت خاص یعنی پدرسری سلطنت کا نمونہ ہے[1] اس لئے خاندانی قانون، قانون شخصی سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ قانون عام سے مگر سلطنت کی ابتدا آریائی اقوام تک میں خاندان اور قبیلے ہی کے روابط سے تعلق رکھتی ہے اول اول ہادیان قوم، منصفوں اور حاکموں کو اپنے اختیار کی ضروری تائید خاندان ہی سے حاصل ہوئی اور صرف تدریجی طور پر یہ ہوا کہ ایک سیاسی نظم ایسا پیدا ہوا جو ان حدود سے تجاوز کر گیا۔

قبائلی نظام

قبائلی نظام نے خاندان اور سلطنت کے مابین ایک پل کا کام دیا اور جس وقت سلطنت اپنے قیام کی طرف سے مطمئن ہو گئی اس وقت یہ پل گرا کر الگ کر دیا گیا اکثر قدیم اقوام میں ہمیں ایسے قبائل ملتے ہیں جو سیاسی اہمیت رکھتے تھے مگر جو بعد میں ناپید ہو گئے۔ ایسے قبیلے قدیم موسوی نظام حکومت میں بھی اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح قدیم یونانی یا قدیم رومی نظام حکومت میں جس طرح قدیم عربی قبیلے اپنے

[1] گوبینو نے اپنی کتاب "انسانی نسلوں کی ناساویت" (Sur e'inegalite "des races humaines) میں یہ بیان کیا ہے کہ پدرسری تصور حکومت جو باپ کے اقتدار کو فرمانروایا نہ اقتدار کا نمونہ قرار دیتا ہے، اسے آریائی قوموں نے بہت سمجھ بوجھ کے اور اہم مستثنیات کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ برخلاف اُن کے چینیوں کو جو زرد نسل کی سب سے بڑی قوم ہیں۔ اس طرز حکومت کی کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

سرداروں کا پدرانہ احترام کرتے تھے اُسی کا نمونہ ہمیں اسکاٹلینڈی جرگوں میں ملتا ہے جرمانی دیہاتوں کے نام اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ وہاں جو لوگ سکونت پذیر تھے وہ قبائل یا خاندانوں کی صورت میں منضبط تھے۔ لیدر کو انھیں قبیلوں نے اپنے تئیں جتھوں کی صورت میں عضو بند کر لیا۔ اور قدیم سلاؤ کسانوں کے جتھوں کی نوعیت بھی ایک خاندان کی سی ہے۔

قبیلے اور خاندان میں فرق یہ ہے کہ ایک قبیلے کے اندر متعدد یک جدی گروہ داخل ہوتے ہیں مگر قبیلے کا انتظام خاندان کے انتظام کے مثل ہوتا ہے، قبیلے کے سردار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں خاندانوں کے اندر بلند مرتبہ حاصل ہوتا ہے مگر اتحاد کی ضرورت قبیلے کی سرداری کو ایک خاندان کے ایک ہی سرگروہ (سردار) تک محدود رکھتی ہے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ خاندانی حق کے بجائے انتخاب یا قرعہ اندازی کے طریقے پر عمل کیا جائے۔

پدرسری سلطنت

جو سلطنت قطعی طور پر خاندان کے نمونے پر قائم کی گئی ہے وہ پدرسری سلطنت ہے۔ چین کی کاملہ شہنشاہی (جسے خود چینی "وسطی شہنشاہی" کے نام سے یاد کرتے ہیں) صدیوں سے مضبوطی کے ساتھ اس خیال پر جمی ہوئی ہے کہ سلطنت کا سرتاج رعایا کا باپ ہے۔ گوبینو جس نے اس یقین کے وجوہات ظاہر کئے ہیں کہ سلطنت کی اول بانی آریائی نسلیں ہیں وہ پدرسری خیال (سلطنت) کو انھیں کی تجویز کی طرف منسوب کرتا ہے مگر اس شہنشاہی عظمیٰ کی نہایت کثیر آبادی جو بتدریج ایک خاندان میں متحد ہو گئی ہے اس کی اصل ملایائی نسل سے ہے جس میں زرد نسل کا جزو نہایت غالب ہے گو کالی نسل کے میل سے وہ بالکل بے غش نہیں رہی ہے۔ یہ آبادی جو آسان پسند مادی زندگی کی طرف مائل ہے حکمرانوں کی پدرانہ مطلق العنانی پر خوشی سے راضی ہو جاتی ہے اور سلطنت کے روایتی نظام کو ایک منجانب اللہ نظام تمدن سمجھکر اس کا احترام کرتی ہے۔ آریائی قوموں میں آزادی کا جو مضبوط احساس خلقتاً موجود ہے اس کا اس پر کچھ اثر نہیں ہے اور نہ اس کے حوصلوں میں کچھ بلندی ہے نظریے کے لحاظ سے تو شہنشاہ اقتدار مطلق رکھتا ہے مگر حقیقت میں قوم کے سارے طبقوں کے سکون پسند طبائع، منداریوں (یعنی چینی عالموں) کی قدیمانہ فضیلت نما تعلیم و تربیت اور سب سے بڑھکر نسلاً بعد نسل کے خاندانی رواج

کی قوت نے اس اقتدار مطلق کو بہت کچھ محدود کر دیا ہے۔ چنانچہ گوبنیو کہتا ہے کہ "آسمان کا بیٹا (یعنی ظل اللہ) سب کچھ کر سکتا ہے مگر اسی شرط پر کہ وہ صرف وہی کرنا چاہے جس کا علم اور جس کا رواج پرانے زمانے سے چلا آرہا ہے"۔ مگر جہاں سلطنت اور اس کے اراکین ایک پدرانہ نظام سلطنت کے ذریعے سے دائمی طفولیت کی حالت میں کھے جائیں وہاں زوردار سیاسی ترقی کا ہونا ناممکن ہے۔

خاندان کا اثر سلطنت پر

سلطنت کی بہبود پر خاندانی زندگی کا اثر ایک بالکل ہی جداگانہ سوال ہے اس کا اثر اگرچہ زیادہ تر بالواسطہ ہوتا ہے مگر یہ دور رس اثر ہے اور جس قدر بھی اسے بلند سمجھئے کم ہے اس لئے سلطنت پر نہ صرف یہ لازم ہے کہ وہ خاندانی قانون کی شخصی قانون کے ایک جز کے طور پر محافظت کرے بلکہ خاندانی زندگی کی بہبود کے ترقی دینے اور اس کے برقرار رکھنے پر بھی اُسے خاص توجہ کرنا چاہیے چونکہ خاندان کسی قسم کی سیاسی تنظیم نہیں ہے اس لئے اس معاملے میں سلطنت کی طاقت کم اور زیادہ تر بالواسطہ ہے مگر بعض تعلقات ایسے ہیں جن میں وہ شخصی خودسری کو روک سکتی ہے اور اُسے روکنا چاہیئے۔ مثلاً ازدواجی تعلق کے معاملات ہیں۔

ازدواج، اس کی اعلیٰ ترین صورت توحد ازدواج ہے

تمام اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں۔ توحد ازدواج کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ایک ہی بیوی کے کئی شوہر ہوں تو خود نسل ہی میں ابتری پڑتی ہے اور ایک مرد کی کئی بیویاں ہوں تو خاندان میں مناقشہ پیدا ہوتا ہے۔ ازدواج کی کامل یکجہتی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت میں باہم اتحاد کا رشتہ قائم ہو۔ جنسوں کی دوئی جس میں انسانی دنیا منقسم ہے توحد ازدواج کے ذریعے سے وہ دوئی پھر مل کر ایک ہی بن جاتی ہے اس لئے تعدد ازدواج نہ فطرت کے مطابق ہے نہ اخلاق کے پس سلطنت کو اُس کا روادار نہ ہونا چاہیئے۔ جب گال کے اساقفہ میرووِنگی بادشاہوں کے تعدد ازدواج کی پرجوش مخالفت کر رہے تھے اور اُنھوں نے اس وقت تک سپر نہ ڈالی جب تک کہ ان بادشاہوں نے بیٹو ٹونی بادشاہوں کے اُس قدیم شاہی حق سے دست برداری نہ اختیار کی جس کی رو سے اُن کو کئی بیویاں کرنا مباح تھا۔ اس وقت یہ اساقفہ محض ایک مسیحی اصول کی حفاظت میں سینہ سپر نہ تھے بلکہ وہ ایک سیاسی اصول کی بھی حفاظت کر رہے تھے۔ توحد ازدواج سے معاشرت میں بیوی کا مرتبہ پوری طرح پر شوہر کے مرتبے کے برابر ہو جاتا ہے اور شوہر

پر اس کا ایک عمدہ اثر مترتب ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے تعداد ازدواج عورتوں کو مردوں کی مخفی نفسانی خواہشات کے آلے بنا کر اُن کو ذلیل کر دیتا ہے اور عورت کی اس ذلیل و خوار حالت کا عکس خود شوہر پر پڑتا اور اسے بھی مبتذل بنا دیتا ہے توحد ازدواج یورپی اور مسیحی قوموں کی ایک خاص افضلیت ہے اور تعدد ازدواج مشرقی قوموں کا موروثی طوق لعنت میاں بیوی کے قانونی تعلقات کا مسئلہ بھی ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

میاں بیوی کا قانون

اس میدان میں رومی قانون، رومی تخیل ازدواج سے پیچھے رہ گیا۔ رومیوں کے خیال کے مطابق میاں بیوی کا تعلق مرد اور عورت کا ایک ولی اور عمر بھر کا اتحاد تھا مگر اُن کا قدیم قانون بیوی کو لڑکی کے مثل قرار دیتا تھا۔ شوہر کو اس پر ویسا ہی اختیار مطلق حاصل تھا جیسے باپ کو اولاد پر یا مالک کو غلاموں پر، برخلاف اس کے زمانۂ مابعد کے قانون نے اس اتحاد کو محض دو آزاد شخصوں کا تعلق قرار دے دیا۔ رومی جمہوریہ کے آخری زمانے میں جس قدر رومیوں کا اخلاق خراب ہوتا گیا اُسی قدر ازدواج کا یہ آزاد طریقہ زیادہ عام ہوتا گیا اور جمہوریہ کے زوال کو آگے بڑھانے میں اس نے مدد دی۔

اس کے مقابلے میں جرمانی قانون ہے جس کا قدیم تر اصول تو یہ تھا کہ مناکحت کے اتحاد اور یکجہتی کی بنا پر بیوی قانوناً شوہر کی حفاظت میں آجاتی تھی گو مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ملکیت کے مالک رہتے تھے مگر بعد کے اصول کے موافق ملکیت بھی متحد ہو جاتی ہے۔ یہ قانون اُس خیال کے مطابق ہے جو موسوی شریعت کے نہایت قدیم احکام میں ان دو دلکش جملوں میں ظاہر کیا گیا ہے:۔ "میاں اور بیوی ایک ہی جسم ہیں اور شوہر بیوی کا سر تاج ہے"۔

بیاہ کی رسمیں

ازدواج کی ظاہری صورتوں سے بھی لاپروائی نہیں اختیار کی جاسکتی۔ اُس صورت کو جو بیاہ کے تعلق کی گہری یکجہتی اور تقدس کو ظاہر کرنے کے لئے زیبا ہے اُس صورت کے مقابلے میں ترجیح ہے جو اُسے محض ایک معاہدے کا اختیاری نتیجہ قرار دیتی ہو۔ قدیم رومی اصول کہ "دو شخصوں کا آپس میں رضامند ہو جانا ہی بیاہ ہے" محل تامل ہے کیونکہ یہ اس خیال کی طرف منجر ہوتا ہے کہ مناکحت ایک معاہدۂ محض کا سا تعلق ہے۔

پس اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر اقوام کے رسم و رواج میں عقد کیلئے مذہبی رسوم قرار دیے گئے ہیں اور مسیحی قوموں کا عمل بھی اس پر زور دیتا ہے کہ بیاہ گرجا میں ہو

اس بات سے بھی زیادہ اہم ہے خاندان کی قانونی حفاظت جو خفیہ عقد کے منافی ہے اور اس معاملے میں صرف اعلان اور تحریری توثیق ہی سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ غیر کلیسائی یا قانونی صورت میں یہ شرائط پورے ہو جاتے ہیں۔ اگر سلطنت کی تسلیم کردہ آزادی مناکحت میں دخل دیکر اور قانون کو خیالات پر منحصر قرار دیکر پادریوں نے مذہبی شکل ازدواج سے بیجا کام نہ لیا ہوتا تو موجودہ سلطنتیں اس طریقے سے مطمئن رہتیں مگر ان خرابیوں اور مذہبی آرا کے موجودہ اختلاف نے ایک خالص قانونی صورت کی ضرورت لاحق کر دی ہے۔ اب دو شکلیں رائج ہیں۔

۱۔ عمال سلطنت کے روبرو قانونی مناکحت، جو کسی عقد کے صحیح قرار دیئے کے لئے ضروری ہے۔

۔ مابعد کی کلیسائی رسم جسے پادری انجام دیتے ہیں۔ اس سے مناکحت کو مذہبی قبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ امر اختیاری ہے۔

ازدواج کی ہمت افزائی

شہنشاہ آگسٹس نے قانون کے ذریعے سے مناکحت اور آبادی کے بڑھانے کی وسیع پیمانے پر کوشش کی۔ اس قسم کے قانون کی ضرورت اُسی وقت ہوتی ہے جب قوم ایسی غیر تندرست حالتوں میں مبتلا ہو جن کے باعث افراد جذبۂ فطری کے مطابق آپس میں اتحاد قائم کرنے سے باز رہیں۔ یہ حالات خصوصاً بڑے شہروں کی معاشرت میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شہروں میں لوگوں کو مباشرت کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ ازدواج کے اور بھی بہت سے موقعے حاصل ہیں ان کی وجہ سے ایک بے لگام اور قابل نفرت زندگی عام ہو گئی ہے۔ دوسری جانب شہر میں رہ کر ایک خاندان کے مصارف برداشت کرنے میں بھی خاصی دشواری ہے ایسی باتیں خاصکر اعلیٰ طبقوں میں مناکحت کی قرار واقعی روک تھام کر دیتی ہیں۔

روما میں وصیت کی آزادی نے اس راہ میں ایک اور بھی روک پیدا کر دی تھی کیونکہ ایک غیر شادی شدہ دولت مند شخص کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اُس کے بڑھاپے میں اُس کے پُر طمع اعزا و احباب ترکہ پانے کے شوق میں غلاموں کی طرح اُس کی خدمت اور خوشامد کریں گے۔ آگسٹس بجا طور پر یہ کہہ سکتا تھا کہ "مکانوں" "مسقف راستوں اور خالی بازاروں سے شہر نہیں بنتا ہے بلکہ شہر آدمیوں سے بنتا ہے اگر تم ناکتخدائی پر مصر رہے

توڑ روتا یونانیوں بلکہ وحشیوں کا شکار ہو جائے گا۔"

مگر دیہات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کسانوں کی اراضی کے قائم رکھنے اور جائدادوں کی تقسیم کے روکنے کے خیال سے اس قسم کی بندشیں موجود ہیں چنانچہ اکثر مقامات میں صرف دو اولادوں کو وراثت ملتی ہے۔ بعض جگہ بڑے بیٹے کے سوا باقی کل بیٹے زرعی خادم سمجھے جاتے یا باہر بھیج دئے جاتے ہیں۔ مناکحت اور تناسل کے بڑھانے کے لئے سلطنت جن ذرائع کا استعمال کرسکتی ہے وہ بلاشبہ محدود ہیں اور جیسا کہ آگسٹس کو تجربہ ہوگیا ہر صورت میں ناگوار سمجھے جاتے ہیں۔ مناکحت پر کسی کو قطعی طور پر مجبور کرنا ممکن نہیں کیونکہ اُس کے لئے جانبین اور اُن کی آزادانہ مرضی لازمی ہے۔ ایک صاحب تاج و تخت کے معاملے میں جہاں مفاد عامہ کے لئے مناکحت بسا ضروری ہے سلطنت کی مرضی کو شخصی حقوق میں مداخلت کرنے اور انسانی آزادی میں دست انداز ہونے کے بجائے زیادہ تر خود اپنی مرضی کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں ملکہ وکٹوریا نے شاہی آزادی کو اہم سیاسی اغراض کے مقابلے میں کامیابی کے ساتھ قائم رکھا۔ سلطنت صرف اس طرح بالواسطہ کارروائی کرسکتی ہے کہ ازدواج کے لئے خاص امتیازات مقرر کرے اور تجرد کے منافع کو کم کردے مگر اُسے جرم نہ قرار دے۔ رومی قانون نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

ازدواج کی روک۔

اس کے برخلاف موجودہ سلطنتوں میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بہبودی عامہ کے خیال سے ازدواج میں روک پیدا ہو جاتی ہے[1] اس قسم کے قانون کی ضرورت سوسائٹی (نظم معاشرت) کی غیر تندرست حالت اور خاصکر بے املاک اور بے پیشہ جماعتوں کی سقیم حالی کی وجہ سے ہے۔ اس صورت میں قوم اپنے نفع کے خیال سے یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو لوگ عقد کرنا اور نئے خاندان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ثابت کریں کہ قوم یا سلطنت پر بار ڈالے بغیر وہ خود اپنے خاندان کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں مگر اس حد سے تجاوز کرنا اور مناکحت کو سلطنت کی تحکمانہ مرضی پر منحصر کرنا شخصی حقوق میں ایک ناواجب مداخلت ہے۔ مزید براں مناکحت پر قانونی بندشیں عائد کرنے سے حرامی بچوں کی تعداد گھٹنے کے بجائے

[1] ازدواج کے روکنے والے قوانین و رسوم کے متعلق مل کی پولیٹیکل اکانومی (اقتصادیات) کتاب دوم باب یازدہم دیکھنا چاہئے۔ (انگریزی مترجم)

اور بڑھتی ہے اور اس طرح ایسے بے گھرے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جن کی نہ پرورش
ٹھیک ہوتی ہے اور نہ اچھی تربیت۔ خاندان کے قیام اور بیوی کی مدد سے شوہر پر
عمدہ اخلاقی اثر پڑتا ہے اور اقتصادی نظر سے بھی سودمند ہو سکتا ہے اسلئے علی العموم
مناکحت کی کامل آزادی کو مستحسن سمجھنا چاہیے۔ اگر قانون سب کی بھلائی پیش نظر رکھتا
ہے تو اسے غربا کے لئے یہ امکان پیدا کرنا چاہیے کہ ایک غریب کسی کو اپنی غربت کا
رفیق اور اپنے بچوں کی جائز اور باحرمت ماں بنا سکے۔

سلطنت زن وشوہر کے خانگی تعلقات میں مداخلت نہیں کر سکتی لیکن نقصان رسیدہ
فریق کی شکایت پر حق ازدواج کے توڑنے والے کو سزا دے سکتی ہے اور سزا دینا چاہیے تاکہ
مناکحت کی پاکیزگی کی حمایت ہو سکے۔

افلاطون نے اپنی خیالی سلطنت کے محافظین کے لیے بیویوں کی جس قسم کی جماعت
عام کی تجویز کی ہے وہ ازدواج کی ذلت اور خاندان کی تباہی کا موجب ہے۔ بیویوں سے
فاحشہ عورتوں کی طرح کام لینا جس پر بعض صورتوں میں اسپارٹا میں عمل ہوتا تھا وہ
وحشت کی یادگار ہے، لیکن بیج کن اجتماعی فریق، انفرادی آزادی کی ترقی کے زعم میں
آزادئ جسم کی جس طرح طرفداری کر رہا ہے اس سے انسان کی اخلاقی آزادی کو کتوں کی
شہوانی آزادی سے پست تر بنا دیتا ہے۔

نکاح و طلاق

آخر میں ازدواج کے بقا اور طلاق کے حصر کے لئے سلطنت کا قانون بیان
کرنا ضروری ہے عیسوی زمانے کے قبل بھی عقد مناکحت کا انفساخ محض زن وشوہر کی
مرضی پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا، البتہ مختلف قانونی طریقوں سے شوہر کے لئے جائز تھا
کہ وہ اپنی بیوی کو علیحدہ کر دے لیکن ایسا کرنے کے لئے شوہر کو بالعموم کافی وجہ ظاہر
کرنی پڑتی تھی، اور جیسا کہ ہم قدیم ٹیوٹونی قوانین میں دیکھتے ہیں، اگر مرد ایسا نہ کر سکتا تو
اسے بھی سخت نقصانات برداشت کرنا پڑتے، برخلاف اس کے بیوی مناکحت کو
فسخ نہیں کر سکتی تھی، یہ قواعد جن پر رواج نے مہر تصدیق لگا دی تھی یہ ظاہر کرتے ہیں
کہ عام طور پر مناکحت زندگی بھر کا تعلق سمجھی جاتی تھی۔ روما نے جب التخیر کا اصول اختیار
کر کے آزاد مناکحت کو جانبین کی مرضی پر قابل فسخ قرار دیا تو اس نے اس خیال کی صاف
صاف خلاف ورزی کی۔ یہ امر ایک بڑی حد تک روما کے اخلاقی تنزل کا نتیجہ تھا اور پھر

اپنی باری میں اُس نے خود اخلاق کو خراب کیا۔

عیسویت نے اس معاملے میں ایک نیا اور زیادہ مکمل قانون شائع کیا۔ طلاق کے خلاف خود حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ اس قدر سخت تھے کہ اگرچہ ان سے قطعی طور پر کوئی نیا قانون نہیں پیدا ہوتا تھا، نہ کوئی پرانا قانون بدلتا تھا، پھر بھی ان الفاظ نے بالواسطہ عیسائی سلطنتوں کے قانونی تخیل پر اثر ڈالا۔ کیتھولک مذہب نے قانون ازدواج کا ایک سخت نظم قائم کیا اور باوجودیکہ حضرت عیسیٰؑ نے زناکاری کو صاف طور پر طلاق کی وجہ قرار دیا تھا اس پر بھی ایک وقت ایسا آیا کہ کیتھولک کلیسا نے طلاق کامل کی قطعاً ممانعت کردی تھی اور صرف ظاہری طلاق کی اجازت دی تھی اور وہ بھی صرف چند سخت وجوہات کی بنا پر۔ ازمنۂ وسطیٰ کی عیسوی سلطنتوں نے اس خیال کو یہاں تک قبول کیا کہ اُنھوں نے طلاق کے تمامی معاملات کو صرف مذہبی ہی عدالتوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت دی۔ زیادہ قریبی زمانے میں ان معاملات کے متعلق سلطنت نے خود کارروائی کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کیا ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے نے زناکاری اور معناً اُس کے مماثل وجوہ پر طلاق کو تسلیم کرلیا ہے۔ آخرالامر یہ کہ کچھ تو طبعی حقوق کے جدید خیال کا لحاظ کرکے اور کچھ شخصی آزادی کی غرض سے موجودہ زمانے کے قانون نے طلاق کے وجوہات کو وسعت دے دی اور اسے زیادہ آسان بنا دیا ہے مگر دو اصول بالعموم برقرار رکھے گئے ہیں۔

(۱) عقد کا انفساخ محض کسی ایک فریق کی مرضی یا جانبین کی تراضی باہمی سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لئے عدالت کی وساطت اور منظوری کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسی منظوری بلا کافی وجہ کے نہ دی جائے گی۔

کلیسا اس وجہ سے کہ وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی طبیعت کا مظہر ہے اس اصول کا حامی ہے کہ عقد کو ناقابل انفساخ سمجھنا چاہئے کیونکہ عقد کا منتہائے خیال یہی ہوسکتا ہے۔ سلطنت اس وجہ سے کہ وہ مقتضیات خارجی سے تعلق رکھتی ہے مجبور ہے کہ حالات واقعی کی کمزوریوں پر نظر کرے اور عقد میں جب حقیقی اتحاد و یکجہتی باقی نہ رہے تو ظاہری طور پر بھی اس فسخ کی اجازت دیدے۔ مگر جہاں تک قومی رسم و رواج اور شخصی ترقی کی حالت

اجازت دے اسے ناقابل انفساخ عقد کے اصول کو منتہائے خیال کے طور پر قائم رکھنا اور طلاق کو سخت قیود کے تابع کر دینا چاہیے ۔

بیسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(ب) عورتوں کا درجہ

عورتوں کے سیاسی حقوق

اس وقت تک تمام قوموں نے عورتوں کو اُسی ملّت و قوم سے متعلق سمجھا ہے جس سے ان کے شوہر یا باپ کا تعلق ہو، سلطنت سے ان کا تعلق بالواسطہ سمجھا گیا ہے اور وہ پورے حقوق کے ساتھ سلطنت کی کامل رکن نہیں قرار دی گئی ہیں۔ لیکن دور جدید نے ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے۔ اب سے بہت پہلے ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب کے وقت میں عورتوں نے بادشاہ کو ایک درخواست دی تھی کہ عورتوں کو سیاسی (یعنی رائے دہی وانتخاب کے) حقوق دیئے جائیں اگرچہ اُس زمانے کے فلسفی کوندورسے نے اس درخواست کی تائید کی تھی مگر مجلس قومی نے حقارت کے ساتھ اُسے مسترد کر دیا۔ ہمارے وقت میں بھی مختلف ممالک میں اس مطالبے پر زور دیا گیا ہے اور بالخصوص جان اسٹوارٹ مل نے اپنی تحریروں میں اور نیز پارلیمنٹ میں اُس کی حمایت کی ہے۔ فرانس میں ایڈوارڈ لابولیے نے بھی وہی روش اختیار کی ہے۔ امریکہ کے بعض ممالک میں کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کو سیاسی حقوق اور فرائض میں حصہ دیا جائے۔

مل

سلطنت میں عورتوں کو براہ راست شریک کرنے کے لئے مل نے جو خاص وجوہ پیش کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(الف) مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ انھیں عمدہ حکومت کا فائدہ حاصل ہو اور عمدہ حکومت ہی نیابت کا مقصود ہے۔

مگر لڑکوں کو بھی عمدہ حکومت کا فطری حق حاصل ہے۔ یعنی سلطنت پر ان کی حفاظت فرض ہے لیکن اس بنا پر کوئی یہ بحث نہیں پیش کرتا کہ انھیں بھی رائے دہی کا

حق حاصل ہونا چاہیے۔ عمدہ حکومت سے انتفاع حاصل کرنے کے حق میں یہ امر داخل نہیں ہے کہ حکومت میں شرکت یا اُس پر اقتدار بھی حاصل ہو۔ اول الذکر ایک ساکت حق ہے ثانی الذکر میں شخصی قابلیت کا ہونا شرط مقدم ہے۔

(ب) حقوق ذاتی اور حقوق عامہ میں ایک طرح کا خیرہ کن تضاد ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے، شخصی قانون کے ضمن میں عورتیں اولاً اپنے افعال میں محدود الاختیار تھیں اور وہ اپنے شوہروں کی تولیت میں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ عورتیں اپنی ذاتی ملک کا خود انتظام کر سکتی ہیں تو یہ تولیت اور نگرانی منسوخ قرار پا گئی اور مرد و عورت دونوں برابری کے درجے پر قائم ہو گئے لیکن دوسری طرف قانون عام میں یہ فرق بدستور برقرار ہے۔ ہم عورتوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ مردوں کے ساتھ محصول تو ادا کریں مگر انھیں اس حق کے دینے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان محصولات کی منظوری دیں یا اُن کے اخراجات کی نگرانی کریں۔ یہ نا انصافی ہے کہ جس قابلیت کو ہم اور جگہ تسلیم کر چکے ہیں یہاں اس سے انکار کر دیں اور جو مساوات خانگی زندگی میں مفید ثابت ہو چکی ہے اسے معاملات عامہ میں وسعت دینے سے باز رہیں۔

حکمران مستورات کی مثال سے اجتماع ضدین

(ج) ہمارے موجودہ قوانین میں ایک اور بھی تناقض ہے وہ یہ کہ بہت سی قومیں جو عورتوں کو سیاسی حقوق دینے سے انکار کرتی ہیں کبھی کبھی حکومت کا اعلیٰ سیاسی اقتدار ایک عورت کو تفویض کر دیتی ہیں اور اپنے تئیں اُس کی رعایا مانتی ہیں۔

البتہ یونانیوں اور رومیوں نے استثنا کے طور پر بھی کسی عورت کو اپنا فرمانروا نہیں بنایا۔ زنانہ مزاج شہنشاہ ہیلیوگیالوس جب اپنی ماں کو سینات میں لے آیا تو رومیوں کے خیال کو اس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اُس کے اور اُس کی ماں کے قتل کے بعد مجلس نے ایک حکم یہ نافذ کیا کہ جو شخص کسی عورت کو سینات میں لاوے گا وہ تحت الثریٰ کے دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا جاوے گا (یعنی قتل کر دیا جائے گا)۔ اکثر ٹیوٹونی قوموں نے بھی شاہی کو مردوں کے لئے محدود کر دیا تھا۔ ٹاسیٹس برطانیوں کے خصوصیات کے طور پر یہ ذکر کرتا ہے کہ وہ عورتوں کی حکومت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اہل لومبارڈی نے بھی اکثر عورتوں کے سلسلے سے شاہی جانشینی کو جائز رکھا۔ البتہ جدید تر زمانے میں عورتیں بکثرت تخت نشین ہوئی ہیں اور آخری چند صدیوں کے اندر انگلستان، آسٹریا، روس، پرتگال اور دوسرے

ممالک میں مختلف اشکال حکومت کے تحت میں عورتوں نے حکمرانی کی ہے۔

یہ عجیب و غریب استثنا کیوں ہے جب عورتیں کسی سیاسی حق کی مطلقاً مستحق نہیں ہیں تو پھر اُن کو سب سے بڑا سیاسی حق کیوں دیا جاتا ہے؟ کیا اس سے زیادہ قرین عقل یہ بات نہ ہوگی کہ ایک عورت سلطنت کے کسی ادنیٰ درجے کے عہدے پر کارگزار ہو یا مجلس میں اپنی رائے ظاہر کرے بجائے اس کے کہ وہ سلطنت کی ملکہ بنا دی جائے؟

اس کی توجیہہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ سلطنت کے اقتدار و اعزاز کی حیثیت ایک خاندانی ملک کی سی سمجھی گئی ہے اور عورت کے لئے تخت کی جانشینی کا وہی حق روا رکھا گیا ہے کہ جو اسے اپنے باپ کی جائداد پر حاصل ہے۔ سلطنت کی زمین جائداد یا جاگیر کے مثل قرار دی گئی ہے اور سلطنت کی وراثت بھی قانون شخصی کے اصول وراثت کے تابع رکھی گئی ہے۔ اس حق کی ابتدا زمانۂ قدامت میں ہوئی اور بعد کو اسے وسعت دی گئی اور زمانۂ جدید کی بہت سی سلطنتیں اگرچہ جاگیردارانہ سلطنت کے خیال سے آگے نکل گئی ہیں اور دوسرے معاملات میں قانون شخصی اور قانون عامہ میں قطعی فرق کرتی ہیں مگر قدیمی دستور کی اس یادگار کو ہنوز باقی رکھے ہوئے ہیں جس میں خاندانی رشتۂ خون کو سلطنت کی نوعیت اور عورت کے حق کار کنی سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

(د) چونکہ اکثر عورتیں خاندان میں رہتی ہیں وہ عملاً اکثر اپنے بزرگ خاندان کے ساتھ ہوں گی۔ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رائے دے گی اور لڑکیاں اپنے باپ کے ساتھ اس طرح بزرگان خاندان کو جنھیں سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہئے زیادہ سیاسی قوت حاصل ہو جائے گی ایسے باشندوں کے مقابلے میں جو نا کتخدا یا بے گھرے اور بیفکرے ہیں۔

(ہ) سیاسیات میں عورتوں کا اثر جو آج بھی سوسائٹی میں اور گھروں کے اندر نمایاں ہے اُس سے ہرگز مفر نہیں ہو سکتا مگر سردست یہ اثر غیر منتظم طریقے پر اور زیادہ تر خفیہ طور سے مرتب ہوتا ہے اور ہمیشہ اس صورت سے کہ عورتیں اُس کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتیں، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اس اثر کے لئے ایک صحیح راستہ نکال دیا جائے جس کی حفاظت کا بھی بند و بست کر دیا جائے اور عورتوں کو سلطنت کے کاموں میں شریک بنا کے اُن پر واضح کر دیا جائے کہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا اُس پر رائے ظاہر کرنے میں اُن پر ذمہ داریاں کیا ہیں۔

عورتوں کو رائے دہی کا حق دینے کی ان دلیلوں میں جو اوپر بیان ہوئیں غالباً چوتھی دلیل سب سے زیادہ قوی ہے مگر اس سے بھی زیادہ قوی دلیلیں دوسری جانب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

عورتوں کے حق رائے دہی کے مخالف دلائل۔

(الف) تمام متمدن قوموں کا کسی امر میں متحد الرواج ہونا ایک قطعی دلیل کی قوت تو بلا شبہ نہیں رکھتا لیکن یقیناً ہمکو ایک ایسے تغیر سے خبردار کرتا ہے جو نوع انسان کے مستقل حالات اور احساس کے منافی ہو۔

(ب) عورت کی فطرت۔ عورتوں کی تخلیق کا بڑا مقصد خانہ داری کا انصرام ہے اور اگر وہ سیاسی کاموں اور سیاسی جد و جہد میں زیادہ مشغول ہو گئیں تو اُن کے اصلی فرائض کی اہلیت ان سے جاتی رہے گی، زنانی خوبیوں کو اس سے نقصان پہنچے گا ماں اور بیوی کی حیثیت سے عورتوں کی محبت والفت خانہ داری کی مہارت، اخلاق کی لطیف حسیت و حلاوت یہ سب خوبیاں برباد جائیں گی اور اس کی تلافی کے لئے سیاسی قابلیت سے کچھ نفع نہ پہنچے گا۔

(ج) سلطنت کی مردانہ فطرت۔ سلطنت جو بحیثیت ایک قوم کے بالارادہ اپنا تعین اور اپنے اوپر حکمرانی کرتی ہے وہ اپنی مردانہ خصوصیت اور مردانہ روح کو زنانہ کمزوری اور تنک مزاجی کی آمیزش سے کمزور کرنا ہرگز گوارا نہ کرے گی۔

(د) یہ عظیم خطرہ کہ ملک کے سیاسی فریقوں کے مناقشوں میں (عورتوں کی ذکی الاحساس فطرت کے باعث) وجدانی جوش و خروش بڑھ جائے گا اور مردانہ شعور کی کارفرائی گھٹ جائے گی اور اُس پر ایک روک عائد ہو جائے گی۔ انفعالی قوتیں ترقی کر کے سلطنت کو نقصان پہنچائیں گی اور فاعلی قوتیں کمزور پڑ جائیں گی۔

پس اگرچہ ہم خاص خاص مستثنیات جیسے عورت کی تخت نشینی کے روادار ہو سکتے ہیں جب سے موزوں حالات اور متمدن ملک میں کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن عورتوں کو عام طور پر سیاسی حقوق دیدینا مہلک ثابت ہوگا۔

عورتوں کا بالواسطہ اثر

پس اگرچہ عورتیں معاملات عامہ میں براہ راست حصہ لینے سے اس طرح پر خارج رکھی گئی ہیں تاہم بہبود عامہ کے کاموں میں ان کے بالواسطہ اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے لیکن یہاں بھی اگر اس اثر کی رہبری سیاسی اغراض کے تابع ہوگی تو وہ آسانی سے ذلت کی حالت

میں آجائیگا۔ وہ صاف اور سود مند اسی وقت رہتا ہے جبتک اخلاقی اور مذہبی محرکات اس کے باعث ہوں۔ جو عورتیں سیاسیات میں مشہور رہی ہیں۔ اُنھوں نے بالعموم اپنی سلطنت اور اپنے دوستوں کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ان کی چالاکی اور زیرکی خطرناک سازش میں تبدیل ہوجاتی ہے اور جب ایکبار سیاسی نفرت، انتقام اور حرص کی آگ عورت کے سینے میں جلنے لگتی ہے تو پھر وہ بے طرح بھڑک اُٹھتی اور ایسی پھیل جاتی ہے کہ مرد بھی اُس کی جھپیٹ میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ بات کچھ فرمانرواؤں کی آشناؤں ہی تک محدود نہیں بلکہ اُن شریف بیویوں اور ماؤں تک پر صادق آتی ہے جنھوں نے دنیا کی تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ روما کی تاریخ، فرانسیسی انقلاب، فرانسیسی بادشاہوں کے دربار سب یہی قصہ دُہراتے ہیں۔

برخلاف اس کے مدبرین کو عورتوں کے اُس خاموش اثر سے اکثر نفع پہنچا ہے جس کا ذکر تاریخ میں کہیں شاذونادر ہی آتا ہے۔ بہت سے مدبروں کو اپنے گھروں میں وہ آسائش حاصل ہوتی ہے جس سے سیاسی زندگی کے شوروشر کی تلافی ہوجاتی ہے اور فرائض کے ادا کرنے کے لئے اُن میں از سر نو تازگی اور قوت پیدا کردیتی ہے۔ بارہا عورتوں کی نرم دلی نے مردوں کی سخت مزاجی کو معتدل کرکے اُن کو افراط و تفریط سے بچایا ہے اور اکثر اُن کے حزم نے مردوں کو خطاؤں سے باز رکھا اور اُن کے رواج و اخلاق کے احساس نے غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے اور عورتوں کی ہمت نے آڑے وقت میں مردوں کو بچایا ہے۔ عورت کی طاقت کسی وقت میں بھی ایسی قوی و معاون نہیں ہوتی جیسی خطرے اور مصیبت کے وقت میں ہوتی ہے۔ مردوں سے زیادہ صابر ہونے کی وجہ سے وہ ذلت اُٹھائے بغیر مصیبت کے برداشت کرنے میں مرد کی مدد کرسکتی ہے۔ عورت کی وفاشعاری مرد کو اپنے ملک پر قربان ہوجانیکے لئے آمادہ کرتی ہے اور اس کی جانب سے مرد کی جرأت و شجاعت کی ثنا و صفت مرد کو اس وصف کے حصول پر برانگیختہ کرتی ہے۔

اس لئے خصوصاً ٹیوٹونی قوموں کے قانون عامہ کی یہ ایک لطیف خصوصیت ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے سیاسی مرتبے میں شریک سمجھی جاتی ہے اس طرح عورت کو نظم سلطنت میں اپنی صحیح جگہ حاصل ہوجاتی ہے اور سیاسی حقوق کی محرومیت کا کافی و وافی معاوضہ ہوجاتا ہے۔

تعلیق

ریل (Riehl) نے اپنے اُس معاشرتی وسیاسی مقالے میں جو اُس نے "عورتوں"
پر لکھا تھا (اور جو جرمانی سہ ماہی رسالے" (Deutsche Viertet jahrssehoift)
میں ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا) اور اپنی کتاب "خاندان" (die Familie) میں دوسری
بہت سی لطیف رایوں کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات میں مرد عورت کے اختلاف تعلق کے
بابت بھی نہایت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے۔ کسان کی عورت کے عادات اور اُس کے اطوار زندگی
بہت کچھ کسان ہی کے عادات اور اطوار زندگی کے مانند ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ شہری عورت عادات و خصائل
میں اپنے مرد سے نسبتاً اتنی مماثل نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ سابق الذکر پر خانگی پابندیاں بھی زیادہ سختی کے ساتھ
عائد ہوتی ہیں جو آخر الذکر پر اُس حد تک نہیں ہوتیں اس لئے کہ وہ نسبتہً زیادہ آزاد ہوتی ہے۔
مجھے ریل کی اس رائے پر ضرور اعتراض ہے کہ وہ عورت کے لئے ایک بین فریقی خصوصیت
پیدا کر کے اُسے کنسرویٹو قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی فرقوں سے عورتوں کی دلچسپی
صرف بالواسطہ ہے اور یہ دلچسپی تمام فریقوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم فرقوں کی تقسیم روہمر کی رائے کے
موافق مردانہ اور زنانہ فرقوں میں کریں تو صاف ظاہر ہے کہ احرار و محافظین اول الذکر کے
تحت میں آئیں گے اور اصولی استبدادی ثانی الذکر کے تحت میں ہوں گے۔

اکیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(الف) اپنے ملک والے اور غیر ملک والے

افراد کا تعلق سلطنت سے کسی خاندان، طبقے یا جماعت کے رکن ہی ہونیکے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ سلطنت سے ان کو بلا واسطہ بھی تعلق ہے۔ زمانۂ حال کے سیاسی نظریے اور جدید نظامہائے حکومت اس بلا واسطہ تعلق پر زور دینے کی طرف مائل ہیں، اسلئے ہمیں امور ذیل پر خیال کرنا ہے۔

(۱) اہل ملک یعنی سلطنت یا قوم کے اراکین اور غیر ملک کے اشخاص کے درمیان فرق۔

(۲) قوم کے شہریوں اور اس کے دیگر اراکین کے درمیان فرق۔ شہری جماعت کے مختلف مدارج پر ہمیں اس وقت تک بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبتک کہ ہم نظام حکومت پر تفصیلی بحث نہ کریں۔ پہلا فرق زیادہ تر نسل پر منحصر ہے اور ابتدائے کار میں محض شخصی فرق ہے۔ وطن پذیری کے ملحوظات دوسرے درجے پر ہیں۔ انسان کا پہلا تعلق قوم سے ہے۔ زمین سے اس کا تعلق اتنا ضروری نہیں ہے۔

قدیم خیال یہ تھا کہ غیر ملک کے شخص کو کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہوتا اور اسے ایک معرا از حقوق ہستی سمجھنا چاہیے جبتک کہ وہ کسی خاص شخص کی حفاظت میں نہ آجائے۔ یونانی اگرچہ اس خیال پر قائم تھے مگر فی نفسہٖ یہ خیال قدیم تمدن پر وحشت کا ایک دھبا ہے۔

لہ روما کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خیال کا یہ منشا نہیں تھا کہ غیر ملکی غلام کے درجے پر

ٹیوٹونی اصول میں زیادہ انسانیت تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص اپنی قوم کے قانون کا پابند ہو۔ زمانۂ موجودہ کا قانون اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ غیر ملکی حقوق رکھتے ہیں اور اُن کے بموجب قانون اُن کی حفاظت کرتا ہے۔

کس امور سے کوئی شخص ملکی ہوتا ہے

(۱) ملکی کسے خیال کرنا چاہیے اور کوئی شخص کسی قوم کا رکن کس طرح ہو جاتا ہے؟ اس سوال کے مختلف جواب دیے جاتے ہیں۔ نسب اور توطن اس کے لازمی اجزا ہیں مگر ان عناصر کے باہم جمع ہونے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جن کو ہم مختلف نظاموں سے تعبیر کرتے ہیں اور اُن کی تفصیل یہ ہے:-

الف۔ مقام پیدائش۔

(الف) مقام پیدائش۔ ازمنۂ وسطیٰ کے آخری حصے میں یہ خاص خیال رائج تھا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ملک میں پیدا ہونا مولود کی خصوصیات کی بنا ہے۔ انگریزی قانون کا اصول ابھی تک یہی ہے جو فطری رعایا اور اجنبیوں میں امتیاز کرتا ہے۔ کسی انگریزی جہاز پر یا کسی انگریزی سفارت خانے میں پیدا ہونا انگلستان میں پیدا ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے لیکن اس اصول میں اب اس حد تک ترمیم روا رکھی گئی ہے کہ انگریزوں کی اولاد جو بیرونِ ملک میں پیدا ہو وہ بھی انگریزی شہریوں میں شمار ہوتی ہے اور حقوقِ توطن کا طریقہ حصول زیادہ آسان کر دیا گیا ہے۔[1] ممالک متحدہ امریکہ کا قانون بھی اسی اصول پر چل رہا ہے۔

ب۔ مقام سکونت۔

(ب) مقام سکونت[2] یہ شکل جو مملکتی اصول پر مبنی ہے وہ زمانۂ حال کے خیالات سے زیادہ موافقت رکھتی ہے کیونکہ یہ اتفاقیہ مقام پیدائش پر زور نہیں دیتی بلکہ یہ والدین کے مستقل مقام سکونت پر اور بعد کو خود اس شخص کے مقام سکونت پر زور دیتی ہے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تھے بلکہ اُس سے صرف یہ مقصود تھا کہ ان کے حقوق رومی سلطنت میں غیر محفوظ تھے۔ ہوسٹس (Hostis) کے اصلی معنی مہمان کے ہیں، اجنبی اور دشمن کے نہیں ہیں۔

[1] قانون [illegible] کے بموجب حقوقِ توطن کا حصول اور بھی آسان کر دیا گیا ہے۔

[2] ممالک متحدہ کے حدود کے اندر پیدا ہونے سے حقوقِ شہریت حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اہلِ ملک کی جو اولاد بیرونِ ملک میں پیدا ہو اُس کو بھی نسب کی بنا پر حقِ شہریت حاصل ہوتا ہے۔ اجنبیوں کو حقوقِ توطن حاصل کرنے کیلئے ممالک متحدہ میں آباد ہونا شرط لازمی ہے اور یہ صورت نہایت کثرت سے پیش آتی رہتی ہے۔

آباد کاری جس قدر آسان یا مشکل کر دی جائے اسی انداز ے سے اس میں بھی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ سابق زمانے میں آسٹریا کا کسی حد تک یہی اصول تھا اور منفرد جرمانی سلطنتوں کا بھی یہی اصول ہے، وہاں بھی وطنی حقوق کے شخصی عطا کی مختلف صورتوں سے اس میں اعتدال پیدا کر دیا گیا تھا۔

کمیون کی رکنیت

(ج) ان دونوں کے بین بین کمیون کی رکنیت کا سویزر لینڈی اصول ہے جو کینٹن (ضلع) اور سویزر لینڈ کی مشترکہ رکنیت کے لئے بنا کار ہے۔ کمیون میں حقوق کا انحصار جائے پیدائش یا سکونت پذیری پر نہیں ہے بلکہ ایسے والدین کی اولاد ہونے پر منحصر ہے جو کمیون کے رکن ہوں خواہ وہ اس سے باہر ہی کیوں نہ رہتے ہوں۔ یہ اصول اہل روما کے اس قدیم بلدی قانون سے غیر مشابہ نہیں ہے جس کی بنا بھی کسی خاص رکن بلدی کے سلسلۂ نسب میں ہونے پر منحصر تھی۔

سلطنت سے شخصی تعلق

(د) قومیت۔ جدید سلطنتیں بالعموم قومیت کو شخصی تعلق کی بنا پر تسلیم کرتی ہیں اور اسے مقام پیدائش یا سکونت پذیری پر خصوصیت کے ساتھ منحصر نہیں کرتیں بلکہ ارکین قوم کی اولاد ہونے یا شخصی طور پر سلطنت کی رکنیت میں قبول کئے جانے پر منحصر سمجھتی ہیں۔ جائے پیدائش و سکونت پذیری اس خیال کی تکمیل کرتی ہیں یہ اصول بالتخصیص فرانس[۵۱]، پرشیا[۵۲] اور جرمانی[۵۳] شہنشاہی میں رائج ہے، یہ طریقہ جدید سیاسی خیال سے بہت مطابقت رکھتا ہے

---

۵۱ آسٹریا کا مجموعۂ قوانین دفعہ ۲۹ "اجنبیوں کو ملکی حقوق صورہائے ذیل میں حاصل ہو سکتے ہیں، سرکاری ملازمت میں داخل ہوں، ایسا کاروبار اختیار کریں جس سے ملک میں معین طور پر رہنا لازمی ہو۔ مسلسل دس برس تک ملک میں سکونت پذیر رہے ہوں" لیکن ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کے قانون اساسی کی دفعہ ۳ کے بموجب اجنبی اس وقت تک سرکاری ملازمت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ انھوں نے حقوق شہریت حاصل نہ کر لئے ہوں۔ دوسرے شرائط یکم مئی ۱۸۳۳ء کے شہنشاہی فرمان اور ۲۷ اپریل ۱۸۷۰ء کے فیصلۂ عدالت کی رو سے برطرف کر دئے گئے۔

۵۲ قانون مجریہ ۳۱ دسمبر ۱۸۴۲ء کے بموجب پرشیا میں قومیت بالتخصیص نسب پر منحصر ہے اہل پروشیا کے جائز لڑکے پروشیا کے ملکی شہری شمار ہوتے ہیں خواہ وہ باہر کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں۔ توطن پذیری کے لئے خاص شرط سکونت ہے۔

۵۳ جرمانی شہنشاہی کی رکنیت کے لئے شرط مقدم شہنشاہی کے کسی صوبے میں حقوق شہریت کا حاصل ہونا ہے

جو قوم سے شخصی تعلق کو تخیل سلطنت کا بنیادی اصول سمجھتا ہے۔

مگر مختلف طریقے ایک دوسرے کے قریب پہنچتے اور اُس کی طرف مائل ہیں۔ نسب، مقام پیدائش، مقام سکونت، توطن، مناکحت جواز نسب سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ حقوق شہریت کے شرائط پر اثر ڈالتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کسی سلطنت کی رکنیت ذیل کے طریقوں سے حاصل ہوتی ہے:-

(۱) پیدائش۔ جائز لڑکوں کی حالت میں باپ کو سلطنت کا رکن ہونا چاہیے ناجائز لڑکوں کی حالت میں ماں کو۔ رکنیت سلطنت کے لیے سب سے زیادہ عام بنا یہی ہے لاوارث بچے اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں جس میں وہ پائے جائیں۔

(۲) ازدواج (مناکحت) غیر ملکی بیوی اپنے شوہر کے خاندان و قوم کی رکن ہو جاتی ہے۔

(۳) حقوق توطن اس ذریعے سے ایک اجنبی شخص اپنی خواہش پر رکن سلطنت بنایا جاسکتا ہے لیکن مختلف ممالک میں اس کے شرائط مختلف ہیں بعض ممالک داخلہ ملک کی ترغیب دیتے ہیں اور بعض اس سے کنارہ ہیں۔ بعض ملکوں میں اطلاع یا بلا اطلاع کے مستقل سکونت اختیار کر لینا ہی کافی ہے، دوسری جگہ حکومت بلکہ مجلس تشریعی کے خاص حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں سرکاری عہدے پر تقرر کے ساتھ ہی حقوق ملکی بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ بعض سلطنتیں چاہتی ہیں کہ غیر ملکی اپنی قدیمی سلطنت کے حقوق سے بالاعلان بری کروئے جائیں یا کم از کم وہ خود علانیہ طور پر اس تعلق کو ترک کر دیں بعض سلطنتیں اس شرط کی پروا نہیں کرتیں۔

سلطنت کی رکنیت کن امور سے ختم ہو جاتی ہے۔

(۴) کسی شخص کا تعلق سلطنت سے حالات ذیل میں منقطع ہو جاتا ہے۔

(۱) موت۔ اکثر لوگ اپنی زندگی بھر اُسی ایک سلطنت کے رکن رہتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور اس کا انحصار بیشتر نسل یا توطن پذیری پر ہے۔ جرمانی قانون مجریہ یکم جون ۱۸۷۰ء کی دفعہ احسب ذیل ہے غیر ملک میں پیدا ہونے کی صورت میں (شمالی) جرمانی باپ کی جائز اولاد اور (شمالی) جرمانی ماں کی ناجائز اولاد دونوں جرمانی شمار ہوں گی۔

(۲) عقد - جو عورت غیر ملکی شخص سے نکاح کرکے اس کی قومیت کو قبول کرلیتی ہے وہ اپنی سابقہ قومیت کو زائل کردیتی ہے۔

(۳) قوم کی رکنیت سے خارج کردیا جانا۔ چونکہ اب یہ رکنیت بالعموم ایک شخصی حق سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ محض کسی غیر ملک میں آباد ہوجانے بلکہ مستقل اقامت اختیار کرلینے سے بھی زائل نہیں ہوتی۔ یہ تعلق اس صورت سے منقطع ہوتا ہے کہ اس حق کا رکھنے والا شخص اپنی طرف سے اپنے حق سے دست بردار ہوجائے اور سلطنت بھی اپنی جانب سے اُسے سبکدوش کردے۔ اسی سے اس تعلق کی باہمی کیفیت ظاہر ہوتی ہے لیکن زمانۂ حال کی بیشتر سلطنتیں اس بات کو اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھتیں کہ کسی شخص کو جو قومیت سے دست برداری کا خواہاں ہو اس فعل سے روکیں۔ اس طرح پر شخصی آزادی کا لحاظ کرکے وہ آزاد دست برداری کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں مثلاً ایسے ترک وطن کی حالت میں جس میں واپسی کا خیال نہ ہو اس شخص کے فعل سے ترک قومیت مراد لی جاتی ہے[۱]۔

انگریزی قانون

آزادانہ ترک وطن کے حق کے تسلیم کرنے میں انگریزی قانون اگرچہ سب سے اول تھا مگر اس نے اس جاگیردارانہ نظریہ کو ہمیشہ برقرار رکھا کہ بادشاہ کی مرضی کے بغیر رعایا اس کی اطاعت کو ترک نہیں کرسکتی اس لئے انگریزی رعایا محض ترک وطن سے اپنی اس حیثیت سے خارج نہیں ہوتی۔

[۱] فرانسیسی ضابطۂ دیوانی، دفعہ ۱۷: "ایک فرانسیسی اگر کسی غیر ملک میں جا بسے اور واپسی کا ارادہ اُس کے افعال سے نہ ظاہر ہوتا ہو تو وہ اپنی حیثیت کو کھو دیتا ہے۔ تجارتی ضروریات سے غیر ملک میں بسنے سے یہ نہ تصور کیا جائے گا کہ وہ واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آسٹروی قانون اساسی مجریہ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء دفعہ ۴۔ ترک وطن کی آزادی صرف فوجی خدمت کے فرض سے محدود ہے اور ۱۸۵۰ء کا پروسی نظام حکومت بھی اس کے مثل ہے (دفعہ ۱۱) پروسی قانون اور بھی سخت تھا۔ جرمانی شہنشاہی کے قانون مجریہ یکم جون ۱۸۷۰ء کے بموجب دس برس باہر رہنے سے ملک اور شہنشاہی کی رکنیت زائل ہوجاتی ہے مگر اس زمانے کا حساب اُس وقت سے ہوتا ہے جب پاسپورٹ کی میعاد ختم ہوجائے لیکن کسی قونصل خانے میں اندراج حاضری سے اُس کی تجدید ہوسکتی ہے (دفعہ ۲۱)

فرانسیسی قانون

کسی غیر ملک میں توطن اختیار کرلینے یا فرانسیسی حکومت کی منظوری کے[1] بغیر کسی غیر ملکی ملازمت میں داخل ہوجانے کو فرانسیسی قانون ترک وطن کے برابر سمجھتا ہے یہ طریقہ دست برداری کے اصول سے تجاوز کرجانے کا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی غیر ملکی حکومت سے تعلق پیدا کرے مگر خود اپنی سلطنت سے قطع تعلق کی اسے مطلقاً خواہش نہ ہو تاہم فرانس کے قانون نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ واپس آنے کی صورت میں اُس کے لئے حقوق سابقہ کا حاصل کرلینا آسان ہو۔

دو سلطنتوں میں وطنی حقوق

یہ ناممکن نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کو ایک ساتھ دو سلطنتوں میں وطنی حقوق حاصل ہوں[2] اور موجودہ حالات فی الواقع اُس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ جب شاذ و نادر فرائض میں تصادم ہوجاتا ہے تو ان دونوں کو پورا کرنا مشکل ہوجاتا ہے یہ اصول ہمیشہ محفوظ اصول نہیں سمجھا جاتا کہ سابق حق کو تقدم حاصل ہونا چاہیے خاصکر ایسی صورت میں کہ وہ حق معطل ہو اور مابعد کا حق عملاً موجود ہو۔ ان صورتوں میں پہلا فرض یعنی فوجی خدمت اسی ملک کے لئے واجب ہے جس میں وہ شخص رہتا[3] ہے اس سے بالطبع یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو سلطنت کسی غیر ملکی کو حق توطن عطا کرتی ہے یا اسے کسی عہدے پر مامور کرتی ہے وہ مجاز ہوتی ہے کہ اس سے حقوق سابقہ کے ترک کا مطالبہ کرے یا انھیں بحال خود

---

[1] فرانسیسی ضابطہ دیوانی دفعہ (۱۷)

[2] ایک شخص دو سلطنتوں کی نیابت میں ایک ہی وقت میں شریک ہوسکتا ہے۔ بہت سے جرمانی روسا دو دو تین تین سلطنتوں کے دیوان اعلیٰ کے رکن ہیں اور ان سب میں ان کی جاگیریں واقع ہیں اور انھوں نے ہر ایک کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے۔ یہ خیال کرنا بالکل ناممکن نہیں ہے کہ کسی شخص کی دو مختلف سکونتیں ہوں مثلاً ایک شہر میں ایک دیہات میں یا ایک کاروباری شخص کی حیثیت سے اور ایک خانگی شخص کی حیثیت سے فون بار (Von Bar) اپنی تصنیف میں قومی شخصی و فوجداری قانون صفحہ (۸۵) میں ان ساری امکانی صورتوں سے انکار کرتا ہے لیکن اگر واقعی حالات پر نظر کیجئے تو ثابت ہوجائیگا کہ واقعات نظریئے سے زیادہ وسیع ہیں کسی شخص کو یہ اجازت دینا کہ وہ نئی سلطنت کا رکن ہوجائے بغیر اس کے کہ اپنی سلطنت سے تعلق منقطع کرے ترک وطن کے آزادانہ حق کا محدود کرنا نہیں ہے۔

[3] بلیک اسٹون اپنی تصنیف میں جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے لکھتا ہے کہ میرے ذاتی تجربے نے مجھے

رہنے دے۔[۵۱]

تصادم فرائض

(۳۱) چونکہ قومی حقوق کے حاصل کرنے اور اُن کے زائل ہونے کے شرائط مختلف ملکوں میں مختلف ہیں اس لئے جب دو سلطنتیں کسی ایک ہی شخص کے اپنی رعایا ہونے کی دعویدار اور اس کے خدمات کی خواہاں ہوں یا دونوں اُسے قبول کرنے سے انکار کردیں تو ایک تصادم پیدا ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے تصادم رفع کرنے کے لئے امریکی سفیر بنکرافٹ کی کوشش سے شمالی جرمانی مشترکہت اور ممالک متحدہ امریکہ میں ایک معاہدہ ۲۲ فروری ۱۸۶۸ء کو طے پایا تھا۔ اس معاہدے میں یہ قرار دیا گیا کہ جانبین میں سے کسی سلطنت میں پانچ برس کا توطن سابقہ تعلق کو منقطع کردے گا اور دونوں سلطنتیں اُسے تسلیم کریں گی۔ یہی اصول انگلستان اور ممالک متحدہ کے درمیان ۱۸۶۹ء میں قرار پایا اور اب یہ اصول عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔

ملکی شخص کی حیثیت (الف) شخصی حقوق۔

(۳۲) کسی سلطنت کی رکنیت کے نتائج کا تعلق ایک حد تک شخصی قانون اور ایک حد تک عام قانون سے ہے۔ شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی شخص کے درمیان امتیاز اس وقت کے بہ نسبت پہلے بہت زیادہ تھا۔ اس زمانے میں شخصی اور عام قانون کے حدود زیادہ قطعی طور پر معین ہوگئے ہیں اور اس لئے شخصی قانون میں قومیت کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ یہ فی الاصل ایک سیاسی خیال ہے۔ علی العموم شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی دونوں کے لئے کامل حقوق کے انتفاع کا حق سمجھا جاتا ہے۔[۵۲]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یہ سکھلایا ہے کہ ان حالات میں کسی شخص کے اصلی وطن کو اس خدمات پر پہلا دعویٰ ہے۔

سلہ۵ بویریا کا فرمان دفعہ ۶۔ اتحاد سویزرلینڈ کا نظام حکومت (مجریہ ۱۸۷۴ء دفعہ ۴۴) اس کے خلاف ہے۔ کوئی صوبہ غیر ملکیوں کو ملکی حقوق نہیں دے سکتا جبتک کہ وہ اپنے سابقہ حقوق کو ترک نہ کردیں اس وقت کے قانون کے لئے سویزرلینڈ کا قانون اتحادی مجریہ ۳ جولائی ۱۸۷۶ء دیکھنا چاہئے۔

سلہ۵۲ یہ وہی قانون تمہید دفعہ ۴۳۔ غیر سلطنتوں کی رعایا جو ملک میں رہتی یا کاروبار کرتی ہے اس کا مقدمہ بھی قوانین محولۂ بالا کی رو سے ہوگا۔ ضابطہ آسٹروی دفعہ ۳۳ غیر ملکیوں کو اہل ملک کے برابر ملکی حقوق حاصل ہیں اور اس پر ویسی ہی ذمہ داریاں عائد ہیں بجز ان حالتوں کے جہاں سلطنت کی رکنیت صریحاً مشروط ہے۔ ضابطہ دیوانی دفعہ ۱۳

قدیمی اصول کہ غیر ملکی زمین کی ملکیت نہیں حاصل کر سکتے اب صرف مثنیات میں شمار ہوتا ہے[1] بعض بعض پیشوں کے اور خصوصاً کسی دستکاری کے مستقلاً اختیار کرنے بلکہ خوردہ فروشی کیلئے بھی غیر ملکوں پر عام طور سے زیادہ بندشیں عائد ہیں[2]۔

دوسری جانب غیر ملکیوں کا قانون (Jus albinagu) ہے جس کی روسے ملک کا بادشاہ غیر ملکیوں کی جائداد کا وارث ہوجاتا تھا اور جو وراثت بیرون ملک میں جاتی تھی ان پر محصول لگایا جاتا تھا۔ اب تقریباً ہر جگہ یہ طریقہ ناپید ہوگیا ہے اور اس طرح ترک وطن کی آزادی عام طور پر تسلیم کی گئی ہے[3]۔

(ب حقوق عامہ۔)

مگر قانون عامہ کی حد میں ملکی اور غیر ملکی کا فرق پوری قوت کے ساتھ باقی ہے خاص عطا کردہ حالات کے سوا حقوق ذیل صرف ملکیوں کے لئے مخصوص ہیں۔

(الف) ملک میں دائمی قیام کا حق[4] کوئی ملکی شخص کسی غیر ملکی کے حوالے نہیں کیا جاسکتا اور نہ سخت سیاسی وجوہ کے بغیر جلا وطن کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] انگلستان کے متعلق بلیکسٹن کی تصنیف شرح جلد اول باب دہم دیکھنا چاہئے ۱۸۷۰ء کے بعد سے غیر ملکی جائداد غیر منقولہ حاصل کرسکتے ہیں قانون موضوعہ (Statute) ۳۳ وکٹوریا باب ۱۴ سوئیزرلینڈ کے بعض عمومی صوبوں میں یہ ممانعت ہنوز نافذ ہے۔

[2] جبتک گلڈ (انجمن دستکاران) کا وجود قائم تھا یہ روک حق بجانب تھی مگر ان انجمنوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی اکثر یہ حال تھا کہ صرف ملکیوں کو ان پیشوں کے کرنے کی اجازت تھی۔ ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی قانون اساسی دفعہ ۱۳ کی روسے پیشے اور حرفت کی آزادی شہریوں ہی کے حق میں محفوظ کی گئی۔ لیکن فرانسیسی طرز عمل غیر ملکیوں کے حق میں بھی پیشے کی آزادی کو روا رکھا۔

[3] متفقینت سوئیزرلینڈ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۶۲ کی روسے غیر ملکی سلطنتوں میں آباد ہونیکی ذمہ داری عوض معاوضہ کی شرط پر کی جاتی تھی۔ دیکھو جرمانی مشترکیت کا قانون مجریہ ۱۸۱۵ء اور تجویز مجریہ ۱۸۱۷ء یکم نومبر ۱۸۶۷ء کے جرمانی شہنشاہی قانون نے جرمانی سلطنتوں کے مابین نقل وطن کی کامل آزادی عطا کی۔ اب یہ آزادی عام طور پر غیر ملکیوں کے لئے بھی وسیع کردی گئی ہے۔

[4] سوئیزرلینڈ کا ۱۸۷۴ء منقحی نظام سلطنت دفعہ ۷۰ مشترکیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مملکت سے ایسے غیر ملکیوں کو خارج کردے جو اس کی حفاظت کے لئے خطرناک ہوں۔

(ب) اپنی سلطنت کے زیر حفاظت ہونے کا حق خواہ وہ ملک سے باہر ہی کیوں نہ رہتا ہو ۔

(ج) رائے دہی اور ایک کامل شہری کے حقوق کو کام میں لانے کا اختیار ۔

(د) سرکاری خدمت حاصل کرنے کا حق[1]۔

(ہ) بعض وقت اس قسم کے عام سیاسی حقوق مثلاً انجمن یا جتھا قائم کرنے، عرضداشت پیش کرنے یا آزادانہ اخبار نویسی کے حقوق ملکیت کے حقوق میں شامل سمجھے جاتے ہیں ۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر ملکی ان حقوق سے کلیتہً محروم کردیئے گئے ہیں بلکہ وہ ذاتی طور پر یہ حقوق نہیں رکھتے اور صرف سلطنت متعلقہ کی مراعات یا رواداری کی بنا پر ان سے انتفاع حاصل کرسکتے ہیں ۔

---

[1] بویریا کا ۱۸۱۸ء کا فرمان دفعہ ۲ ۔ کوئی غیر ملکی اعلیٰ شاہی عہدے، ملکی ملازمت کے خدمات، قوم کے اعلیٰ عہدے، کلیسائی عہدے یا وظائف حاصل نہیں کرسکتا اور نہ بویریا کے شہری ہونے کے حقوق سے کام لے سکتا ہے ۔

بائیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(۳) سلطنت کے شہری

کامل شہریت

قوم اور ملک کے افراد کے عام مجمع سے سلطنت کے شہریوں کی وہ بلند رتبہ جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس لقب کی پوری مستحق ہے۔ سلطنت کے شہری اپنی شہریت کی حیثیت سے سیاسی حقوق رکھتے ہیں، اور خاص کر مجلس ملی میں نمائندہ کو منتخب کرنے کا حق۔ اس مفہوم کے لحاظ سے سلطنت کی شہریت کے حق کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے قوم کی رکنیت لیکن مزید براں اس میں کامل سیاسی حقوق بھی داخل ہیں۔ پس یہ سلطنت کے ساتھ افراد کے تعلق کا مکمل اظہار ہے۔

قدیم یونانی اور قدیم رومی سلطنتوں میں اس کا انحصار حکمراں شہر (یعنی صدر شہر) کی شہریت کے حقوق رکھنے پر تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں حریت کے رتبے پر اور ازمنۂ وسطیٰ کے اخیر دور میں ذی امتیاز طبقے کے حقوق اور ارضی ملک رکھنے پر۔ موجودہ زمانے کی سلطنت کی رو سے یہ وصف اکثر ملکوں میں ایک بڑی حد تک، قوم کی رکنیت کے مرادف ہو گیا ہے۔

اس کے حدود۔

اب عام طور پر سلطنت کی شہریت کے حدود حسب ذیل تسلیم کئے جاتے ہیں:۔

(۱) عورتیں اس سے خارج ہیں۔ سیاسیات مردوں کا کام ہے اس لئے سیاسی حقوق بھی مردوں ہی کے لئے ہیں۔ (دیکھو اسی مقالہ کا بیسواں باب)

(۲) نابالغ اس وجہ سے خارج ہیں کہ سیاسی حقوق کے عملدرآمد کے لئے پختہ رائے کی ضرورت ہے۔ زمانۂ حال کی بعض سلطنتوں میں سیاسی بلوغ کی عمر شخصی قانون کی عمر بلوغ سے مختلف مقرر کی گئی ہے سیاسی اغراض کے لئے سن تمیز کو بڑھا کر مقرر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے

کہ روزانہ زندگی کے معمولی معاملات کا صاف طور پر سمجھ لینا زیادہ آسان ہے بہ نسبت سیاسی معاملات کے جن میں ایک یہی امر بہت مشکل ہے کہ انتخاب کے وقت امیدواروں کی سیاسی قابلیت کا محاکمہ کیا جائے۔ فرانس، انگلستان، شمالی امریکہ اور اطالیا میں سیاسی اور قانونی حد بلوغ دونوں اکیس۲۱ برس مقرر ہیں اور بویریا کے مانند بعض جرمانی سلطنتوں میں بھی ایسا ہی ہے لیکن پروشیا، جرمانی شہنشاہی اسپین اور پرتگال وغیرہ میں رائے وہی کے لئے پچیس۲۵ برس کی حد مقرر ہے۔ آسٹریا میں چوبیس برس سویزرلینڈ میں بعض صوبے، سیاسی حد بلوغ تمدنی حد سے قبل مقرر کرتے ہیں یعنی بالعموم بیس برس پورے ہونے پر ؎ ۵

(۳) بہت سے لوگ ایسے خارج کئے جاتے ہیں جن کی ملکی حیثیت خراب ہو گئی یا ضائع ہو گئی ہے مثلاً سزا یافتہ یا جو لوگ فضول خرچ قرار دیئے گئے ہوں، یا دوالئے یا جن لوگوں کو خیرات خانے سے امداد ملتی ہے۔

بعض سلطنتوں میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے مزید اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں:۔

خود مختاری (۴) ایک حد تک ظاہری خود مختاری جس کی مختلف سلطنتوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں قدیمی جرمانی قانون میں زمین کا یا علیحدہ گھر کا ہونا ضروری تھا۔ بعد کے جرمانی قانون میں آزادانہ پیشے یا کسی کمیون کی عاملانہ رکنیت۔ پہلا خیال انگلستان اور شمالی امریکہ کے بعض ممالک میں پھیلا ہے اور دوسرے خیال کو جدید جرمانی

؎۵ سویزرلینڈ کا قانون متفقی ۱۸۴۷ء دفعہ ۴۔ "بیس برس سے زائد عمر والا سویزرلینڈ کا ہر باشندہ رائے دہی کا حق رکھتا ہے" زیورچ کا قانون اساسی (۱۸۶۹ء) سیاسی حد بلوغ بیس برس مقرر کرتا ہے حالانکہ وہاں کے ملکی قانون کی رو سے حد بلوغ چوبیس۲۴ برس ہے۔

؎۶ قانون اصلاح ۱۸۶۷ء کے بموجب قصبات کی رائے دہندگی پیشے اور ادائے ابواب (محصولات) پر منحصر ہے۔ ۱۸۸۴ء کے قانون رائے دہی نے ضلع کی رائے دہی کو قصبہ کی رائے دہی سے ملا دیا ہے اور "خدمتی رائے دہی" کا اضافہ کیا ہے۔

نظامہائے سلطنت[عہ] میں جگہ ملی ہے۔ یہ قاعدہ تمام اجرتی ملازموں کو اور اکثر کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کم از کم ان میں سے ادنیٰ درجہ والوں کو اور اکثر مزدوری پیشہ دستکاروں کو خارج کر دیتا ہے۔ بعض جدید سلطنتوں نے عام حق رائے دہی کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اس شرط کو نرم کر دیا ہے یا بالکل ہی منسوخ کر دیا ہے۔ سوئیزرلینڈ کے نظامہائے حکومت کا ۱۸۳۰ء کے بعد سے یہی حال ہے ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۰ء کی فرانسیسی جمہوریتوں کا بھی یہی حال تھا۔ علیٰ ہذا فرانسیسی شاہی ۱۸۶۱ء کی شمالی جرمانی شرکت ۱۸۶۷ء کی جرمانی شہنشاہی اور ۱۸۶۴ء کا یونانی نظام حکومت سب اسی جانب مائل ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ بھی اسی رجحان کی متابعت کی کوشش میں ہیں کہ ہر شخص کو انتخاب کا حق ملے۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے کا عام میلان اسی عمومیت کی طرف ہے۔

ملکیت

۵۔ بعض سلطنتوں میں ملکی حقوق ایک خاص مقدار جائداد کی ملکیت پر مشروط ہوتے ہیں۔ یہ بالکل بجا ہے کہ اختیار رائے دہی کی تقسیم میں جائداد کو ایک اہم جز قرار دینا چاہیے مگر کسی شخص کو محض ناکافی جائداد کی بنا پر حقوق شہریت سے محروم کرنا سلطنت کے خیال کی بیحرمتی کرنا ہے، بشرطیکہ وہ شخص اخلاقی و ذہنی طور پر معاملات عامہ میں حصہ لینے کی قابلیت اور خود مختارانہ حیثیت رکھتا ہو۔ اگر ملکیت سے مراد آمدنی یا محاصل کا ذریعہ ہے اور حد ایک معمولی گذر اوقات پر مقرر کی جائے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر اس صورت میں یہ شرط سابقہ وصف کے ہم معنی ہو جائے گی۔ ممالک متحدہ امریکہ، بویریا (۱۸۴۸ء) اور کسی حد تک آسٹریا اور پروشیا کے نظامات حکومت کے نتیجے ایک ہی ہیں۔ ان سب جگہوں میں رائے دہی کا حق بلا واسطہ ادائی محصول پر ہے۔

مذہب

۶۔ کچھ زمانہ قبل تک مسیحی سلطنتوں میں نصرانیت کا اقرار بھی ضروری تھا، یہودیوں اور مسلمانوں، اور دوسرے مذہب والوں سے اگرچہ رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا مگر

عہ۔ بویریا کا نظام سلطنت (۱۸۱۸ء دفعہ ۸) ملکی حقوق کے لئے نہ صرف اصلی باشندہ ملک ہونے بلکہ سلطنت میں رہنے کا بھی خواہاں ہے، یہ سکونت خواہ محصول جائداد، سامان وغیرہ کے قبضے کیوجہ سے ہو، یا قابل المحصول تجارت کا کام کرنے کے باعث ہو، یا سرکاری عہدے کی خدمت کیوجہ سے ہو۔ آسٹریا کا شہنشاہی قانون انتخاب (۲ اپریل ۱۸۶۳ء دفعہ ۹) کسی جماعت عامہ کی رکنیت کو آزادی کے ہم معنی خیال کرتا ہے۔

* اصل جرمانی کتاب (بلنچلی) میں ۱۸۱۸ء ہے، اور انگریزی ترجمہ میں ۱۸۶۳ء، غالباً ۱۸۱۸ء ہی صحیح ہوگا (مترجم)

سیاسی حقوق سے وہ خارج تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مذہب و قانون کلیسا و سلطنت ایک دوسرے سے قریبی طور پر وابستہ تھے، مذہبی سوسائٹی سے خارج ہونا سیاسی سوسائٹی سے خارج ہونے کے ہم معنی تھا۔ غیر مذہب والے زیادہ سے زیادہ جس امر کی امید کر سکتے تھے وہ رواداری تھی۔ خود امت مسیحی کے اندر اختلاف عقاید سیاسی نتائج پیدا کرتا تھا۔ بعض ملکوں میں صرف کیتھولکوں اور بعض میں صرف پروٹسٹنٹوں کو پورے حقوق حاصل تھے۔ ویسٹ فیلیا کی صلح نے جرمانیا میں ملکی حقوق کے لحاظ سے کیتھولیکوں اور پروٹسٹنٹوں کو ایک حد پر کر دیا، مگر سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایسا نہیں ہوا۔ ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت نے جرمانیا کے مسلمہ مذہبی فرقوں کے لئے سیاسی مساوات قائم کر دی ان میں کیتھولک، پیروان لوتھر اور پیروان کالوین داخل تھے مگر دو جماعتوں کی حیثیت کو غیر تیقن چھوڑ دیا عله

زمانۂ حال کی سلطنتوں کا قطعی میلان یہ ہے کہ سیاسی حقوق مذہبی اعتقاد سے کلیۃً آزاد کر دئے جائیں، اس کا باعث محض مذہبی لاپروائی نہیں ہے، چنانچہ ۱۷۸۹ء کی امریکی کانگریس نے جب کسی ایسے قانون کے منظور کرنے کو روک دیا جس کی رو سے کسی ایک مذہب کو غلبہ حاصل ہو تو اس کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ مسیحیت کی طاقت سے لاپروا ہے، نہ اس کا یہ ارادہ تھا کہ عیسوی تنظیمات کو مدد دینے یا ان کی حفاظت کرنے سے سلطنت کو باز رکھے۔

مذہبی آزادی

موجودہ اصول کی بنیاد فی الحقیقت اس خیال پر ہے کہ مذہبی اعتقاد کا تعلق تمام و کمال دل سے ہے اور وہ جبر کی حد سے خارج ہے، اس لئے مسیحی اعتقاد سے ہٹنے کی وجہ سے کسی قسم کی سیاسی ناقابلیت نہ عاید کرنا چاہئے۔ اہل امریکہ نے مذہب اور سلطنت کے مابین ایک قطعی تمیز قائم کی اور وہ اس طرف مائل تھے کہ دونوں کو آزاد چھوڑ دیں اور اسی خیال سے انھوں نے مذہبی بنا پر ان لوگوں کو سیاسی حقوق دینے سے بھی انکار نہیں کیا جو اور اعتبار سے اس کی اہلیت رکھتے تھے لیکن دوسری جانب انہیں اصول کا فرانسیسی انقلاب میں اختیار کیا جانا یقیناً آزادی کی رعایت پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس وقت کی متواتر مذہبی ستم شعاریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بنا زمانے کی فنا کن خیال پرستی تھی جو ہمہ زرہ گردی سے شروع

عله قانونی مشترکیت جرمانی دفعہ ۱۱۶ "جرمانی مشترکیت کے ممالک میں عیسوی مذہب کے اندر اختلاف عقائد کی وجہ سے ملکی یا سیاسی حقوق میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جائے گا۔"

ہوکر مسیحیت کی وحشیانہ نفرت پر ختم ہوئی عہ

جرمانیا میں بھی اس اصول کا قطعی ظہور ۱۸۴۸ء میں ہوا اور اب وہ مسلم سمجھا جاتا ہے۔ شہریوں کے عام حقوق کی بابت آسٹریا کا قانون اساسی ۱۸۴۹ء (دفعہ ۱) اور ۲۱۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کا قانون نیز پروشیا کا ۱۸۵۰ء والا نظام سلطنت اس شہنشاہی نظام سلطنت کے مسودے سے متفق ہیں جو فرانک فورٹ اور برلن میں تیار ہوا تھا اور جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے انتفاع کو مذہبی اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں دانشمندانہ طور پر یہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا کہ "مذہبی اعتقاد ملکی فرائض کی بجاآوری کے لئے عذر نہیں ہو سکتا"

شمالی جرمانی شرکت کے ۳۔ جولائی ۱۸۶۹ء والے قانون میں (جو اب شہنشاہی کا قانون ہے) یہ قرار دیا گیا ہے کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے جس قدر قیود اختلاف عقائد پر مبنی ہیں وہ سب اس قانون کے ذریعہ سے منسوخ کئے جاتے ہیں خاصکر جماعتی اور قومی نیابت کی شرکت اور سرکاری عہدوں کا تقرر مذہبی اعتقاد سے آزاد ہوگا۔

اس سے ان ممالک میں یہودیوں کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ جرمانیا میں سیاسی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم تھے مگر اب مذہب کی بنا پر ان کے لئے ان حقوق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مذہبی آزادی ابھی کاملاً حاصل نہیں ہوئی ہے

لیکن یہ نیا اصول ابھی عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوپ کے ماننے والوں کی طرف سے برابر ملعون ٹھہرایا جا رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان کیتھولکی سلطنتوں میں جہاں پادریوں کا اثر غالب ہے جزءً یا کلاً مسترد کیا گیا ہے۔ بلکہ ناروے[۲] اور سویڈن[۲] اب تک اس سے منکر ہیں۔ سوئزرلینڈ میں ۱۸۶۶ء کے نظام سلطنت تک میں سیاسی حقوق عیسوی مذہب کے اقرار پر منحصر تھے، انگلستان تک میں جہاں منحرفوں اور کیتھولیکوں (اور یہودیوں) کے موانع اس صدی کے اوائل) میں

عہ یہ نیا اصول ۱۷۸۹ء میں اعلان حقوق انسان کی دفعہ اول میں ظاہر ہوا بعد کے کسی نظام سلطنت نے شہریت کا انحصار عقیدے پر نہیں رکھا ہے۔

عہ۲۔ ناروے میں لوتھر کی پیروی نہ کرنے والے اب سلطنت کے صرف اعلیٰ عہدوں سے خارج ہیں ۲۱۔ جولائی ۱۸۵۱ء کے قانون نے یہودیوں کو بھی داخل کر لیا ہے۔ اصل جرمانی متن میں سویڈن کا ذکر نہیں ہے بلکہ ناروے اور روس ہے۔ مترجم۔

رفع کیے جا چکے ہیں وہاں بھی جدید اصول ابھی کامل طور پر مسلم نہیں ہوا ہے۔

بہر حال جدید سلطنت جو اپنی آزادانہ اور قومی بنیاد پر صداقت کے ساتھ قائم ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو اپنی عام تنظیمات میں داخل کر کے متحد کرنے کی طرف قطعی طور پر مائل ہے اور ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات کے مطابق حقوق عامہ کو معین مذہبی شرائط یا کلیسائی قواعد سے وابستہ کرنے کے مسلک کو بتدریج منسوخ کرتی جاتی ہے۔

تیسرا مقالہ

سلطنت کا بنیادی اصول بیرونی فطرت کے لحاظ سے

زمین

پہلا باب

آب وہوا

قومی خصلت پر آب وہوا کا اثر

سارے ادنیٰ حیوانات کے برخلاف انسان دنیا کے ہر خطے میں رہنے کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنی خصوصیات کو قائم رکھ سکتا ہے۔ خارجی اثرات کی مقاومت کی قوت اور پر خطر آب وہوا کے مقابلہ کا سامان اس کے پاس نسبتاً وافر اور مکمل ہے مگر پھر بھی گرمی اور سردی اور لیل ونہار کا اثر اس کے جسم و دماغ پر پڑتا ہی ہے۔ وہ خط استوا یا قطبین سے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی زندگی کے حالات بدلتے جاتے ہیں۔ اگرچہ شمال یا جنوب میں سفر کرنے سے یا کسی خاص عرض البلد میں زیادہ قیام کرنے سے ایک منفرد شخص کی حالت بہت کم بدلتی ہے مگر من حیث المجموع ایک گروہ پر آب وہوا کا اثر پڑتا ہے اور چند نسلوں کے گزرنے پر جسم کی ساخت میں اور اس سے زیادہ اس کی جبلت میں تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مشرق میں جاکر رومیوں میں زنانہ پن آگیا۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر پہنچ کر صراحیوں کا کس بل نکل گیا اور ہندوستان میں جاکر انگریز بہت جلد سست اور شہوت پرست ہو جاتے ہیں۔ بودین (کتاب پنجم) مونٹسکو، (کتاب چہارم) فیلنگیری (کتاب چہار دہم پانزدہم) اور بکل (تاریخ تمدن جلد اول باب دوم) نے عام زندگی پر آب وہوا کے اثرات کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے قوانین معین کرنے کی کوشش کی ہے۔

معتدل اقلیم

بہت زمانہ قبل یہ خیال ظاہر کیا جا چکا ہے کہ گرم ممالک (۲۳ درجے ۲۸ دقیقے تک) اور سرد قطبی اقلیم (۶۶ درجے ۳۲ دقیقے کے آگے) سلطنتوں کے نشو و نما کے لئے اس قدر موزوں نہیں ہیں جس قدر ان کے درمیان کے معتدل اقلیم موزوں ہیں۔ زمین کی خشکی کا آدھے سے زیادہ حصہ انھیں معتدل اقلیموں میں واقع ہے اور شمالی نصف کرے میں جہاں بیشتر متمدن قومیں آباد ہیں، خشکی اور تری کا حصہ قریب قریب برابر ہے۔ یعنی ۱۱۷۶۰۰۰۰ مربع میل خشکی اور ۲۳۱۰۰۰۰۰ مربع میل تری۔ اس کے خلاف دیگر حصص میں پانی کا حصہ بہت ہی زیادہ ہے۔ سرد ممالک میں انسان کے لئے اجتماعی حالت میں رہنا دشوار ہے کیونکہ غذا اور ایندھن وہ اپنی آس پاس کی جگہوں سے مہیا نہیں کر سکتا اور منتشر خاندانوں کو اپنی ہستی ہی قایم رکھنے کے لئے فطرت سے اس قدر سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ اغراض پر کماحقہ توجہ کرنے کے لئے نہ انہیں وقت ملتا ہے، نہ ان کو اس کی خواہش ہوتی ہے۔ دوسری جانب گرم ممالک کاہلی پیدا کر دیتے ہیں اور جذبات کا ہنگامہ خیز جوش وقتاً فوقتاً بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ انسان کی فاعلی قوتوں کو اس کے ساکت میلانات کے مقابلے میں بہت کم ترقی دیتے ہیں مگر سلطنت کو جس کا مقصد خود داری و آزادی ہے مستعد کاری اور مردانہ صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرد اقلیموں کے باشندے آزاد ہوتے ہیں مگر ان میں سیاسی اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ دوسری طرف گرم اقلیموں کے باشندے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے یا ایک آزاد سلطنت کے ترقی دینے کے بجائے مطلق العنان قوت کو زیادہ آمادگی سے انگیز کر لیتے ہیں۔

سردی اور گرمی کی انتہا

بودین آج سے بہت پہلے اپنی تصنیف کے (مقالہ ۵، ص ۶۷۱ ب) کہہ گیا ہے کہ "درمیانی خطوں کے باشندے جنوبی اقلیم کے رہنے والوں سے قوت میں زیادہ اور چالاکی میں کم ہوتے ہیں اور شمالی اقلیم والوں سے دماغی جوہر میں زیادہ اور قوت میں کم۔ اور (اس لئے) وہ جمہوریتوں پر حکمرانی کرنے اور ان کو چلانے کے لئے زیادہ موزوں اور اپنے افعال میں نہایت عدل پسند ہیں۔" [دیکھو ارسطو کی "سیاسیات" باب ۱۱، فصل ۷۔ انگریزی مترجم]

آج کل کے ریاضی علوم کی مدد سے شمسی حساب کے بموجب جو آب ہوا عرض بلد سے ظاہر کی جاتی ہے اور جس کا انحصار آفتاب کے ساتھ سطح زمین کے تعلق پر ہے اس کے علاوہ موجودہ سائنس نے طبعی آب وہوا بھی دریافت کی ہے۔ مختلف مقامات کی اوسط حرارت و برودت کا اندازہ کرنے سے وہ خطوط اتحاد الحرارت قائم کرتی ہے جو دوائر عرض بلد سے تماماً موافق نہیں ہوتے بلکہ جس جس طرح آب وہوا پر سمندر کی سطح سے زمین کی بلندی، خلیج و بحر کی قربت، آب و باد کی

رفتار وغیرہ دوسرے اسباب کا اثر پڑتا ہے اُسی طرح یہ خطوط شمالاً یا جنوباً مڑتے جاتے ہیں۔ اسلئے انھیں زیادہ کثیر التعداد اور نازک امتیازات کے معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے مگر اس سے صرف اسی سابقہ تحریر کی تائید ہوتی ہے کہ انتہائی اقلیموں کے مقابلے میں معتدل اقلیم تمدن کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

دارالسلطنتوں کا محل وقوع

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تقریباً تمام اہم سلطنتوں کے مستقر معتدل اقلیم کے عین وسط میں واقع ہیں جہاں گرمی کا اوسط (سو درجے والے حرارت پیمائی رو سے) ۸ اور ۱۶ درجوں کے درمیان رہا کرتا ہے تقریباً تمام ہی یورپی سلطنتوں اور بیشتر ایشیائی سلطنتوں کے (جہاں خطوط اتحاد الحرارت بہ تیزی تمام جنوب کیطرف مڑ جاتے ہیں) اور اسی طرح شمالی امریکہ کی اکثر سلطنتوں کے پایہ تخت اسی اقلیم کے اندر واقع ہیں۔ ان میں بلاد ذیل شامل ہیں۔ روما (۱۵ درجے ۴ دقیقے) میڈرڈ (۱۴ درجے ۲ دقیقے) پیرس (۱۰ درجے ۸ دقیقے) لندن (۹ درجے ۸ دقیقے) ویانا (۱۰ درجے ۵ دقیقے) قسطنطنیہ (۱۳ درجے ۷ دقیقے) برلن (۹ درجے ۱ دقیقہ) ہامبرگ (۸ درجے ۹ دقیقے) کوپن ہاگن (۸ درجے ۲ دقیقے) زیورچ (۸ درجے ۸ دقیقے) ہاگ (ہیگ) (۱۰ درجے ۵ دقیقے) ڈریسڈن (۸ درجے ۳ دقیقے) میونک (۹ درجے ۱ دقیقہ) بوسٹن (۹ درجے ۶ دقیقے) واشنگٹن (۱۳ درجے ۵ دقیقے) فلاڈلفیا (۱۱ درجے ۹ دقیقے) رچمنڈ (۱۳ درجے ۸ دقیقے) پیکن (۱۱ درجے ۳ دقیقے)

یورپ کے جو مستقر زیادہ سرد اقلیم میں واقع ہیں وہ بس چند ہی ہیں۔ پیٹرسبرگ (۳ درجے ۱ دقیقہ) کرسٹیانا (۵ درجے ۳ دقیقے) اسٹوک ہولم (۵ درجے ۶ دقیقے)۔ مگر گرمی میں ان کی اوسط حرارت ۱۵ یا ۱۶ درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ مونٹ ریل کا اوسط مزاج (۶ درجے ۴ دقیقے) ہے مگر موسم گرما میں حرارت (۲۰ درجے ۵ دقیقے) پر پہنچ جاتی ہے۔ زیادہ جنوبی شہروں کا اوسط مزاج معتدل اقلیم کی حد سے کچھ ہی متجاوز ہے۔ ان میں نیپلز (۱۶ درجے ۴ دقیقے) لسبن (۱۶ درجے ۴ دقیقے)۔ میکسیکو (۱۶ درجے ۶ دقیقے)۔ بیونوس ایرس (۱۶ درجے ۹ دقیقے) پالرمو (۱۷ درجے ۲ دقیقے) سڈنی (۱۸ درجے ۱ دقیقہ) ناگاساکی (۱۸ درجے ۳ دقیقے) داخل ہیں۔ برخلاف ان کے کینٹن کی اوسط حرارت (۲۱ درجے ۶ دقیقے) قاہرہ کی ۲۲ درجے ۴ دقیقے) ری یوڈی جنیرو کی (۲۳ درجے ۱ دقیقہ) کلکتہ کی (۲۵ درجے ۸ دقیقے) سنگاپور کی (۲۶ درجے ۸ دقیقے) ہے مگر یہ خیال رکھنے کے قابل ہے کہ چین پر حکمرانی پیکن سے ہوتی ہے اور ہندوستان کا تمدن پنجاب اور بالائی گنگا کے زیادہ معتدل مقامات سے آیا ہے۔

معتدل اقلیم میں چار موسموں کا یکے بعد دیگرے بدل بدل کر آنا اور ان چاروں کا ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہونا انسان کے دماغ میں ایک امنگ پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ مناظر فطرت کے پیہم تغیرات اسے نئے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقلیموں کا یہ اختلاف خود ایک ہی اقلیم کے اندر بھی واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے گو اس سختی کے ساتھ نہیں جیسا دو اقلیموں کے درمیان میں ہوتا ہے ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ ذہانت، اعتدال پسندی، جسمانی طاقت اور قوت برداشت اسی ملک کے زیادہ سرد حصوں میں نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے اور اسی طرح چالاکی، قوت تخیل، مخمور المزاجی اور اشتعال پذیر اعصاب زیادہ گرم حصوں میں پائے جاتے ہیں ہم اطالیوں، فرانسیسیوں، جرمانیوں اور روسیوں پر نظر کریں اور ہر ملک کی شمالی آبادی کا اس کی جنوبی آبادی سے مقابلہ کریں (لیکن مقابلہ مجموعات کا ہو افراد کا نہو) تو یہ حقیقت فوراً ہی منکشف ہو جاتی ہے۔ بوڈین نے تو مبالغے کے ساتھ یہاں تک کہدیا ہے کہ شمالی قومیں جنوبی قوموں کو جنگ میں شکست دیدیتی ہیں اور تدبیر سیاسیہ میں خود ان سے شکست کھاجاتی ہیں لیکن معتدل اقلیم کی شمالی اور جنوبی آبادی کا مزاجی فرق ایک حقیقی فرق ہے اور مدبر کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کا لحاظ کرے۔

آب وہوا اور توضیع قانون

آب وہوا کے خراب اثرات کے خلاف سیاسیات بہت کم کچھ کر سکتی ہے فطرت کی طاقتیں سیاسیات سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ آب وہوا کے فوائد سے متمتع ہونے اور اس کے مضرات سے بچنے کے لئے مدبر سے جو کچھ ممکن ہو وہ اسے کرنا چاہئے۔ تعلیم اور قانون سے کچھ ہو سکتا ہے، مختلف آب وہوا سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں انھیں کے موافق قانون بھی مختلف بنانا پڑے گا مگر اس وضع قانون میں مختلف آب وہوا کے ضروریات پر بھی لحاظ کرنا پڑے گا مثلاً یہ کہ سرد ممالک کے مزدوروں کو گرم ممالک کے بہ نسبت گوشت اور شراب کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور سخت نشیات جو گرم ملکوں میں خطرناک ہوں گی وہ سرد ملکوں میں ضروریات میں داخل ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شراب کے متعلق آنحضرتؐ کی ممانعت، عرب کے موافق ہے مگر اہل یورپ کے لئے غیر ممکن ہے۔[1] زیادہ سرد ممالک میں مزدوروں کو بحال خود چھوڑ دینا چاہیئے

[1] الحق لیلو ولا یعلی۔ خدا کی قدرت ہے کہ امریکہ میں شراب کا کلی سدباب ہو گیا۔ یورپ کے بیشتر ممالک

مگر زیادہ گرم ملکوں میں ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے لیکن ان تمام معدلات کے باوجود جو آب و ہوا سے پیدا ہوتے ہیں انسانی فطرت تمام اقلیموں میں ایک ہی رہتی ہے اور ایک حد تک ہر آب و ہوا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتی ہے اصحاب قوت و ثروت کو اس سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔

جب کسی دار الحکومت کی بناڈالنے یا منتقل کرنے کا سوال پیش آتا ہے تو آب و ہوا کے خیالات کو بہت اہمیت دیجاتی ہے۔ اوٹوسوم سے سخت سیاسی لغزش سرزد ہوئی کہ اس نے روما کو جرمانی شہنشاہی کا دار الحکومت بنانا چاہا اور اسی طرح کلکتے سے ہندوستان پر حکمرانی کرنا کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ برلن کو پروشیا کے دار السلطنت منتخب کرنے کے خلاف بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر کوئینگس برگ سے یہ بہر نوع بہت بہتر ہے۔ سلطنت اطالیا کے دار السلطنت کے لئے فلورنس کا عارضی انتخاب اس لحاظ سے اچھا تھا کہ ٹیورن کی سختی اور نیپلز کی نرمی کے بین بین خوشگوار آب و ہوا قومی خصلت کی میزان کو برقرار رکھنے کے لئے خوب موزوں ہے[۲]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اسی طرف گامزن ہیں اور جو ممالک شراب کے استعال کو روا رکھتے ہیں وہ بھی اب اس حد تک تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اس کا مفاد کم و ضرار زیادہ ہے، کوئی دن جاتا ہے کہ وہ اسے "رجس من عمل الشیطان" ماننے پر مجبور ہوجائیں گے۔ (مترجم)

[۲] کسی شہر کی بہترین جائے وقوع کی نسبت ارسطو کی رائے کے لئے (جو صرف یونانی ممالک اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں کے لحاظ سے لکھی گئی ہے) "سیاسیات" ارسطو باب ہفتم فصل یازدہم دیکھنا چاہیے۔ انگریزی مترجم}

دوسرا باب

ملک کی ہیئت اور قدرتی اشکال

ملک کی ہیئت اور اس کے باشندوں کے تمدن کے باہمی تعلق پر کارل ریٹر کے وقت سے جغرافیہ دانوں نے زیادہ توجہ کی ہے مگر یونانی بہت پہلے اسپر نظر ڈال چکے ہیں۔ؑ

دریا

قدیم ترین متمدن سلطنتیں پنجاب میں اور بالائی گنگا، نیل، دجلہ و فرات اور ہیہو کی وادیوں میں قائم ہوئی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑے دریاؤں کے کنارے کی زندگی انسانی قوی اور انسانی تخیل کی ابتدائی ترقی کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہے۔ انسان جب جہازات بنالیتا ہے نہریں کاٹ لیتا ہے اور دریاؤں سے کام لینے لگتا ہے تو اسے خود اپنے پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دولت کے حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے اور پانی کی زندگی سے اس میں مبادرت و تجارت کا شوق ترقی کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزائری ممالک جن میں بندرگاہیں واقع ہوتی ہیں جلد ترقی کر جاتے ہیں۔

سمندر

یونان اور اطالیا کی قدیمی فوقیت، مغرب میں اسپین اور پرتگال کی کامیابی انگلستان اور ولندیز میں آزاد سلطنتوں کا عاجلانہ عروج یہ سب کچھ زیادہ تران کے بحری مواقع کی وجہ سے تھا۔ اگر سمندر کو تابع فرمان کرنے میں زیادہ محنت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی دریاؤں کے بہ نسبت زیادہ زوردار ہوتا ہے۔

پہاڑ

خصلت اور طینت پر پہاڑی ملکوں کا خصوصیت کے ساتھ قوی اثر پڑتا ہے

ؑ [ارسطو "سیاسیات" باب ۷، فصل ۵،۶۔ انگریزی مترجم۔]

انسانی طبائع کے بلند اور قوی کرنے میں مختلف الجسامت پہاڑوں کی شوکت سنگین سمندروں سے کم موثر نہیں ہوتی پہاڑوں کے رہنے والے مجبور ہیں کہ روزانہ اپنی انتہائی قوت سے کام لیں اس سے ان میں ایک طرح کی طاقت اور اپنی آپ مدد کرنے کی ایسی قوت پیدا ہوجاتی ہے جو ان میں مردانہ صفات پیدا کر دیتی ہے علاوہ اس کے پہاڑی ملک کی منتشر کیفیت اور اس کی ایک دوسرے سے بے تعلق کثیر التعداد وادیاں چھوٹی چھوٹی ملتوں کی ترقی کی معاون ہوجاتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر زوردار آزادی کے ساتھ ترقی کرتی اور ہر طرح کے حملوں کے روکنے میں ثابت قدم رہتی ہیں۔ یہ خصوصیات اسرائیلیوں اور عربوں میں اسی طرح ہویدا ہیں، جس طرح ایرانیوں میں ہیں۔ کوہ قاف کے قبائل میں اس کا ظہور یونانیوں، سویزرلینڈیوں اور سمنائیوں سے کم نہیں ہوا اگر آزادی کا جوش سمندر اور پہاڑ کے اثر سے مختلف رنگ اختیار کرلیتا ہے رومائی یہ خاص خوبی قسمت تھی کہ اسے پہاڑ اور سمندر دونوں کے اثرات سے ایک ساتھ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

اندرونی ممالک

اندرونی ممالک خاصکر وہ ممالک جن میں وسیع میدان ہوں، اپنی رفتار ترقی میں نسبتاً زیادہ سست ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی قدرتی محرک نہیں ہوتا، سلطنت کو فرانس میں اطالیا کے بعد اور جرمانیا میں انگلستان کے بعد نشو ونما حاصل ہوا۔

سب سے بدتر موقع سمندر سے دور افتادہ سطح ملکوں کا ہے جن میں نہ کوئی بڑا دریا ہوتا ہے نہ پہاڑ بلکہ صرف وسیع دشت و بیابان ہوتے ہیں۔ افریقہ کا یورپ سے ایشیا کے اندرونی ممالک کا اس کے سواحلی ممالک سے، مغربی یورپ کا مشرقی یورپ سے مقابلہ کیجئے تو یہ فرق فوراً ہی عیاں ہوجاتا ہے۔ ایسے ممالک کی بلید الطبع آبادی مطلق العنان حکومت کی اطاعت کو بے چون و چرا اپنے اوپر لازم کرلیتی ہے۔

انسان کی طاقت قدرت پر

انسان ان قدرتی حالات کو پیدا نہیں کرسکتا، مگر آب و ہوا کے بہ نسبت اسے ان حالات پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے وہ پہاڑوں کو جگہ سے ہٹا نہیں سکتا نہ سمندر کو اپنے ملک سے ملا سکتا ہے مگر وہ دریاؤں کو قابل سفر بنا سکتا نہریں کاٹ سکتا ہے، ریل جاری کرسکتا اور تار برقی کا ایک جال سارے ملک میں پھیلا سکتا ہے۔ وہ ملک کی ساکت حالت میں تجارت کے ذریعے سے زندہ دلی پیدا کرسکتا اور ملک کے اندرونی حصے کو سمندر سے ملا سکتا ہے۔ کرۂ ارض کے تمام قابل سکونت حصوں کو ایک مسلسل اور

بار آور اتحاد کے روابط میں وابستہ کر دینے کا عظیم الشان کام تہذیب جدید کے پیش نظر ہے اور انجام کار تکمیل کو پہونچ جائے گا۔

ٹامس بکل نے زیادہ عارضی اور تغیر پذیر نوامیس کے اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں بھی سمندر اور پہاڑ کے مناظر، اندرونی میدان کے منظروں کے بہ نسبت زیادہ گہرا اور دل پذیر اثر پیدا کرتے ہیں مگر اس کے سوا اور اثرات بھی ہیں گرم اقلیم کے ملکوں میں فطری حالت اکثر ایسی بے قابو کر دینے والی ہوتی ہے کہ انسان اسے مغلوب کرنے سے مایوس ہو کر تمام کوششیں ترک کر کے بیٹھ رہتا ہے اور اس کے تخیل میں فطرت کی مہیب قوت کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی۔ اس کا دل خوف اور وہم سے بھر جاتا ہے۔

برف باری کی شدت، برف کی چٹانوں کی روانی، پہاڑی اقطاع میں برف کا طوفان شدید بارش اور سیلاب اور اکثر گرم ممالک میں خوفناک طوفان اور بگولوں کا اٹھنا زمین کا سرسبز حالت سے دفعتہً لق و دق میدان ہو جانا۔ حشرات الارض کا تباہ کن دل، وحشی جانوروں کا خطرہ یہ سب وہ اثرات ہیں جو ان ممالک کے باشندوں کی طبیعتوں کو ابھارنے کے بجائے پست اور پریشان کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انسانی طبائع کی ترقی کے لیے معتدل ملک سب سے زیادہ موزون ہے۔ یکساں آب و ہوا میں طبیعت کو کافی تحریک نہیں ہوتی اور شدت انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ انسانی خیالات کے ابھرنے اور اس کی کوششوں کے برانگیختہ ہونے کے لیے متنوع اور معتدل آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ انسانی طبیعت جو گرم اقلیم کے ملکوں میں از خود رفتہ ہو جاتی ہے، معتدل حالت میں ایک منتظم و معقول رفتار سے نشو و نما حاصل کرتی ہے۔

معتدل آب و ہوا کا فائدہ

مگر نوامیس طبعی کی اہمیت میں ہمیں مبالغہ نہ کرنا چاہیئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان پر وہ انحصار نہیں ہے جو انحصار خود انسان کے ذریعے سے انسان کی اخلاقی اور ذہنی تعلیم پر ہے۔ گرم ممالک میں شعور فطری (عقلیت) کی تربیت ہو سکتی ہے اور احساس حسن کے ذریعے سے وہم و تخیل کی روک ہو سکتی ہے، اور اسی طرح (بلا تعلیم) معتدل ملک میں اوہام خود رو گھانس کی طرح بڑھ کر تخیل صحیح کو دبا سکتے ہیں۔ انسان فطرت کی قوتوں کا بندہ نہیں ہے اسے ہمت اور آزادی کے ساتھ فطرت کا مقابلہ کرنا چاہیئے جو مدد فطرت سے مل سکتی ہو اس سے فائدہ اٹھائے اور جو مضرتیں اس میں ہوں اُن کے انسداد اور اصلاح میں جد و جہد کرے

تیسرا باب

زمین کی زرخیزی

جس ملک کی زمین زرخیز ہوتی ہے وہاں بسر اوقات نسبتاً آسان ہوتی ہے اور اسی انداز سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرخیز زمین نظم معاشرت و سلطنت کی بہبود کے لئے سب سے زیادہ مفید شئے تھی اسی سے خوش عیش بہشت کا خیال پیدا ہوا جہاں رنگ برنگ کے خوش ذائقہ پھلوں کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہوگی اور طفل مزاج اور سست طبع لوگوں کا منتہائے خیال ابھی تک یہی ہے مگر پختگی سن اور انسانی کوشش سے اس حالت سے ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس میں زندگی کے صحیح مقصد اور فطرت انسانی کے نمو اور تکمیل کا کوئی خیال نہ ہو۔

بنجر زمین

یہ یقینی ہے کہ بالکل بنجر زمین معاشری زندگی کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اس حال میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ تجارت کے ذریعے سے اپنی غذا کسی دور دراز مقام سے مہیا کرے ان حالتوں میں تجارتی شہر قائم ہو جاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ جیسا کہ بے ثمر سمندر کی آغوش میں شہر وینیس نے پرورش پائی مگر بنجر ملکوں میں پوری پوری قومیں صرف تنگدستی اور تکلیف ہی کے ساتھ بسر کر سکتی ہیں۔ آبادی کم ہوتی ہے اور اس کی ترقی بھی خفیف ہوتی ہے کسی معین جگہ کا توطن بھی بدشواری ممکن ہوتا ہے لوگ منتشر خاندانوں اور گروہوں کی صورت میں خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ بکل نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں نے خود اپنے بنجر میدانوں میں بہت کم ترقی کی اور چین اور ہند کی قابل زراعت زمینوں میں پہنچ کر

انھوں نے ایک تمدن کو حاصل کیا۔ اسی طرح اہل عرب بھی اس وقت تک کوئی ترقی یافتہ سلطنت نہ قائم کرسکے جبتک کہ وہ عرب کو چھوڑ کر ایران کی زرخیز زمین اور بحر متوسط کے ساحل پر نہیں پہنچے۔ سرد آب وہوا میں سلطنت کی سست ترقی کا صرف یہی سبب نہیں ہوتا کہ گرم سامان کے مہیا کرنے اور فطرت سے سخت کشاکشی کی مشکل درپیش رہتی ہے بلکہ یہ بھی سبب ہوتا ہے اور بہت بڑا سبب ہوتا ہے کہ سرد ممالک کی زمین بنجر ہوتی ہے۔ یہی اثرات ان گرم ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں ظاہرا زرخیزی بہت ہوتی ہے مگر کثیر الوقوع اور اتفاقی حادثات جیسے کیڑوں کی بلا یا سیلاب اسے غارت کرتے رہتے ہیں کیونکہ پیداوار کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی مشکلات بھی معاشری زندگی کے لئے ویسی ہی سد راہ ہیں جیسی پیداوار کی قطعی قلت۔

زرخیز زمین کے یہ نتیجے ہوتے ہیں

نہایت ہی زرخیز زمین جو بلا محنت کے کافی غذا مہیا کردے ایسی زمین سے بہتر ہے جس میں کچھ پیدا نہو لیکن سلطنت کے لئے کسی نہج سے یہ بہترین بنیاد نہیں ہے اور اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کاہلی

انسانی کوشش کا خاص محرک غذا کے مہیا کرنے کی خواہش ہے۔ اگر یہ ضرورت فطرت کی فیاضی سے رفع ہوجائے تو انسان بہت ہی کم کام کرتا ہے، بلکہ مطلقاً کام نہیں کرتا اور بالعموم کاہلی اور شہوت پرستی میں غرق ہوجاتا ہے۔ جہاں انسان کام سے باز رہتا ہے وہاں اس کی فطرت کے مخفی وسائل کو نشو و نما نہیں ہوتی اور اس لئے معاشرت میں بھی ترقی نہیں پیدا ہوتی۔ گرم اقلیم کے متعدد جزیروں میں لوگ خوشحالی کے ساتھ عیاشانہ زندگی بسر کرتے مگر اس کے ساتھ ہی عوام غیر متمدن رہتے ہیں۔ نیپلز نے جب اپنے کاہل آوارہ گروہوں کو محنتی مزدوروں کی حالت میں بدل دیا تو اس نے انسانی تہذیب میں بہت ترقی کرلی

۲۔ محنت کی ذلت

جہاں محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں محنت اور محنت کرنے والے دونوں حقیر نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ قوم کے عام آدمیوں کی زندگی کسی شمار میں نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی سے ایسی وحشیانہ لاپروائی کہیں نہیں برتی جاتی جیسی آفریقہ کی حبشی مطلق العنان سلطنتوں میں ہوتی ہے، جہاں بلا کشت و درو کے زمین سے پیداوار حاصل ہوجاتی ہے اور محنت کو وقعت دینے کے لئے کوئی صنعت و حرفت موجود نہیں ہے۔

۳۔ ملکیت کی غیر مساویت

زمین کی زیادہ زرخیزی سے ملکیت کی غیر مساوی تقسیم کو ترقی ہوتی ہے، چند دولتمند

عیش فراواں میں زندگی بسر کرتے ہیں، متوسط طبقہ ہوتا ہی نہیں اور عام لوگ مفلسانہ اور غلامانہ حالت میں رہتے ہیں۔ چونکہ زمین کی بار آوری انسانوں کی بار آوری کو بھی ترقی دیتی ہے یعنی نئے خاندان آسانی سے بنتے ہیں اور مزدوری کمانے کی فکر بچوں کی پیدایش اور پرورش کے مواقع کو نہیں گھٹاتی اس لیئے ان ممالک میں آبادی پر کوئی روک نہیں ہوتی بلکہ اس میں تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی جاتی ہے مگر وقتاً فوقتاً قحط یا جنگ اس بے پروا آبادی کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے (اور اس وقت) وہ چند اشخاص جنھیں اپنی پیداوار کے جمع کر رکھنے کا سامان حاصل ہوتا ہے وہ عوام کو مجبور کرتے ہیں کہ غذا کے عوض وہ اپنے پھلوں کے درخت اور زمین ان کے حوالے کر دیں۔ فوجی سردار محافظت کے عوض میں محصول اور خدمت لیتے ہیں، پروہت جو دیوتاؤں کو راضی کرتے اور ان کی نوازش حاصل کرتے ہیں، اپنے معتقدین سے بڑی بڑی جایدادیں پاتے ہیں اس طرح آہستہ آہستہ دولتمند زمینداروں اور رئیسوں، امیروں اور پروہتوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو سارے ملک کا مالک ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی حد تک تہذیب بھی حاصل کر لیتے ہیں اور بہت بڑی دنیاوی ثروت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ماتحت طبقات سے محنت لیتے ہیں مگر اس محنت کو ارزاں رکھتے ہیں کیونکہ مزدوروں کی کثرت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ عوام فلاکت زدہ، حقیر اور بالکل ہی دوسروں کے تابع ہو جاتے ہیں۔ وہ خدمتگاری کی سست اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر طرح کے مہذب کن اثر سے بالکل ہی الگ ہوتے ہیں۔

ہندوستان

بکل پہلا شخص تھا جس نے زمین کی بہت زیادہ زرخیزی کے ان نقصانات پر پورا زور دیا اور تاریخی طور پر انھیں قائم کیا، لیکن جب وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور ذاتوں کے طریق کو اسی سبب کے تابع قرار دیتا اور یہ دعوی کرتا ہے کہ تمدن سے پہلے دولت کی کثرت ضروری ہے تو یقیناً وہ حد سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تاہم انگریزوں کے مانند وہ بھی اقتصادی حالات پر زائد از ضرورت زور دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہایت بلند مرتبہ برہمنوں اور بودھ مت والوں نے افلاس کو دولت پر ترجیح دی ہے چھتری دولت سے زیادہ طاقت کے دلدادہ اور جرأت و ہمت کے قدردان تھے البتہ ویش اپنی محنت و تجارت اور سود سے دولت جمع کرتے اور اس کی بڑی قدر کرتے

تھے لیکن ان کا تعلق طبقۂ اعیان سے نہیں تھا۔ شودر غلامانہ حالت میں ڈال دئے گئے تھے، نہ اس وجہ سے کہ وہ غریب تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک پست درجے کی مفتوح قوم سے تھے۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ چاول کی فراواں پیداوار آسانی کے ساتھ ایک بڑی آبادی کی بسراوقات کو کافی ہوتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ سارے ملک کی زمین رئیسوں اور امیروں کی جاگیر ہوگئی تو معدودے چند دولتمندوں اور کثیر التعداد غربا کے درمیان ایک فرق قایم ہو گیا اور ابتک باقی ہے۔ ایک طرف ایک مختصر اور اعلیٰ متمدن جماعت ہے جسے نہایت درجے کی دنیاوی آسایش حاصل ہے اور دوسری طرف ایک حقیر و مظلوم جمّ غفیر ہے۔

مصر

یہی حال مصر کا ہوا۔ وہاں بغیر زیادہ تردد کے کھجور کے درختوں سے کثیر پیداوار ہو جاتی ہے۔ مصری بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی بہتات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان عمارات میں انسانی خدمات اور محنت کا کیسا خطیر صرف ہوا ہے۔ غلامانہ مزدوروں کی شکستہ حالت کی داستان یہودیوں کے (عبرانی) وقایع سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت یوسف ؑ کی صلاح فرعون کے خزانہ کے لئے کار آمد ہو تو ہو مگر رعایا کے لئے بربادکن تھی۔

مکسیکو اور پیرو

مکسیکو اور پیرو میں بھی ہم دولتمند اور صاحب قوت اشخاص کی ایک مختصر جماعت دیکھتے ہیں کہ عوام کے ثمرۂ محنت پر قابض تھی اور یہاں بھی اس خرابی کی وجہ ایک حد تک بظاہر فطرت کی فیاضی ہے، جس نے جوار، کیلا اور آلو بکثرت پیدا کر دیا ہے۔ نچلے طبقوں میں برہنہ تنی اور غلامی، اوپر کی طرف دولت کی زیادتی، فنون لطیفہ اور حکومت کے باہر کی جانب کمزوری، ایک طرف سر بفلک عمارات دوسری طرف فلاکت زدہ جھونپڑیاں بس یہی تصویر ہے ان مبارک ملکوں کی۔

آیا مدبر اس خرابی کو رفع کر سکتے ہیں؟ اگر وہ ایک صحتور قومی زندگی کے دل سے ترقی دینے میں منہمک ہو جائیں تو بیشک وہ اسے رفع کر سکتے ہیں۔ باوجود زمین کی زرخیزی کے یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ طبقات اعلیٰ طبقات کی حرص اور زیادتی سے محفوظ رکھے جائیں، انھیں آزاد انسان بننے کی تعلیم دیجائے، املاک کی زیادہ بہتر تقسیم کو ترقی دیجائے اور متوسط طبقے جو نہایت ضروری ہیں قایم کئے جائیں۔

معتدل زرخیز زمین سب سے بہتر ہے۔

پس انسان کی اجتماعی زندگانی کے لئے سب سے زیادہ موزوں معتدل زرخیز زمین ہے کہ جس کے لئے قرار واقعی اور بالاستقلال محنت صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں محنت اور محنت کرنے والوں کی مناسب قدر کی جاتی ہے گران پر زائد از ضرورت بار نہیں پڑتا اور نہ ان کی حالت تباہی کو پہنچتی ہے۔ انسانی طاقتوں کو نشوونما اور شرائط زندگی کی تکمیل ہوتی ہے معقول خوشحالی کے ساتھ خاندانوں کو محفوظ ہستی کا لطف حاصل ہوتا ہے اور دولت کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ متوسط طبقوں کے لوگوں کی کثرت ہوتی اور ان کی حالت اچھی رہتی ہے۔ بتدریج ایک طبقہ دوسرے طبقے سے جا ملتا ہے اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ نیچے کا طبقہ غلام بنالیا جائے گا یا اوپر کا طبقہ ایک ذی امتیاز طبقہ ہوجائیگا۔ پیشوں کے اختلافات بکثرت ہوتے ہیں مگر قوم کا ایک مربوط مجموعہ قایم رہتا اور ان میں ایک مشترک جوش موجزن ہوتا ہے۔

بیشک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات سے یہ لازم نہیں آتا کہ دولت کی مساوی تقسیم ہوجائے اور تنومند قومی زندگی پیدا ہوجائے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے قوی اسباب شامل ہیں لیکن اگر ہم یورپ کا مغربی اور جنوبی ایشیا سے یا شمالی امریکہ کا وسطی اور جنوبی امریکہ سے بلکہ اگر صرف جنوبی اٹالیا کا لومبارڈی اور سویزرلینڈ سے مقابلہ کریں تو یہ امر عیاں ہوجائے گا کہ ایک اوسط درجے کی حاصل خیز زمین اور اس کے ساتھ اوسط درجے کی محنت کا صرف کرنا اس سے ہر طرح پر بہتر ہے کہ محض زمین کی زرخیزی بیحد زیادہ ہو اور محنت کی تقریباً ضرورت ہی نہ ہو۔ اس میدان میں سلطنت کا خاص کام یہ ہوگا کہ صحت بخش فطرتی حالات کو انسانی مداخلت سے محفوظ رکھے اور طاقتوں کا ایسا توازن قایم رکھے کہ باہمی امداد و ترقی کو برتری حاصل ہو۔ وضع قانون اور اقتصادی حالت سے زمین کے خراب ہوجانے یا بیکار ہوجانے سے بچانے میں مدد ملے۔ اراضی کا چند افراد کے پاس مجتمع ہوجانا (خاصکر رہن کی صورت میں) رک جائے اور دولت کی فطرتی تقسیم میسر آئے۔ حکومت بعض وقت بنجر زمین کو زرخیز بنا سکتی اور علیٰ ہذا دلدلوں کو خشک کرکے اور میدانوں میں آبرسانی کا سامان کرکے ملک کی پیداوار کو بڑھا سکتی ہے۔

قانون

چوتھا باب

زمین

جس طرح سلطنت کی شخصی بنیاد قوم پر قائم ہے اسی طرح اس کی مادّی بنیاد زمین پر قائم ہے۔ کوئی قوم مستقل سلطنت نہیں ہو سکتی جبتک کہ وہ ایک رقبۂ زمین نہ حاصل کر لے۔

سلطنت اور اس کی ملکِ ارضی

دنیا کے جس حصہ پر کوئی قوم قابض ہوتی ہے یا کوئی سلطنت حکمرانی کرتی ہے وہ اس کی زمین یا مملکت (ملک ارضی) کہلاتی ہے۔ اس مملکت کی وسعت قوم کے نشو و نما کے مانند تاریخی واقعات سے متعین ہوتی ہے۔ سلطنت کی قانونی ہستی کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی شاہیاں اور جمہوریتیں ہمیشہ رہی ہیں اور ایک حد تک انہوں نے اپنے بڑے بڑے ہمسایوں کے پہلو بہ پہلو برابری کے مرتبے کو قائم رکھا ہے اسلئے سلطنت کی ملک ارضی کے لئے کسی اوسط حد کے مقرر کرنے کی کوشش غیر ممکن ہے۔ یونانیوں کی شہری سلطنتیں رومی شہنشاہی کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتی ہیں مگر تاریخ عالم میں ایتھنز کو روما کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی ہے۔ با ایں ہمہ سلطنت کی وسعت اس کی سیاسی حیثیت اور اہمیت پر بڑا اثر رکھتی ہے اور بہت سے وسیع سیاسی مسائل سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

سلطنت کے یہ دو ضروری عنصر (زمین اور قوم) بدیہی طور پر ایک دوسرے پر اثر رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمین قوم کے لئے بہت تنگ اور اس کی دماغی (ذہنی) اور مادی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ناکافی ہو، آبادی کی زیادتی سے ضرورت پیش آئے کہ نو آبادیاں قائم کی جائیں تاکہ فاضل حصہ وہاں بس سکے۔ یا قوت کا احساس اور تمدن کی

ضروریات کا تقاضا یہ ہو کہ مملکت کو وسعت دیجائے اور یہ غرض الحاق یا فتح سے حاصل کی جائے۔ اس صورت میں یہ مشکل ہے کہ وسعت و ترقی کے طبعی حق کو دوسری قوموں کے تاریخی حقوق سے موافقت دیجا سکے۔

ماسوا اس کے جب کوئی سلطنت اس قدر چھوٹی ہو جائے کہ دوسری ترقی پذیر سلطنتوں کے مقابلے میں وہ اپنی ہستی کو محفوظ نہ رکھ سکے تو وہ یا تو کسی دوسری سلطنت کی حلیف ہو جاتی ہے یا اپنے کو کسی زیادہ قوی سلطنت میں یوں ہی جذب ہو جانے دیتی ہے۔

دوسری جانب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک منتشر آبادی اپنی املاک ارضی کو ضرورت سے زیادہ وسیع سمجھے یا اس کا کوئی خاص حصہ خود مختار ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ صورت اول میں سلطنت بیرونی آبادکاروں کی آمد کی ہمت افزائی کرے گی اور صورت ثانی میں وہ انفراق یا انتشار کی روش اختیار کرے گی۔

بڑی سلطنتوں کی جانب میلان

اس امر میں زمانۂ حال کا میلان ازمنۂ وسطیٰ کے رجحان سے بالکل ہی مختلف ہے اس زمانے میں عام میلان چھوٹی سلطنتوں کی طرف تھا اور اب بڑی سلطنتوں کی جانب ہے۔ اس زمانے میں اطالیا۔ فرانس۔ جرمانیا۔ اسپین اور ابتداً جزیرۂ برطانیا اور سلادی ممالک سب چھوٹی چھوٹی شاہیوں یا جمہوریتوں میں منقسم تھے۔ رومی شہنشاہی کا اتحاد عملی ہونے کے بجائے زیادہ تر خیالی تھا۔ بڑی سلطنتیں قایم کرنے کا میلان انگلستان سے شروع ہوا اور بر اعظم میں پندرھویں صدی کے نصف آخر سے نظر آتا ہے اور ابھی تک اپنی پوری حد کو نہیں پہنچا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنتیں لاتعداد تھیں۔ تقریباً ہر امارت، بہتیرے شہر اور امکنۂ مذہبی بلکہ دیہات تک اپنی آزادانہ سیاسی ہستی رکھتے تھے۔ ان نظامہائے حکومت میں سے اب صرف چند ہی باقی رہ گئے ہیں اور ان کے بھی قائم رہنے کی بہت کم امید ہے۔ قدیم رومی تخیل اتحاد کے ان لاتعداد نظاموں میں منقسم ہو جانے میں بہت سے اثرات نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ انھیں میں ذیل کے وجوہ بھی تھے سڑکوں اور منزلوں کی کمی، ذرائع نقل و حرکت کا نامکمل ہونا، خاص حقوق کی جانب میلان، پولیس کا ناقص طریقہ جاگیردارانہ نظام (جس کی فوجی خدمتیں معین تھیں اور جس کا سامان جنگ ناقص تھا) روپیہ کا محدود رواج) جائدادوں کی علحدگی، خاندانی حکمرانی اور شخصی قانون کے بنیادی

خیالات۔ ایک (مشترک) قومی احساس کی کمی اور جسر مایتوں کا آزادی اور مجموعی نظامات کی جانب میلان۔ برخلاف اس کے بڑی سلطنتوں کے قیام کو ذرائع آمد و رفت کی وسعت اور ترقی انتہائی ہوئی ریل، دخانی جہاز، مراسلت اور تار کے نظم و نسق تجارت اور سوداگری کی تیز تحریک، فوجی و مالی وسائل کی زیادتی کی وجہ سے ترقی ہوئی ہے۔ بالفاظ مختصر یہ کہ موجودہ تمدن کی جملہ ترقی اور بیدار شدہ قومی احساس اور زیادہ قرین عقل قوانین (جو اس کے ساتھ پیدا ہو گئے ہیں) اس میلان کا باعث ہوئے ہیں۔

وسعت مملکت کے حدود

جدید سلطنت کو اس سے زیادہ وسیع حد کی ضرورت ہے جسقدر محض ایک بلدی یا عدالتی ضلع کے لئے درکار ہوتی ہے، جس طرح ذی امتیاز طبقے اور قبیلے کو ذات و قوم کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ہے اسی طرح شہروں اور قصبوں کو ملک کے زیادہ وسیع اتحاد میں غرق ہو جانا پڑتا ہے، قوم کا تخیل صرف اسی طرح مقامی شہریت یا تنگ تعلق پر غالب آسکتا ہے۔ سلطنت کے جدید تخیل کے لئے ملک اور قوم دونوں لازمی ہیں۔ ملک کے بغیر سلطنت بہترین صورت میں بھی غیر محفوظ اور بے اثر ہے اس قسم کی سلطنت کچھ دنوں کے لئے محض ایک اعجوبے کی طرح قایم رکھی جا سکتی ہے مگر جدید زندگی کے اسے بالکل منقطع ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹی سلطنتوں کے گروہ کی عام نفرت میں شامل ہو جائے گی یہ اصول سلطنت کی وسعت کی حدِ ادنیٰ معین کرتا ہے، اس کی حدِ اعلیٰ کا اصول یہ ہے کہ ہر جزو مرکزی قوت کی رسائی کے اندر ہونا چاہیے مگر بہر نوع اس حد میں گھٹنے بڑھنے کی قوت ہے۔ دخانی ذریعہ آمد و رفت اور تار کی ایجاد کے بعد سے کوئی ملک بھی رسل و رسائل کے ذریعے سے اپنے دار الحکومت سے زائد از ضرورت بعید نہیں کہا جا سکتا۔ اب کہ بین الاقوامی قانون (جس کا اصول موضوعہ یہ ہے کہ متعدد سلطنتیں ایک مجموعی انسانیت میں متحد کر لی جائیں) ارض مسکونہ کے بیشتر حصص پر وسیع ہے اس حالت میں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام کرۂ ارض کو ایک سیاسی نظم کے اندر متحد کر لینا ممکن ہے کرۂ ارض کے مجموعی خشک حصہ میں سے جن کا اندازہ پانچ کرور چالیس لاکھ مربع میل کیا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ نوے لاکھ مربع میل پر حکمراں ہے۔ روس تقریباً اسی لاکھ تیس ہزار مربع میل پر، چین پینتالیس[۴۵] لاکھ مربع میل پر اور ممالک متحدہ امریکہ تیس لاکھ مربع میل پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان حکومتوں میں وسیع و بعید قطعات ہیں مگر پھر بھی سب ایک ہی سیاسی جذبے سے مشتعل ہیں۔

آبادی حدود ارضی سے زیادہ اہم ہے

مگر کسی سلطنت کی قوت کا اندازہ محض اس کی وسعت سے نہیں ہونا چاہئے جرمانی شہنشاہی کی ملک ارضی دو لاکھ دس ہزار مربع میل ہے مگر یورپ میں وہ سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہے فرانس کی وسعت یورپ میں دو لاکھ چار ہزار مربع میل ہے مگر بدرجہ اقل اس کی طاقت روس کے برابر ہے جس کے حدود ارضی ایک اکیلے یورپ ہی میں اس سے دہ چند ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی یورپی مملکت صرف ایک لاکھ اکیس ہزار دو سو پینتیس مربع میل ہے مگر اس کے ذریعہ سے وہ ان مستعمرات و تابعات پر حکومت کرتی ہے جو خود اس سے بدرجہا زیادہ وسیع ہیں کسی قوم کی طاقت کے تعین میں آبادی کو وسعت ارضی کے بہ نسبت بدرجہا زیادہ اہمیت حاصل ہے گو کہ ملک کی وسعت بھی بجائے خود ایک اہمیت رکھتی ہے۔

حدود ارضی جس قدر وسیع ہوتے جاتے ہیں اسی قدر نقل و حمل کی مشکلات بڑھتی جاتی ہیں اور اسی نسبت سے حکمرانی میں مشکل پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس کی منتشر قوتیں صرف آہستگی کے ساتھ جمع کی جا سکتی ہیں اور اس کے دور افتادہ صوبجات کامل نگرانی کے اندر نہیں ہوتے۔ آمد و رفت کے ترقی یافتہ ذرایع سے اس مشکل میں کمی ہو گئی ہے مگر وہ بالکل رفع نہیں ہو گئی ہے۔ سلطنت کی انتہائی حد پر بجلی کی تیزی کے ساتھ حکم پہنچ سکتا ہے مگر بالمشافہ اقتدار کا زور اس میں نہیں ہوتا۔ اس میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے یا اگر رعایا اس پر رضامند نہ ہو تو اس سے گریز کر سکتی ہے۔ ریل کے ہوتے ہوئے بھی آدمی، خوراک اور سامان کے پہنچانے میں وقت صرف ہوتا ہے اور جن صوبوں کی آبادی کم ہوتی ہے ان میں ریل کا جاری کرنا بھی ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا، اکثر شاہراہوں کی بھی کمی ہوتی ہے۔

اس لئے مملکت کی وسعت سے ہر حال میں طاقت کی وسعت کے معنی نہیں لئے جا سکتے۔ اگر نسبتاً چھوٹی مملکت پر حکمرانی آسان ہو تو ایسی حالت میں فتوحات کے پھیلانے سے سلطنت کمزور ہو سکتی ہے۔

بڑی سلطنتوں کی قوت اور کمزوری

کسی وسیع الحدود سلطنت کے مختلف مقامات پر حملہ کر کے اسے پریشان کرنا آسان ہے مگر کوئی مستقل کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ دشمن کے لئے یہ ممکن ہے کہ وسیع قطعات کو بلا مخالفت طے کر جائے مگر اس پر قائم رہنا اس کے لئے مشکل ہے اس کا موقع صرف یہی ہے کہ وہ سلطنت کی مجتمعہ طاقت پر حملہ کرے اور اسے شکست دیدے۔ روس اور جنوبی امریکہ کی حال کی جنگوں سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے لیکن سلطنت کا زیادہ پھیلاؤ

جہاں اسے بے بس اور پریشان کر دیتا ہے وہیں اس کے فوائد بھی ہیں۔ بڑی سلطنت کے ذرائع وسیع ہوتے ہیں جو ایک لمحے میں ختم نہیں ہو جاتے اس لئے خطرناک نازک وقت میں وہ واقعات کے تغیر کا انتظار کر سکتی ہے۔ ایک ضرب سے اس کا مغلوب ہو جانا شاذو نادر ہی ہو سکتا ہے۔

وسعت کا اثر نظام حکومت پر

سلطنت کی وسعت، اس کے نظام حکومت کی صورت پر بھی اثر رکھتی ہے بلا واسطہ عمومیت (Democracy) صرف چھوٹے ملکوں میں ممکن ہے، جہاں لوگ مجلس ملی میں اکثر جمع ہو سکتے ہیں۔ آئینی شاہی کے طریقۂ نیابت کے واسطے، زیادہ وسیع حدود کی ضرورت ہے۔ رومی شہنشاہی کی وسعت، حدود جمہوریت کے تنزل کرنے اور قوت کے ایک مطلق العنان شہنشاہ کے ہاتھ میں آجانے کے اسباب میں سے ایک خاص سبب تھی۔ روس میں بھی زار کی مطلق العنان طاقت کا باعث ایک حد تک اس کی یہی وسعت مملکت ہے۔ اور انگلستان تک یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کو پارلیمنٹی تنظیمات دیدیجائیں۔

لہٰذا سلطنت کی آئینی حکمت عملی کو اپنے ملک کی خصوصیت اور وسعت پر خیال کرنا اور اسی کے مطابق روش اختیار کرنا چاہئے۔

سلطنت کے مملکتی حدود دائمی اور ناقابل تغیر نہیں ہیں وہ محض قوتوں کی ترقی و تنزل پر منحصر ہیں لیکن پھر بھی وہ اس کی آبادی کے حدود سے زیادہ معین و مستقل ہیں اور صرف بڑے واقعات کی وجہ سے کہیں کہیں ان میں تغیر ہوتا ہے۔

حدود

سلطنت کے حدود یا تو اسے کسی دوسری سلطنت کے حدود سے جدا کرتے ہیں یا کسی ایسی زمین سے جدا کرتے ہیں جو کسی سلطنت کی ملک نہ ہو۔ اول الذکر حالت میں سرحد کا ایک معین خط ہوتا ہے اور پتھروں، خندقوں اور دیواروں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ثانی الذکر صورت میں کسی قطعی خط کے کھینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ بغیر اس کے کہ دوسری سلطنتوں سے پیچیدگی پیدا ہو حدود گھٹائے بڑھائے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں اشیائے ذیل داخل ہیں۔

(الف) دریا اور چشمے، لیکن یہ سرحدیں ایسی قطعی طور پر معین نہیں رہتیں جیسی ارضی سرحدیں معین ہوتی ہیں۔ دو سلطنتوں کے درمیان قطعی سرحد یا تو دریا کے وسط میں مقرر ہوتی ہے یا خاص دریا کی تہ میں یعنے بہاؤ زیادہ سے زیادہ جہاں تک پہنچتا ہے لیکن چونکہ

کشتی رانی اور تجارت کے لئے بیچ کے دھارے ہی سے بالتخصیص کام پڑتا ہے اس لئے ان اغراض کے لئے یہ دونوں سلطنتوں میں مشترک سمجھا جاتا ہے مگر یہ دونوں حدیں دریا کے کناروں کے کاٹ دینے یا چھوڑ دینے یا دھارے کے بہاؤ کے بدل جانے کی وجہ سے بدل سکتی ہیں ۔

(ب) پہاڑ ۔ پہاڑ بالعموم ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے سے اور ایک تمدن کو دوسری قسم کے تمدن سے جدا کر دیتے ہیں ۔ آمد و رفت کے وسائل کم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں تو صرف ایک ہی ایک راستہ ہوتا ہے ۔

علی العموم پہاڑ کی بلند ترین چوٹی جو پانی کے حصوں کو بھی جدا کرتی ہے فطرتی سرحد خیال کیجاتی ہے

ثانی الذکر صورت اشیاء ذیل کو شامل ہیں ۔

(الف) سمندر اور وسیع خلیج جو فطرتاً کسی سلطنت کے تابع نہیں ہوتے اور تمام دنیا کے کام کے لئے کھلے ہوتے ہیں ۔

(ب) صحرا و بیابان اور بعض وقت جنگل اور غیر آباد پہاڑ ۔ جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے یہ قطعات سلطنت کے مقاصد کے لئے کارآمد ہوتے جاتے ہیں ۔ اس لئے فطرتی سرحد کا کام یہ شاذ و نادر ہی دیتے ہیں ۔

حد بندیوں کی مزید تشریح قانون بین الاقوامی سے تعلق رکھتی ہے ۔

متعدد مملکتوں کا اتحاد

بعض وقت متعدد ممالک متحد کر لئے جاتے ہیں یہ صورت مختلف طریقوں سے واقع ہو سکتی ہے ۔

(الف) جو ممالک متحد ہوں وہ اپنی ہستی کو قائم رکھیں اور سب برابر کے درجے پر ہوں جیسے ممالک متحدہ امریکہ یا جرمانی شہنشاہی میں ہے ۔

(ب) ممالک کی جداگانہ ہستی قایم رہے مگر مدارج مختلف ہوں ایک ملک شہنشاہی کے رتبے پر سمجھا جائے اور دوسرے ممالک اس کے ماتحت ہوں ۔ جیسے برطانیہ عظمیٰ اور اس کے مستعمرات و توابع یا فرانس مع الجیریا ۔

(ج) سابقہ ممالک ایک سلطنت کے صوبے ہو جائیں جیسا کہ روس کی وسعت سے ہوا

اتم و اکمل مملکت

لیکن چونکہ مکمل سلطنت کے منتہائے خیال کی بنا قوم پر نہیں بلکہ نوع انسان پر ہے اس لئے مکمل مملکت تمام روئے زمین ہے ۔ جن میں مختلف ممالک کے متضاد اوصاف ایک ہم رنگ مجموعے میں متحد ہوں ، جس سے ایک دوسرے کی تکمیل و تقویت ہو

لیکن موجودہ سیاسیات کے لیئے جو ابھی منتہائے خیال کے حصول سے بہت دور ہے، عملی اصول یہ ہے کہ ایک مختلف النوع مملکت سلطنت کے لئے بہترین مملکت ہے یہ مملکت ایسی ہو جس میں پہاڑ اور وادیاں، دریا اور جھیلیں سمندر کے ساحل اور میدان سب کچھ ہوں اسے بہترین کچھ اس وجہ سے قرار نہیں دیا ہے کہ ایسے ممالک زیادہ زرخیز ہوتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس طرح باشندوں کے مختلف قویٰ کو حرکت اور انتہائی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بدترین مملکت اندرون ملک کے وسیع اور ویران بیابان کی مملکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعات ہمیشہ خانہ بدوش قبائل کے مسکن بنے رہتے ہیں جو سیاسی زندگی کے رتبے کو نہیں پہنچتے۔

پانچواں باب

مملکتی فرمانروائی

ملک سلطنت

تمام مملکت پر سلطنت کے شاہی حقوق اکثر ملک سلطنت کے لفظ سے موسوم ہوتے ہیں لیکن یہ نام اگرچہ ایشیا کی قدیم سلطنتوں یا جاگیری طرق کی سلطنتوں کے لئے ناموزوں نہیں تھا مگر موجودہ سیاسی خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسے یہودیوں کی قدیم سلطنت میں ساری زمین صرف خدا ہی کی ملک سمجھی جاتی تھی اور مصر میں فراعنہ تمام زمین کے تنہا مالک خیال کئے جاتے تھے اور دیگر اشخاص کو اس سے عارضی انتفاع کا حق حاصل تھا۔ اسی طرح رومی شہنشاہی میں مفتوح صوبجات کی زمین حسب ضابطہ رومی قوم یا شہنشاہ کی ملکیت خیال کی جاتی تھی اور اہل صوبہ اگرچہ واقعاً زمین پر قابض رہتے تھے لیکن ان کی ملک ادنیٰ درجہ پر سمجھی جاتی تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کی بعض سلطنتوں میں (مثلاً نارمنی فتح کے بعد انگلستان میں) بادشاہ تمام زمین کا مالک اعلیٰ اور جاگیر دار انہ رئیس متصور ہوتا تھا اور رعایا اپنی جایداد اول پر جاگیر کے طور پر قابض ہوتی تھی۔ ان تمام حالات میں ملک سلطنت کا خیال بالطبع اس طرح پیدا ہوا کہ شخصی ملکیت کا تخیل سیاسی فرمانروائی سے مخلوط کر دیا گیا، مگر اب کہ شخصی قانون اور عام قانون ایک دوسرے سے کلیتہً ممیز ہیں۔ یہ خیال ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

سلطنتی فرمانروائی

اس لئے چاہئے کہ ہم سلطنت کی ملک کے اندر اس کے حقوق فرمانروائی کو اسکی ملک سے ممیز کریں۔ ملک ایک شخصی قانون کا معاملہ ہے خواہ وہ ملک سلطنت ہی کی کیوں نہ ہو۔ فرمانروائی فی الحقیقت ایک سیاسی شے ہے اور اس کا تعلق صرف سلطنت یا سلطنت کے گروہ سے ہو سکتا ہے۔[1]

---

[1] قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی اس فرق کو پہچانا ہے، ہوغو غروسیس (اپنی لاطینی تصنیف "قانون جنگ امن"

اس کے نتائج

(۱) ۔ ایجابی جانب اس فرمانروائی کا منشا یہ ہے کہ سلطنت کو اپنی تمام مملکت پر اپنے قوانین کے نفاذ، اپنے احکام کی تعمیل اور اپنے اختیارات عدالتی کے عملدرآمد کی پوری طاقت حاصل ہے۔ اس کی طاقت صرف اشخاص ہی پر نہیں بلکہ زمین و اشیا پر بھی وسیع ہے مگر یہ طاقت صرف سلطنت سے تعلق رکھتی ہے اور شخصی قانون کی حد سے خارج ہے۔

(۲) ۔ سلبی جانب میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر ایک دوسری سلطنت یا طاقت کو اپنی مملکت کے اندر فرمانروائی کے نفاذ یا اور کسی طرح کی مداخلت سے باز رکھے، اس لیے موجودہ زمانے کی سلطنت اپنی مملکت میں کسی غیر ملکی طاقت کو عدالت یا پولیس کے اختیار کے عمل میں لانے کی اجازت نہیں دیتی۔ کسی ملک کا کلاً یا جزاً علیحدہ ہو کر رہنا ملکی فرمانروائی کے اس سیاسی تصور کے منافی ہے، ازمنہ وسطیٰ کے رؤسا جس طرح اپنے ممالک کو ذاتی ملک کی طور پر فروخت کر دیتے، یا رہن رکھدیتے یا تقسیم کر دیتے تھے[۵] اب ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

جدید قانون عام اس اصول پر پختگی سے قائم ہے کہ سلطنت کی ملک ارضی نہ قابل انفکاک ہے اور نہ قابل تقسیم[۶]۔

مستثنیٰ حالتوں میں انفکاک صرف قانون عامہ کی صورتوں میں اس وقت ممکن ہے جب کوئی قانون اس ضرورت سے وضع کیا جائے، یا بین الاقوامی معاہدات عمل میں آئیں جن میں صلح کے عہد نامے بھی شامل ہیں[۷]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی جلد ۲ باب ۳، دفعہ ۴ میں سینیکا کا یہ قول نقل کیا ہے "بادشاہ کو پورا اقتدار حاصل ہوتا ہے اور منفرد اشخاص کو محض حق ملکیت حاصل ہے۔" اور ڈیو کریسوسٹم کا قول ہے کہ "تمام ملک سلطنت کی ملک ہے مگر پھر بھی ہر منفرد شخص اپنی حاصل کردہ جائداد کا پورا مالک ہے۔"

[۵] ۔ قدامت میں اس کی مثالیں صرف انھیں صورتوں میں ملتی ہیں جہاں حکمران کو ملک اور آبادی پر اختیار مطلق حاصل ہوتا تھا۔ اس کی مثالوں کے لیے دیکھو ہوغو غروٹیس، ج ۱، فصل ۳، ص ۱۲۔

[۶] فرانسیسی نظام سلطنت ۱۷۹۱ء، ۲، دفعہ ۱، "سلطنت ایک چیز ہے اور تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جرمانی سلطنتوں کی مثالوں کیلئے دیکھو تسخاریے (Zacharia) کی کتاب "جرمانی سلطنت اور مشترکیت کا قانون"، ج ۱، دفعہ ۸۳۔

[۷] ۔ بروسی نظام سلطنت ۱۸۵۰ء فقرہ ۲، "اس ملک کے حدود صرف ایک قانون کے اجرا سے بدل سکتے ہیں۔"

فطری حق کے نتیجے کے طور پر غروتیس یہ مطالبہ مزید کرتا ہے کہ جب ملک کا کوئی حصہ علٰحدہ کیا جائے تو تمام سلطنت کی منظوری کے ساتھ خاص اس حصہ ملک کے باشندوں کی منظوری بھی حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ مطالبہ ایک منصفانہ مطالبہ ہے کیونکہ ان کی تمام سیاسی ہستی معرض خطر میں آجاتی ہے! اور مجلس وضع قانون جب اتحاد سلطنت کے شکست کرنے پر آمادہ ہو تو اس صورت میں یہ مجلس اس حصہ ملک کی موزوں نمائندہ تسلیم نہیں کی جاسکتی، اگر اکثر حالتوں میں "ضرورت" "حقوق فطری" سے زیادہ قوی ثابت ہوگی [1]

اس کے حدود

کسی سلطنت کی فرمانروائی کا دوسری سلطنتوں کے حق میں محدود کردینا ممکن ہے، اور شخصی قانون کی نظر سے یہ غلامی کے مثل ہے۔ مگر اس کی بنا قانون عام پر ہونا چاہیئے اور اس کی غرض عام غرض ہونا چاہیئے، ہمسائے کو اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ اس کی مملکت کے اندر سے ہوکر کسی فوجی سڑک سے گزر جائے یا اس کے ڈاکخانوں کو کام میں لائے، یا وہ اپنی بندرگاہوں کو اس کے لئے کھول دے مگر فرمانروائی کی آزادی کو مداخلت بیجا سے محفوظ رکھنے پر اس سے زیادہ فکر کی ضرورت ہے جس قدر شخصی قانون میں آزادی ملک کی حفاظت کی حاجت ہے، کیونکہ کسی قسم کی مستقل پابندی سلطنت کے اتحاد دیکھتی اور بہبود عام کی غرض سے اس کے تنظیمات کی آزادانہ نشوونما کے لئے ایک مہلک صدمہ ہے [2]

تعلیقات (۱) انقلاب پر فرانسیسی بادشاہوں کا خطاب بجائے شاہ فرانس کے شاہ فرانسیسیاں ہوجانا، اس سابقہ خیال سے مخالفت کو ظاہر کرتا ہے کہ فرانس ایک موروثی بادشاہی ہے اور اس حد تک اس سے سیاسی خیال کی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھو ہوگو غرٹیس کی دوسری جلد، فصل ۶، دفعہ ۴ وغیرہ۔ ویئنا کا آخری قانون ۱۸۲۰ء، فقرہ ۶:- "کسی شرکیت کی مملکت کے حقوق فرمانروائی سے برضائے خود دست بردار ہوجانے کے لئے (سوا اس کے کہ ایسا کرنا شرکیت ہی کے کسی رکن کے نفع کے لئے ہو) مشترکی سلطنت کے تمام اراکین کی مرضی کا حاصل کرنا ضروری ہے" دیکھو بلنچلی کی تصنیف "جدید قانون اقوام" دفعہ ۲۸۶

[2] شمٹ ہینر "قانون سلطنت" صفحہ (۴۰۹)، "کسی سلطنت کی ملک ارضی میں ایک غیر سلطنت یا بادشاہ کی ذاتی ملکیت کے واقع ہونے سے اس سلطنت کے اقتدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی"

[شاہ فرانسیسیاں کا خطاب اولاً ۱۷۹۱ء کے نظام سلطنت میں پیش ہوا اور ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی ایوان نے لوئیس فلپ کو یہی خطاب دیا تھا مگر لوئیس ہنر دہم اور چارلس دہم اس خطاب کو استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے سابقین کے مانند شاہ فرانس تھے] مگر ملکی بادشاہی کی اہمیت جب ایک بار مسلم ہوگئی تو پھر اس کا کوئی اثر نہیں کہ خطاب کی کونسی صورت اختیار کی جاتی ہے۔ اسٹال (اپنی تصنیف "نظریۂ سلطنت" جلد دوم صفحہ ۴۸ میں) جب قومی خطاب کو وحشیانہ کہتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ رومی اور جرمانی شہنشاہیوں نے اسے ترجیح دی ہے اور ملکی خطاب کے بہ نسبت بہ زیادہ موثر ہے کیونکہ قوم کا درجہ ملک سے بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ سرحد کی تصحیح، انفکاک کے تحت میں شامل نہیں ہے کیونکہ اس سے محض حدود موجودہ کا تعین ہوتا ہے، لیکن جب کوئی سلطنت درستی حدود کے لئے پورے کے پورے آباد قطعات کا دوسرے قطعات سے انھیں بدل لے تو اسے محض تصحیح سرحد نہیں کہہ سکتے۔

[ملکی فرمانروائی کے تصور کے لئے مین کی کتاب قانون قدیم (صفحہ ۱۰۲) دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم]

چھٹا باب

ملک کی تقسیم

سلطنت کی ملک ارضی علی العموم اتنی وسیع ہوا کرتی ہے کہ حکمرانی کے اغراض کے لئے اس کا تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس تقسیم کی چار متمیز قسمیں ہیں :-

۱۔ صوبجات

(۱) صوبجات۔ رومی شہنشاہی کے صوبجات فی الاصل وہ آزاد سلطنتیں تھیں جو روما کی محکوم بنالی گئی تھیں۔ زمانۂ حال کے صوبجات بھی اکثر قدیم سلطنتوں کی یادگار ہیں جو نسبتاً ایک بڑی سلطنت میں جذب ہوگئے ہیں مگر بسا اوقات سلطنتیں خود اپنے صوبوں کی بنا ڈالتی ہیں اور (جرمانی شہنشاہی کے مانند) اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوبجات (Duchies) سے نئے ممالک پیدا ہو جاتے ہیں۔

صوبجات کی مخصوص نوعیت اس کا نسبتاً آزادانہ اختیار ہے، ان کی حکومت عام حکومت کے تابع ہوتی ہے مگر خود اپنے وسیع اختیارات بھی رکھتی ہے۔ مزید براں نیابتی نظام سلطنت میں بسا اوقات اس میں اپنے معاملات کیلئے مجلس وضع قوانین بھی ہوتی ہے جو (ایک معنی کر) صوبے کی پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے کا میلان اتحاد سلطنت کے اندر اس تقسیم کا جانبدار نہیں ہے۔ صوبجات کے جداگانہ وضع قانون کے اختیارات، فرانس اسپین اور انگلستان میں منسوخ ہوگئے ہیں اور آسٹریا کے شاہی ممالک (Kronlander) میں اقتصادیات اور تعلیم کی حد تک محدود کردئے گئے ہیں، لیکن اگرچہ اتحاد تنظیم سلطنت کے لئے مفید ہے مگر ساتھ ہی اس کے (صوبوں کی) آزادی کلیتاً منسوخ کردینا (جس سے مختلف اضلاع کی مخصوص ضروریات وخصوصیات لازماً نظرانداز ہو جاتی ہیں) قومی زندگی کے صحت ور

دبار آور اجزا کے لئے مفر ہے۔ ٹیوٹونی اقوام رومانی اقوام کے بہ نسبت صوبجاتی آزادی کی ضرورت کو زیادہ شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

۲۔ حلقجات

۲۔ حلقجات، وسیع سیاسی اضلاع پر مشتمل ہوتے ہیں مگر علٰحدہ ممالک خیال کئے جانے کا انھیں حق نہیں ہوتا۔ قدیم فرانکی اور جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں امارتیں (Duchies) اور ریاستیں (Princedoms) صوبوں کے بجائے سمجھی جاتی تھیں اور کینٹن (اضلاع (Cantons)) حلقجات کے بجائے۔ اس تحت میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کی کونٹی جرمانیا کے حلقے (کرائز (Kreise)) فرانس کے صیغے (دے پارتماں (Departments)) اور پروسیا کے حکومتی حلقے یا ضلعے (Regierungsbezirke) داخل ہیں۔ یہ تقسیم مقامی یا قبائلی اختلافات کی بنا پر نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ ایک منضبط انتظام عمل کی ضرورت سے قائم کی گئی ہے لیکن پھر بھی ضلع کے تاریخی تعلقات اور اس کی آمدورفت کے فطرتی وسائل کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ صوبجات کو ایک قصر کی مختلف عمارتوں سے اور حلقجات کو ایک مکان کی مختلف منزلوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ان کے انتظام کی بالعموم ایک مرکزی قوت اور ایک اعلیٰ عدالت ہوتی ہے۔ مزید برآں اس زمانے کی سلطنتوں میں یہ میلان بھی پیدا ہوگیا ہے کہ حلقے کی آبادی اپنے خاص اغراض پر توجہ کرے اور ایسے حدود میں عام ضروریات مثلاً سڑکوں، مخزنوں، (میگزینوں)، شفاخانوں، مدرسوں، محتاج خانوں، تادیب خانوں وغیرہ کا انصرام کرے اس سے حکومت خود اختیاری اور تنظیمات نیابتی کے لئے ایک بارآور موقع پیدا ہوجاتا ہے[1]

۳۔ اضلاع

۳۔ اضلاع بالعموم حلقجات کی تقسیم ثانی ہوتے ہیں اور انھیں تحتانی قسم کا نظم ونسق اور اختیار عدالتی حاصل ہوتا ہے۔ اپنی جگہ پر انھیں بھی ایسی مشخصہ جماعات سمجھ سکتے ہیں جو اپنی خاص ملکیت اور تنظیمات رکھتی ہیں[2]

---

[1] ۔ وِوِیَن (Vivien) کی تصنیف "مطالعات" (Etnd. etc) ج ۲ باب ۶۔

[2] ۔ دیکھو وِوِیَن کی تصنیف محولہ بالا، ج ۲، باب ۳۔ فرانس کے کینٹن کی حیثیت ایک کارپوریشن کی سی نہیں ہوتی بلکہ محض عدالتی اور انتخابی اغراض کے لئے سرکاری طور پر حلقے قرار دیدئے جاتے ہیں۔

جرمانیا میں ٹیوٹونی عہد کے "تعلقجات" علاقہائے صوبہ اور تحصیلات، فرانس میں کینٹن کی اور پروسیا میں کرائسز کی یہی نوعیت ہے۔

صرف انتخاب کی غرض سے جو حلقے قرار دئے جائیں وہ اس صنف میں داخل نہیں ہوتے کیونکہ وہ محض عارضی ہوتے ہیں اور سلطنت کا عضوی جزو نہیں ہوتے۔ اس قسم کی غیر عضوی تقسیمات پر خیال رجوع کرنے کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے۔

۴ کمیون

شہر اور بیرونجات کے کمیون - یہ کمیون، سلطنت کی سادہ ترین تقسیم ہیں مگر نہایت اہم ہیں۔ کمیون ضلع کے لئے وہی حکم رکھتا ہے جو سیاسی طور پر منضبط قوم اپنے ملک کیلئے رکھتی ہے۔ اپنی عام زندگی سے وہ اس میں جان ڈال دیتی ہے، گو کہ یہ زندگی سیاسی زندگی نہیں ہوتی بلکہ عام معاشرتی اور اقتصادی اغراض پر مشتمل ہوتی ہے۔

بڑے بڑے شہر، ضلع کے مثل اور بڑے بڑے دار الحکومت (جیسے برلن) ایک حلقے بلکہ صوبہ کے مانند ہوتے ہیں۔

اصول تقسیم

کسی ملک کی سیاسی تقسیمات کا ردوبدل، ایک قانونی معاملہ ہے۔ ان تمام مراحل میں سلطنت کو اپنے عام اغراض اور اپنی تنظیم کی ہم رنگی پر نظر رکھنا پڑتی ہے مگر اعلیٰ مراحل میں اغراض عامہ کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور سلطنت کو تقسیمات کے تعین میں زیادہ آزادی ہوتی ہے برخلاف اس کے کمیون موجودہ مشخصات سے فطرتاً اس قدر گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی خواہشوں پر لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے ان انتظامات میں سلطنت کو جن خاص خیالات کا پابند ہونا پڑتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(الف) تقسیم کی سیاسی غرض؛

(ب) فطری اثرات جیسے دریا، وادی وغیرہ کا تعلق؛

(ج) باشندوں کی تاریخ؛

(د) تجارتی تعلقات۔

تعداد اور رقبے کا حسابی لحاظ ان خیالات کے تحت میں آتا ہے۔

ساتواں باب

مِلکِ شخصی سے سلطنت کا تعلق

مِلک کی تاریخ

مِلک شخصی یعنی دولت پر انسان کا اختیار اُتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ اولین انسان جب اپنی غذا کے لئے پھل توڑتے یا کوئی غار اپنی سکونت کے لئے پسند کرتے بلکہ جب وہ پتے یا چمڑے سے اپنے جسم ڈھانکتے تھے تو وہ اپنے ان افعال سے مِلک پیدا کر رہے تھے مِلک اصلاً سلطنت کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اپنی نہایت قدیم، غیر مکمل اور غیر محفوظ شکل میں، یہ انفرادی زندگی کا فعل ہے۔ گویا یہ افراد کے وجود خارجی کی ایک طرح کی وسعت ہے۔ انسان ان چیزوں پر قبضہ کرتا ہے جو اس کے آس پاس واقع ہوتی اور اس کی طاقت کے حد میں آجاتی ہیں، وہ انھیں اپنے خاص مصرف و خدمت میں لاتا یعنی ان سے منتفع ہوتا ہے۔ جب اس کے ساتھ یہ احساس شامل ہوجاتا ہے کہ اسے ان چیزوں کو قبضے میں رکھنے کا حق حاصل ہے تو مِلک کا خیال مکمل ہوجاتا ہے۔ خانہ بدوش جنھیں کسی قسم کا مفید سیاسی ربط نہیں ہوتا وہ بھی اپنے لباس، اپنے ہتیار اپنے گلے اور اپنے سامان کی مِلک رکھتے ہیں رابنسن کروسو تک نے اپنے ویران جزیرے میں اپنی ملکیت کو ترقی دی تھی۔

اشتراکیت

اشتراکیت جو مِلک شخصی کے قرین انصاف ہونے سے انکار کرتی اور اسے قزاقی قرار دیتی ہے[1] وہ انسانی فطرت سے جیسا کچھ کہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے جنگ

[1] پردوون کا قول ہے "جسے لوگ حق مالکانہ کہتے ہیں وہ (حقیقت میں) قزاقی ہے"۔

کرتی ہے۔ "سمندر کی مچھلیاں، ہوا کے پرندے اور زمین کے مویشی اور جو کچھ اس پر ہے سب پر ان کو قدرت دو" (کتاب پیدائش باب اول آیت ۲۶) یہ طریق بنی نوع انسان کی تمام تاریخ کے بھی خلاف ہے جو تمام اقوام اور تمام اوقات میں ملک کو تسلیم کرتی رہی اور اب بھی اس کی ترقی میں مشغول ہے۔

اشتراکی جس طرح ملکیت کا بطلان تجویز کرتے ہیں وہ شخصی آزادی کی فنا اور تمدن و خاندان کی بربادی کے مرادف ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ وہ ایسی وحشت ہے جو وحشی ترین معاشرت میں بھی نہیں پائی جاتی ہے[1]

اجتماعیت

اجتماعیوں کا اصول بظاہر زیادہ معتدل اور انسانیت کو لئے ہوئے ہے مگر وہ بھی ایسا ہی ناممکن العمل اور اشتراکیت سے بھی زیادہ متناقض ہے ہم فروبیل (Frobel) کو اس خیال کا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں اس کے نزدیک ملک "ایک جاگیر ہے جو سوسائٹی کی جانب سے قابض کے اختیار میں ہوتی ہے"، اور انفرادی حق "عام مرضی کا ایک نتیجہ ہے جسے ان لوگوں کی ایک تعداد نے تسلیم کیا ہے جو فرمانروایانہ جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں"[2] انسان کی انفرادی فطرت و آزادی کے لئے یہ عقیدہ بھی اشتراکیت سے کچھ کم غلط نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ اصول محول اور روقتی قبضے کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا منشا یہ ہے کہ آزادانہ ملک کو ازمنۂ وسطے کے جاگیردارانہ طریق کی ایک مبالغہ آمیز مماثلت سے مبدل کر دے یعنی تمدن کے فرد تر طبقے کی طرف پلٹ جائے، کیونکہ اس خیال کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے کہ یہ وہی غلامی کا اصول ہے جسے تاریخ کے تاریک ترین زمانوں کے خود مختار حکمرانوں کو مکارانہ تملق نے سکھایا تھا اور جسکے چہرے کو اب اجتماعیت کے خوش آئند فقروں نے اپنے پردے میں چھپا کر دلفریب بنا دیا ہے۔

سلطنت ملکیت کی محافظ ہے

ملک شخصی پر سلطنت کو اختیار مطلق ہرگز حاصل نہیں ہے اور اس حیثیت سے

---

[1] دیکھو تیرس کی کتاب "ملکیت" جلد ۲ نظمہائے اشتراکیت و اجتماعیت کی تنقید اس نے بہت خوب کی ہے مگر تصور ملکیت کے متعلق فلسفیانہ ماخذ کے قرار دینے میں وہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔

[2] فروبیل کی تصنیف "اجتماعی سیاسیات" (Sociale Politik) ج ۱ صفحہ ۲۹۳ و ۴۰۰

وہ قانون عامہ کے حدود سے واقعتاً خارج ہے۔ سلطنت نہ اسے پیدا کرتی اور نہ اسے برقرار رکھتی ہے اور اس لئے اسے لے بھی نہیں سکتی ہے، وہ جسطرح تمام انفرادی حقوق کی حفاظت کرتی ہے، صرف اسی طرح اس کی بھی حفاظت کرتی ہے اور اس پر اس کو وہی اقتدار حاصل ہے جو اپنے باشندوں پر حاصل ہے پس ملکِ شخصی کے ساتھ سلطنت کے تعلق کے خاص خاص اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) سلطنت ملکیت کی حفاظت اور آزادی کی ضامن ہوتی ہے[1]

(۲) ملک کے علٰحدہ کردینے کے لئے سلطنت کو علی الاطلاق اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

(۳) سلطنت کو حق حاصل ہے کہ اغراض عامہ کے لئے ملکیت پر محصول عائد کرے۔

ملکیت شخصی سے سلطنت کے تعلقات انھیں امور پر ختم نہیں ہوجاتے بلکہ چند پابندیوں کے ساتھ اس کے حقوق ملک شخصی کی آزادی پر حاوی ہوتے ہیں۔

ملک شخصی کے حدود

بعض اشیا فطرتاً ایسی ہیں کہ ملک شخصی ہونے کے لئے ناموزوں ہیں اور عامۃ الناس کے استعمال میں آتی ہیں، اس قسم کی جمہوری چیزیں ندیاں اور سمندر، سواحل جہاں مد و جزر کی آمدورفت رہتی ہے اور بندرگاہیں وغیرہ ہیں[2]

اس تحت میں وہ برف اور یخ سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑی زمینیں اور میدان بھی داخل ہیں جنمیں کچھ پیدا نہیں ہوتا، ناقابل گزر غار اور میدان وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں

---

[1] یہ اصول بہت سے ملکوں کے نظام سلطنت میں پایا جاتا ہے۔ ہنری سوم نے جو منشور اعظم سنہ ۱۲۲۵ء میں دوبارہ جاری کیا اس میں بھی اس مضمون کے کئی جملے تھے۔ فرانسیسی نظام جمہوریت ۱۸۴۸ء کے فقرہ ۱۱ اور منشور سنہ ۱۸۱۴ء کے فقرہ ۸ میں یہ جملہ موجود ہے: "ہر ملکیت غیر قابل دست اندازی ہے" پروسی نظام سلطنت سنہ ۱۸۵۰ء فقرہ ۹ "ملک غیر قابل دست اندازی ہے"۔

[2] مارکیانوس (Dig I Tit 8.) میں کہتا ہے "ندیاں تقریباً سب کی سب اور بندرگاہیں عام (یعنی جمہوری چیزیں) ہیں"، الپیانوس (Dig XLIII Tit 12.) میں کہتا ہے "کاسیوس کی تعریف کے مطابق وہ ندی عام ہے جو ہمیشہ بہتی ہو" نپولیوں کے ضابطے کی دفعہ ۵۳۸ کی رو سے عام (یا جمہوری) ندی کا مفہوم زیادہ محدود ہے "سڑکیں، راستے، اور گلیاں جو سلطنت کی نگرانی میں ہیں، نالے اور ندیاں جن میں جہازرانی یا کشتی رانی ہوسکتی ہے، کنارے یا سواحل، وہ زمینیں جن پر سے سمندر کا پانی ہٹ گیا ہو، بندر، بندرگاہیں، گھاٹ اور عموماً فرانسیسی زمین کے وہ سب حصے جو کسی شخصی ملکیت میں نہیں ہیں۔ اراضی عامۃ میں شامل سمجھے جاتے ہیں" نیز دیکھو

گر برف کے پہاڑوں کی برف ایک تجارتی شئے ہوگئی ہے اور برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر مہمان خانے (ہوٹل) تعمیر ہوگئے ہیں۔ ان صورتوں میں یہ ملکیت سلطنت سے حاصل ہوتی ہے۔ ان فطری انعامات کے پہلو بہ پہلو متمدن سلطنت کے وہ کام ہیں جو عام اغراض کے لئے وقف ہیں، خاصکر عام سڑکیں اور نہریں، عام میدان وغیرہ یہ سب جمہور کی ملک ہیں اور جب تک اس حالت میں رہیں سلطنت بھی شخصی ملک کے طور پر ان پر قبضہ نہیں کرسکتی، گو کہ سلطنت کی نگرانی کو بعض وقت ملک سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے سوا ایسی بھی چیزیں ہیں کہ وہ اگرچہ فطرتاً اس قابل ہیں کہ ملک شخصی ہوسکیں مگر وہ سلطنت کے لئے محفوظ ہیں کیونکہ بہبود عامہ سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے یا یہ کہ ان کے انتظام کے لئے ایسے وسائل درکار ہوتے ہیں کہ شخصی مالک بالعموم ان وسائل پر قابو نہیں پاسکتے۔ اس صنف میں معاون، نمک کی کانیں اور دوسرے اسی طرح کے اور اجارات شامل ہیں۔

۳۔ ملک عامہ کے محدود مفہوم سے علیحدہ ایسی چیزیں بھی ہیں جو بالتخصیص ضروریات عامہ کے لئے علیحدہ کردی گئی ہیں، خاصکر عمارات عامہ، سرکاری عاملوں یا حاکموں کی اقامت گاہیں، قلعے، سلاح خانے (دار الصناعت) اور بارکیں (سپاہیوں کی قیام گاہیں) ان چیزوں کو صحیح طور پر سلطنت کی ملک کہہ سکتے ہیں مگر خدمات عامہ میں استعمال ہونے کے باعث وہ شخصی ملک اور شخصی کاروبار کی حد سے خارج ہوجاتی ہیں۔ ان کا سلطنت کی نگرانی میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ عام اغراض کے کام آسکیں۔

۴۔ اگلے زمانے میں سلطنت اپنی مفتوحہ زمین کو اپنے جنگ آوروں اور قبائل میں تقسیم کردیتی تھی اس لئے اولاً وابتداءً جائداد زیادہ تر سلطنت ہی سے حاصل کی جاتی تھی بہت سی سلطنتوں میں اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جب کئی خاندانوں کے ترک وطن کرنے یا موت کے ہاتھوں نیست ونابود ہوجانے سے زمین پر اس کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے تو زمین سلطنت کے پاس واپس ہوجاتی ہے، ابھی تک انگریزی اور امریکی قانون اسی رائے پر قائم ہے کہ جدید مستعمرات کی زمین سلطنت کی ملک ہے اور آبادکاروں کے لئے لازم ہے کہ اسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) "سکسونی آئینہ"، ج ۲، ص ۲۸، دفعہ ۴ با "پروسی ملکی قانون" ج ۲، ص ۱۵، دفعہ ۴۱ و ۴۳، اور "آسٹروی ضابطہ" دفعہ ۴۰۰۔

سلطنت سے خرید کریں، جو زمین ہنوز ملک شخصی میں نہیں آئی ہے یا اس کی یہ حیثیت ختم ہوگئی ہے اس کے متعلق یہ عملدرآمد مملکتی فرمانروائی کے اصول کے مطابق (جس سے شخصی ملکیت کا انضباط ہوتا اور ملک شخصی کی عدم موجودگی میں اسے خود پورا اختیار حاصل ہوتا ہے[1]) بالکل بجا ہے لاوارث جائداد بھی اسی طور سے سلطنت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ہر کس و ناکس کے قابض ہو جانے سے سخت ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔

رومی قانون نے زیادہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا کہ لاوارث شئے (Res nullius) پر سلطنت کو دیگر اشخاص سے زیادہ حق حاصل نہیں تھا۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں اس پر قبضہ کر سکتے تھے اور اسی قبضے سے وہ اس کے مالک ہو جاتے تھے[2]۔ برخلاف اس کے ازمنۂ وسطے کی جاگیری شاہی شخصی، ان اشیا، پر بھی ملک سلطنت کے وسیع کرنے کے جانب مائل تھی، جن پر شخصی قانون کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ خیال بہت سی جدید سلطنتوں کے قانون میں قائم رہ گیا ہے۔

الف ۔ پروسی قانون کے مطابق بعض ایسے املاک پر جن کا کوئی دعویدار نہو یا جو متروک پڑے ہوں، خاصکر زمین یا مویشی وغیرہ کے قسم سے، سلطنت کو قبضے کا مقدم حق حاصل ہے، مگر ان چیزوں کے علاوہ جو ایسی چیزیں ہوں کہ ان کا دعویدار کوئی نہو ان کے متعلق پروسی قانون بھی آزادانہ قبضے کا حق تسلیم کرتا ہے[3]۔

---

[1] ۔ دیکھو (اتیالی مصنف) پیپیر انتونی کی کتاب "نیپلز کا قانونِ اساسی"، ج ۱، ص ۳۰۶ اور اس کے آگے، "سلطنت کی ملکیت" کا بیان۔

[2] ۔ یوستینیانوس کے ضوابط ۲، ۱، ف ۱۲ "جو چیز بے مالک (لاوارث) ہے اس پر جو قبضہ کرلے وہی اس کا مالک ہے" دیکھو گایوس ج ۲ دفعہ ۶۶۔ کلیو برنے "جرمانی مشترکیت کے قانون عامہ" دفعہ ۳۴ میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ لاوارث چیز کو ایک غیر ملکی سلطنت کے اندر اپنے قبضے میں نہیں لا سکتا مگر جب کوئی غیر ملکی شخص ایک چڑیا کو جو اوڑکر اس کے کمرے میں آگئی ہو پکڑلے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے بھی ویسا ہی حق حاصل نہو جیسا ایسی حالت میں ایک ملکی شخص کو ہوگا۔

[3] ۔ پروسیا کا "ملکی قانون" ج ۲، ص ۱۱ دفعہ ۱ وغیرہ۔

(ب) انگریزی قانون بیشتر غیر دعویدار املاک کا مالک بادشاہ کو قرار دیتا ہے[1]؛ مگر بعض قابل انتقال اشیاء پر قبضہ کر لینے کا آزادانہ حق وہ اب بھی تسلیم کرتا ہے[2]۔

(ج) فرانسیسی قانون انگریزی قانون کے مثل ہے وہ اپنا عام اصول یہ بیان کرتا ہے کہ "جن چیزوں کا کوئی مالک نہیں وہ سلطنت کی ملک ہیں"[3]۔

(د) آسٹروی قانون نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جن چیزوں کا کوئی مالک نہو ان پر آزادانہ تصرف کیا جا سکتا ہے[4]۔

۵۔ ملک اور رعایا پر سلطنت کی فرمانروائی اور اعضائے سلطنت کے مستمر و مستقل بقا کے تحفظ کی ذمہ داری کی وجہ سے جو قیود پیدا ہوتے ہیں ان میں ملک ذاتی پر اجرائے محصول اور انتظام کو توالی شامل ہیں۔

بیدخلی

۶۔ حق بیدخلی سے پیدا شدہ قیود۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ رومی، حق بیدخلی کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ جب نفع عامہ کے لئے بھی ترک ملکیت کی ضرورت ہوتی تھی تو بھی آزادی ملکیت غیر مشروط طور پر محفوظ رہتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ کسی عام حق ترک کو تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اگر انفرادی حالتوں میں سلطنت کو ترک ملکیت کے نافذ کرنے کا اختیار نہیں حاصل تھا، تو پھر ان کی طویل نہریں، ان کی مستقیم فوجی سڑکیں، ان کے پانی کے خزانے اور ان کے قلعے آخر کیونکر وجود میں آسکے۔ غالباً انھوں نے وہی کیا ہوگا جو اس وقت انگریز کرتے ہیں یعنی خاص خاص حالتوں کے لئے مخصوص قانون منظور ہوتے رہے ہوں گے۔

---

[1] بلیک اسٹون (ج ۱، ص ۸) بریکٹن کا ایک قول نقل کرتا ہے: "ایسی لاوارث چیزیں جن کا شمار املاک میں ہو اور فطری قانون کے مطابق اس شخص کے ہاتھ میں آگئی ہوں جس نے انھیں سب سے پہلے پایا ہو تو وہ اس سے قبل ہی قانون اقوام کی رو سے بادشاہ کی ملک ہو چکی ہوں گی۔"

[2] بلیک اسٹون ج ۲، ص ۱۲، ۲۶

[3] فرانسیسی ضابطۂ دیوانی "فقرہ ۷۱۳": "جس مال کا کوئی مالک نہ ہو وہ سلطنت کی ملک ہے۔" مقابلہ کرو فقرہ ۵۳۹، ۷۲۳، ۷۶۸

[4] دفعہ ۳۸۱ وغیرہ

انگلستان میں اگر عام مقاصد کے لئے مالکوں کو ان کی ملکیتوں کے ترک کرنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے پارلیمنٹ کے خاص قانون کی ضرورت ہوتی ہے[۱]۔

معاوضہ

براعظم یورپ میں حق بیدخلی عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے، اور اس کے قواعد معین ہوگئے ہیں، بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں یہ اصول داخل ہے کہ پورا معاوضہ ادا کرنے کی صورت میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ بہبود عامہ کے اغراض کے لئے ترک ملک کو جبراً عمل میں لا سکے[۲]۔

اس خیال سے کہ جہاں افراد کے حقوق شخصی اور عوام کے حقوق عامہ کا تصادم ہو جائے وہاں موخر الذکر کو غلبہ حاصل ہونا چاہئے، یہ اصول بالکل بجا ہے مگر اسی حد تک جس قدر مقتضائے حالات ہو متضاد اغراض میں آشتی کی صورت اس طرح پیدا کیگئی ہے کہ ایک طرف سے ترک حق کیا جائے دوسرے طرف سے معاوضہ دیا جائے۔

---

[۱] مقابلہ کرو بلیک اسٹون ج ۱ ص ۱، اور متعدد نئے قوانین نہروں اور ریلوں کے متعلق منشاؤں کے لئے دیکھو "جدید ترین ضابطہ بیدخلی" مطبوعہ نیورن برگ ۱۸۳۷ء [خصوصاً دیکھو گریون ہوٹ کا "قانون بیدخلی" ص ۶۶ اور آگے۔]

[۲] بویریا کا ملکی قانون ۱۷۵۶ء ۴ (۳)، دفعہ ۲۔ پروسی ملکی قانون ۱ (۱۱) دفعہ ۴، [تمہید، دفعہ ۵، ۳۲] نپولیون کا ضابطہ، فقرہ ۵۴۵: "کوئی شخص اپنی ملک سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ سود مندی عامہ کی غرض سے ایسا نہ کیا جائے اور پہلے سے ایک واجبی معاوضے کے ذریعے اس کے نقصان کی تلافی نہ کردی گئی ہو"۔ آسٹروی ضابطہ (دفعہ ۳۶۵) "اگر نفع عام کیلئے ضرورت ہو تو ہر رکن سلطنت کو اپنی ملکیت (املاک) واجبی معاوضے پر دے دینا چاہئے"۔ فرانس کے نظام سلطنت ۱۸۴۸ء یا فقرہ ۱۱ منشور ۱۸۱۴ء فقرہ ۹ اور ضابطے کا، نیز بلجیم کے نظام ۱۸۳۱ء، فقرہ ۱۱ اور اٹالیا کے نظام ۱۸۴۸ء فقرہ ۲۹ اور آسٹریا کے قانون اساسی ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء، فقرہ ۵ کا منشا بھی یہی ہے۔ پروسی نظام حکومت ۱۸۵۰ء فقرہ ۹ "ملکیت ناقابل تنقیص ہے اور بجز بہبود عامہ کی بنا پر حسب قانون پیشگی معاوضہ ادا کرکے یا شدید ضرورت کی صورت میں کم سے کم اس قدر معاوضہ دے کہ جتنا بحالات موجودہ تخمینہ کیا جا سکے، اور کسی صورت میں نہ مالک اس سے بیدخل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کسی طرح کی قید عاید کی جا سکتی ہے۔

یہ سوال کہ کسی خاص حالت میں اغراض عامہ کے لیئے بیدخلی کی ضرورت ہے یا نہیں، اس کا تعلق قانون عامہ سے ہے اور اس لئے عدالت دیوانی سے اس کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا تصفیہ خاص ارکان حکومت کا کام ہے، خواہ وہ وضع قانون کے ذریعے سے ایسا کریں جیسا انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں ہوتا ہے یا خود عمال سلطنت اس کا فیصلہ کر دیں، جیسا جرمنیا میں دستور ہے یا عدالتہائے انتظامی کے ذریعے سے ایسا کیا جائے۔ آخر الذکر طریقہ زیادہ قرین انصاف ہے کیونکہ یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ ہر ایک صورتِ خاص میں یہ طے کرے کہ نفع عام کے لیئے کیا درکار ہے اور مجوزہ ذرائع کے اندازہ کرنے کے لیئے سب سے زیادہ وہی موزوں ہے، مگر طریق کارروائی ایسا[علہ] ہونا چاہیئے کہ مطلق العنان حرص وہوس کو شخصی حقوق میں مداخلت بیجا کا موقع نہ ملے

ترکِ ملک پر مجبور کرنے کا حق صرف سلطنت سے یا مختصر حلقوں میں کمیون سے تعلق رکھتا ہے منفرد اشخاص سے کسی صورت میں اس کا تعلق نہیں ہو سکتا، مگر سلطنت افراد یا جماعتوں کو خاص کاموں کے لیئے ترکِ ملک کے مطالبے کا حق دے سکتی ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں ریلوے کمپنیوں کو اکثر یہ اختیارات دیئے جاتے ہیں۔

بہت سی مجالس وضع قوانین اس حق کو جائداد منقولہ اور بعض خاص نامزد اشیاء تک محدود رکھتی ہیں، مگر یہی اصول بالکل اسی طرح جائداد غیر منقولہ (یعنی سامان وغیرہ) اور اغراض عامہ پر جو نئے انکشافات اور ترقی تمدن سے پیدا ہوں عائد ہوتا ہے۔

تشخیص معاوضہ

دوسری جانب تشخیص معاوضہ کلیتہً شخصی قانون کا مسئلہ ہے اور اس کا تصفیہ بھی اگر باہمی معاہدے کے ذریعے سے نہ ہو گیا ہو تو عدالت دیوانی سے ہونا چاہئے سلطنت کا بہر حال یہ فرض ہے کہ وہ پورا معاوضہ ادا کرے یعنی محض معمولی قیمت نہ دے بلکہ اتنی بڑھا کر قیمت دے کہ مالک کے نہ صرف بلا واسطہ بلکہ بالواسطہ مفاد کا بھی کافی عوض

علہ۔ بوئریا کا قانون مجریہ ۱۸۳۷ء۔ دیکھو ترائش لر کی تحریر "جبری بیدخلی" پر (رسالہ قانون جرمانی ج ۱۲ حصہ ۱ میں) [بعد کی تحریریں اس بحث پر یہ ہیں گریون ہوٹ کا "قانون بیدخلی ۱۸۷۴ء"، وہ تحریریں جن کا حوالہ فون ہولتس دورف کی "قانونی قاموس ج ۱ ص ۱۴" وغیرہ میں دیا گیا ہے۔]

ہو سکے بخلاف اس کے سلطنت کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی قدر و قیمت کا معاوضہ دے جس کا وجود حقیقت میں نہیں ہے بلکہ جسے مالک نے محض برعم خود فرض کر لیا ہے۔

بعض جگہ کے قوانین اُس بالواسطہ منفعت کو جو اس تغیر سے پیدا ہو جائے مالک کے بالواسطہ نقصان کے مقابل میں قرار دیتے ہیں[1] مگر بعض بعض جگہوں کے قانون اس پر لحاظ کرنے سے انکار کرتے ہیں[2]۔ طریقہ اول جس طرح پر کہ زیوریچ (Zurich) کے قانون نے اسے محدود کر دیا ہے، زیادہ قرین انصاف ہے کیونکہ نفع و نقصان کے حقیقی تعلقات سے وہ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

[تعلیق۔ اس سارے مسئلے پر مل کی "علم الاقتصاد" کتاب دوم باب یکم و دوم دیکھا جائے نیز لاویلیے کی اجتماعیت عصریہ (Le Socialisme Contemporier) اور رے کی بھی اجتماعیت عصریہ (Contemporary Socialism) دیکھنی چاہئے۔ انگریزی مترجم۔]

---

[1] ۔ فرانسیسی قانون ۱۸۴۱ء فقرہ ۵۱۔ زیوریچ کا قانون ۱۸۳۸ء دفعہ ۶: "ملکیت کا جو حصہ مالک کے ہاتھ میں باقی رہ جائے اس کے نقصان بعیدہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس نفع کو اس کے مقابل قرار دینا چاہئے جو اسے حاصل ہوتا ہو مثلاً کسی باغ کے اندر سے اگر سڑک نکلے تو جو حصہ بچ رہے گا وہ باغ کی حیثیت سے کم قیمت ہو جائے گا مگر عمارتی زمین کی حیثیت سے اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ سلطنت کے لئے خلاف انصاف ہے کہ وہ نقصان اول کا معاوضہ دے۔

[2] ۔ بویریا کا قانون ۱۸۳۷ء فقرہ ۶۔

چوتھا مقالہ

سلطنت کا عروج اور زوال

پہلا باب

تمہید

عروج سلطنت کی دو نوعیتیں تاریخی اور تخیلی

عروج سلطنت کے سوال پر دو مختلف نظروں سے بحث ہو سکتی ہے۔ ہمارا منشا یا تو یہ ہوگا کہ واقعی سلطنتوں نے جسطرح عروج حاصل کیا ہے، ان کے شرایط وحالات کی جانچ کریں یا یہ کہ اس لابدی سبب کو معلوم کریں جس پر تمام سلطنتوں کی بنیاد قائم ہے یعنی یہ کہ قانوناً وانصافاً سلطنت کی بنیاد کیا ہے۔ پہلے سوال کا جواب تاریخ کو دینا چاہئے اور دوسرے کا جواب تخیل یا فکر کو۔ تاریخ جن کثیر واقعات پر بحث کرتی ہے ان کے لحاظ سے وہ ان مختلف شکلوں میں امتیاز کرتی ہے، جن سے سلطنتیں پیدا ہوتی ہیں، تخیل سلطنت کے توحد خیال کو لئے ہوئے شروع ہوتا ہے اور اس لئے وہ توحد بنا کا بھی خواستگار رہتا ہے۔

ہمیں اول تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جبتک کہ ہمیں اقوام کے تجربے کا حال نہ معلوم ہو جائے اس وقت تک ہمیں تخیلی بحث میں نہ پڑنا چاہئے۔

ہمارا تاریخی علم جس زمانے تک پہنچتا ہے اس سے بہت پہلے ابتدائی سلطنتوں کا قیام ہو چکا تھا۔ تاریخ کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا تھا، جب تک کہ زمین پر بہت سی سلطنتیں قائم نہیں ہو چکیں۔ یہودیوں کی قدیم مقدس کتابوں میں بھی جن سے ہمیں سلطنت یہود کی آفرینش اول کا حال معلوم ہوتا ہے، مصری سلطنتوں کا مقدم وجود مان لیا گیا ہے